عباس تابش ایک مطالعہ

ساحل سلہری

DUA PUBLICATIONS

DUA PUBLICATIONS
ناشر : زاہد شیخ

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

نام کتاب	—	عباس تابش ایک مطالعہ
تخمیناً	—	ساحل سلہری
اشاعت	—	2015ء
کمپوزنگ	—	التمش مبین
ڈیزائن	—	حامد رؤف
مارکیٹنگ	—	عقیل باقر
مطبع	—	شہباز پرنٹرز، لاہور
قیمت	—	-/600 روپے

دُعا پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔فون: 042-37233585
E-mail: duapublications@gmail.com

تم بی ؟؟؟ تخمیناً ؟ علیہ فیم نیچہ ؟ نیچہ نعمتیں علیہا بی بلا اہد شیخ : 0300-9476417

انتساب

محترمہ شکیلہ ناز

کے نام

جن کی دعائیں اور محبتیں ایک سائے کی طرح میرے ساتھ رہتی ہیں

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اِک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

ہم ہیں سُوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلّق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

(عباس تابشؔ)

فہرست

☆☆☆☆☆

پیش لفظ

قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کی اُردو شاعری کے رجحان ومزاج پر کافی تحقیقی وتنقیدی کام ہو چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان بالخصوص ۸۰ء کی دہائی کے بعد اُردو غزل ونظم کے تدریجی ارتقا اور مزاج پر کام کرنے کی اچھی خاصی گنجائش موجود ہے۔ ۸۰ء کی دہائی اُردو ادب کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی اور اس عہد کے شعرا نے جدید اُردو غزل کی روایت کو بے حد گہرا کیا۔ ایک عرصے سے میری دلی خواہش تھی کہ میں اس عہد کی شاعری پر کوئی تحقیقی وتنقیدی کام کروں تا کہ جدید اُردو شاعری کو اُردو ادب میں ترقی وترویج ملے۔ اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے میں نے عباس تابش کی شاعری کو تحقیق وتنقید کے لیے چنا۔

عباس تابش کا شعری سفر گزشتہ چار دہائیوں کو محیط کرتا ہے، وہ بیسویں واکیسویں صدی کے اہم نمائندہ شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے کلاسیکی روایت اور جدید طرزِ اظہار کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنھوں نے ایک عرصہ سے جمود اور جگالی کا شکار اُردو غزل میں مقدور بھر تبدیلیاں کر کے اس میں نئے نئے مضامین شامل کر دیے ہیں۔ اُن کی شاعری کا وصفِ خاص یہ ہے کہ وہ بیک وقت روایتی بھی ہے اور جدید طرزِ ادا بھی رکھتی ہے۔ عباس تابش کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس میں منفرد اسلوب اور

اجتہادی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اُنھوں نے غزل گوئی میں ایسی نئی راہیں اختراع کی ہیں کہ بعد میں آنے والے شعرا نے اُن کے تشکیل دیے ہوئے راستوں کو اپنانا شروع کر دیا ہے۔

عباس تابش کی غزل نے جدید اُردو غزل میں ایک اچھوتا اضافہ کیا ہے۔ اُنھوں نے چند خوبصورت نظمیں بھی لکھی ہیں۔ وہ ایک عرصہ متنازع ادبی شخصیت بھی بنے رہے کیوں کہ اُن کے چند معاصرین کی طبیعت پر اُن کی شعری عظمت ناگوار گزرتی تھی لیکن ایک غیر جانب دار تحقیق وتنقید سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ عباس تابش کی غزل میں کوئی معترض پہلو نہیں بلکہ یہ قابلِ ستائش ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں عباس تابش کی شاعری کا مکمل جائزہ لینے کی حتی الامکان سعی کی گئی ہے۔ اُن کے معترضین اور مداحین کی آرا کی روشنی میں ایک حتمی رائے قائم کی گئی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے راقم نے اُن کے معاصرین سے مصاحبے کر کے عباس تابش کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر معلوم کیا ہے۔ مقالے میں عباس تابش کی شاعری کا مکمل تجزیہ کیا گیا ہے اور معاصرین سے تقابلی جائزہ لے کر اُن کے بارے میں متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔

تحقیق وتنقید میں مکمل کامیابی کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ کئی بشری تقاضوں کی وجہ سے کہیں نہ کہیں کمی رہ جاتی ہے۔ عباس تابش کا شعری سفر چوں کہ چار دہائیوں سے تجاوز کر چکا ہے اس لیے اُن کی شاعری کی وسعتوں کو پار کرنا کارِ آسان نہیں تھا لیکن میں نے ایک محقق ونقاد کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے محنت، لگن اور تنقید کے اعلیٰ معیار کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس کام میں کتنا کامیاب رہا ہوں اس بات کا اندازہ ایک قاری ہی بہتر لگا سکتا ہے۔

عباس تابش کے فکر وفن کا مفصّل تجزیہ کرنے کے لیے اس مقالے کو پانچ ابواب

میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں عباس تابش کے سوانحی حالات درج کیے ہیں۔ سوانحی حالات میں اُن کی پیدائش وخاندانی پس منظر، بچپن، تعلیم، ادبی سفر کے آغاز، ملازمت وعملی زندگی کے آغاز اور ازدواجی زندگی جیسے پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ عباس تابش کی ذاتی زندگی میں ایک اہم پہلو اُن کے خوشگوار ازدواجی حالاتِ زندگی ہیں۔ عباس تابش ایک عرصہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے لیکن اس کے باوجود بھی اُن کے گھریلو حالات اور ازدواجی تعلقات انتہائی خوشگوار رہے۔ اُن کی شخصیت کا جائزہ لینے کے لیے میں نے اُن کے دوستوں سے بھی رابطہ کیا ہے، عباس تابش کی ذاتی زندگی اور خاندانی معلومات کے حوالے سے راقم نے عباس تابش سے ایک طویل انٹرویو کر کے ہر ممکن درست حالات درج کیے ہیں۔ اس باب میں عباس تابش کے تمام شعری مجموعوں کے نام سالِ اشاعت و مقامِ اشاعت کے ساتھ درج کیے ہیں۔

باب دوم میں عباس تابش کی غزل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اُردو غزل کا تعارف، تاریخ اور ابتدا سے جدید غزل تک اُردو غزل کا تدریجی ارتقا لکھا ہے۔ مقالے میں یہ بات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید اُردو غزل کی روایت عباس تابش تک کس طرح پہنچی ہے۔ اس باب میں عباس تابش کی غزل کا اسلوبیاتی وموضوعاتی جائزہ و تجزیہ پیش کیا ہے۔ اُن کی شاعری کے تمام تر فنی محاسن کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ غزلوں میں شامل تمام موضوعات کو الگ الگ کر کے بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں اُردو غزل میں عباس تابش کی اہمیّت کا اندازہ لگایا ہے۔ یہ باب بہت طویل ہے کیوں کہ عباس تابش ایک غزل گو شاعر ہیں۔ اس باب میں عباس تابش کی غزل کے رومانوی، عصری، جمالیاتی نفسیاتی اور سماجی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ''عباس تابش بطور غزل گو'' کی حیثیت سے اُن کی غزلیہ شاعری کا مفصّل جائزہ لیا ہے اور آخر میں عباس تابش کا

معاصر اُردو غزل میں مقام ومرتبہ متعین کیا ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں عباس تابش کی نظموں کا بالتفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کو محض چند نظمیں دے کر خود کو ایک نظم گو شاعر بھی منوا لیا ہے۔ عباس تابش نے صرف ابتدائی دو شعری مجموعوں ''تمہید'' اور ''آسمان'' میں نظمیں شامل کی ہیں۔ اُنھوں نے نظموں کی تخلیق کے لیے آزاد ہیئت کو اختیار کیا ہے۔ اس باب میں جدید اُردو نظم کے ارتقائی مدارج کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے اور عباس تابش کی اُردو نظموں کا اسلوبیاتی وموضوعاتی حوالے سے مفصّل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ آخر میں معاصر اُردو نظم گو شعرا کا تقابلی جائزہ لے کر عباس تابش کا اُردو نظم میں مقام ومرتبہ متعین کیا ہے۔

مقالے کے چوتھے باب میں عباس تابش کی شاعری کا ہر لحاظ سے جائزہ لے کر گزشتہ چند دہائیوں میں تخلیق ہونے والے شعر وادب میں عباس تابش کی شاعری کی اہمیّت کا اندازہ لگایا ہے۔ اس سلسلے میں دیگر شعرا کے کلام کو بھی مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اس باب میں عباس تابش کا شعری مقام ومرتبہ متعین کرنے کے لیے مختلف ادیبوں اور نقادوں کی آرا اور مضامین سے استفادہ کر کے اُن کا درست مقام ومرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

مقالے کے پانچویں اور آخری باب میں عباس تابش کی شاعری کا تنقیدی خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور اُن کی شاعری کے فنی واسلوبیاتی محاسن کے ساتھ ساتھ موضوعاتی پہلوؤں کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ عباس تابش کی شاعرانہ حیثیت اُردو ادب میں مسلمہ ہے۔ اُن کی شاعری میں جزوی طور پر بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی اگر کہیں ہے بھی تو اُن کے منفرد شعری مقام ومرتبے پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس مقالے میں عباس تابش کی شخصیت اور شاعری دونوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

میں اُن شخصیات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں

میرے ساتھ تعاون کیا اور میری مناسب رہنمائی و حوصلہ افزائی کی۔ سب سے پہلے میں ڈاکٹر محمد نعیم بزمؔی صاحب کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے نگران کار کے طور پر میری مکمل رہنمائی کی۔ زیرِ نظر مقالے میں جہاں کہیں حسن کی چاشنی ہے، بزمی صاحب کی وجہ سے ہے۔

میں ڈاکٹر مختار احمد عزمؔی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے اس تنقیدی کام کو سراہا۔ میں معروف شاعر میجر شہزاد نیئرؔ کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے مجھے کچھ ادبی رسائل اور شعری مجموعے فراہم کیے۔ ''دنیائے ادب'' کے ایڈیٹر اوج کمال کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے ''دنیائے ادب'' اپریل ۲۰۰۴ء کا شمارہ فراہم کر کے میری تحقیق کو معتبر بنا دیا۔ میں عہد ساز شاعر شاہد ذکی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے کہا ''تمھیں دیکھوں تو مستقبل بڑا تابناک لگتا ہے'' میں شکیلہ ناز کا بے حد ممنوں ہوں کہ اُن کی دعائیں، محبتیں اور وسائل میرے شامل حال رہے جس کی وجہ سے میں مکمل یکسو ہو کر اس کام میں جُتا رہا۔

ساحل سلہری

جون ۲۰۱۴ء، سیالکوٹ

سخنے چند

عباس تابش معاصر اردو غزل کے ممتاز شاعر ہیں۔ بعض شاعر ممتاز ہوتے ہیں مگر معروف اور مقبول نہیں ہوتے۔ عباس تابش خوش نصیب ہیں کہ انھیں پاکستان اور بیرونِ پاکستان غیر معمولی شہرت ملی ہے۔ اس میں بڑا حصّہ مشاعروں کا ہے جن میں وہ کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ ہر چند مشاعروں کی شہرت عموماً ناپائیدار ثابت ہوتی ہے، ادھر مشاعروں میں شرکت ختم ہوئی اُدھر عوام کی یادداشت سے شاعر کا نام محو ہوا۔ پائیدار شہرت تو اس شاعری کے حصّے میں آتی ہے جس میں ایک نئی تخلیقی دنیا کی تخلیق کی گئی ہو اور وہ کتابوں میں محفوظ ہو گئی ہو، اور اسے اہلِ نظر کا اعتماد حاصل ہو گیا ہو۔ عباس تابش کی غزل میں ہمیں ایک نئی تخلیقی دنیا ملتی ہے جس پر اُن کے اپنے دستخط ہیں۔

ساحل سلہری نے عباس تابش کی شاعری و شخصیت پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے جسے وہ کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں۔ ساحل سلہری نے محنت اور سلیقے سے تابش کا زندگی نامہ مرتب کیا ہے۔ تابش کی غزل اور نظم پر تفصیل سے لکھا ہے۔ دوسروں کی آرا کو سامنے رکھا ہے، ان کا تجزیہ کیا ہے اور پھر اپنی رائے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندہ شخصیتوں پر تحقیق کام آسان نہیں ہوتا اکثر نوجوان محقق شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ جمالیاتی فاصلہ قائم نہیں رکھ پاتے جو غیر جانب دارانہ اور جراٗت مندانہ تحقیق و تجزیے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ساحل سلہری نے عباس تابش کی شخصیت کے سحر سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے اور وہ ان کی حیات و خدمات پر ایک اچھا مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

تخلیقی جوہر

ساحل سلہری نے ایک ہونہار شاعر کے طور پر خود کو متعارف کروانے کے بعد تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی انتہائی خوش سلیقگی کے ساتھ قدم رکھا ہے۔ اس کی تحقیق میں اس کا تخلیقی جوہر نمایاں ہے اور اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو وہ خود شاعر ہے اور دوسرا جس شاعر کا انتخاب اس نے اپنے تحقیقی وتنقیدی مقالہ کے لیے کیا ہے وہ بے پناہ تخلیقی وفور کا حامل ہے۔ عباس تابش اردو غزل کے اہم ترین ناموں میں سے ایک نام ہے جس نے اپنے معاصرین اور نو واردان کو از حد متاثر کیا ہے۔

ساحل سلہری کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس سے نہ صرف موجودگان بلکہ آئندگان بھی استفادہ کریں گے کیوں کہ عباس تابش بے پناہ امکانات سے بھرپور شاعر ہیں اور میری معلومات کے مطابق اُن کی شخصیت اور فن پر کتابی شکل میں بہت کم کام ہوا ہے اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عباس تابش پر ابھی اور لوگ بھی قلم اٹھائیں گے اور ساحل سلہری کا یہ مقالہ یقیناً ان کے لیے انتہائی مدد ومعاون ثابت ہوگا۔

میں ساحل سلہری کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اُس نے برسوں کی ریاضت اور عرق ریزی سے ایسی کتاب پیش کی ہے جو مجھ سمیت مداحین عباس تابش کی تسکین طبع کا سامان کرتی نظر آتی ہے۔

شاہد ذکی

۱۱مئی ۲۰۱۵ء، سیالکوٹ

تاثرات

عباس تابش اردو غزل کے حوالے سے پوری دنیا میں ایک معتبر نام ہے۔ اُن کی شاعری میں ایک عجیب طرح کا سحر ہے۔ ساحل سلہری نے عباس تابش کے حوالے سے تحقیقی کام کر کے ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ طالب علموں کے اس روایتی تحقیقی مقالے سے بالکل مختلف ہے جو صرف نمبروں کے حصول کے لیے تحریر کیا جاتا ہے۔ اس مقالے میں ساحل سلہری کی محبت اور اردو ادب سے گہری واقفیت کے ساتھ ساتھ عباس تابش کی شاعری اور شخصیت سے فکری و دلی لگاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اس مقالے میں جدید اردو غزل کی روایت کے حوالے سے عباس تابش کا جو حصّہ ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے جو بحث کی گئی ہے وہ نہ صرف ادب کے طالب علموں کے لیے مفید ہے بلکہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ادب کی بدلتی ہوئی جہتوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

ساحل سلہری نے اس کام کے لیے پوری طرح دل لگا کر کام کیا ہے۔ اس کا اندازِ بیان خوبصورت اور رواں ہے اور اس میں ایک شعری رقص جھلکتا ہے۔ اس مقالے کے ذریعے نہ صرف عباس تابش کی شخصیت وشاعری کے بہت سے رنگ ہمارے سامنے آئے ہیں بلکہ اس کے بارے میں بڑے شاعروں، ادیبوں کی رائے پڑھ کر اس کی شاعری کا محاسبہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ساحل سلہری کا یہ کام تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر صغرا صدف

ڈائریکٹر پلاک، لاہور

حرفِ تحسین

تحقیق ایک ایسا شعبہ ہے جس میں محقق کی ذاتی لگن اور شوق کے ساتھ وسائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ تحقیق دیگر اصنافِ ادب کے برعکس ایک خشک صنف ہے، لیکن ساحل سلہری نے تحقیقی سفر کا آغاز بڑے اچھے انداز سے کیا ہے۔ ''عباس تابش ایک مطالعہ'' ساحل کا ایم فل اُردو کا مقالہ ہے جس میں اُس نے ''عباس تابش'' کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کرنے میں بڑی بے باکی اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو نظم وغزل کی تاریخ کا احاطہ بھی خوب کیا ہے۔

تحقیق کو اس طرح دلچسپ بنانا کہ تحقیقی طریقۂ کار بھی برقرار رہے اور قاری اسے بوجھ بھی نہ سمجھے بذاتِ خود ایک فن ہے۔ ساحل نے اس مرحلے کو بھی اچھے انداز میں نبھایا ہے۔ اُس نے تحقیق وتنقید دونوں کے درمیان ربط برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے ساحل سلہری کا یہ کام تحقیق وتنقید کے شعبہ میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر افضال بٹ

مجھے ساحل سلہری کا تحقیقی کام ''عباس تابش ایک مطالعہ'' موصول ہوا، میں نے اس مقالے کو بغور پڑھا۔ مقالے کی ترتیب، ابواب بندی بہت مناسب ہیں اور مقالے کو اچھے انداز میں تحقیق وجستجو سے تیار کیا گیا ہے۔ ساحل سلہری کی مقالے کی تیاری میں محنت اور تحقیق قابلِ ستائش ہے اور زبان وبیان، جملوں کی بندش بھی قابلِ تعریف ہے۔ اُس نے یہ تحقیقی وتنقیدی کام باندازِ احسن پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ مقالہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔

ڈاکٹر اختر علی میرٹھی

ساحل سلہری کا مقالہ

ساحل سلہری کا ایم فل اردو کا مقالہ ''عباس تابش ایک مطالعہ'' بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ انھوں نے عمومی سرسری انداز سے ہٹ کر کوشش کی ہے کہ شاعری کی فکری وفنی جہات کا کماحقہ احاطہ کریں۔ انھوں نے عباس تابش کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے لیے جدید اردو نظم وغزل کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور اس پورے سفر کی روشن میں ان کی شاعری کی معنویت متعین کی ہے۔

ساحل سلہری کا اسلوب رواں ہے۔ انھوں نے اپنی رائے کی تصدیق کے لیے جا بجا عباس تابش کے بارے میں لکھی ہوئی اہلِ علم وادب کی آرا کے حوالے دیے ہیں۔ ان حوالوں کی جمع آوری کے لیے انھوں نے جس مشقت سے کام لیا ہے اب ہمارے ہاں خال خال نظر آتی ہے۔ ساحل سلہری خود بھی شاعر ہیں اس لیے ایک سینئر ہم عصر کی شاعری پر ان کا یہ کام ان کے نظریۂ شعر وادب کا اعلان بھی ہے۔ انھوں نے جہاں عباس تابش کی شاعری کو احمد ندیم قاسمی، مرتضٰی برلاس، خالد احمد، نجیب احمد، جان کاشمیری، خالد شریف، عدیم ہاشمی، ریاض مجید، محسن نقوی، انور مسعود اور امجد اسلام امجد کے مقابل رکھ کر دیکھا ہے، وہاں ان کے ہم عصروں سرور ارمان، سعد اللہ شاہ، ثمینہ راجا، انجم سلیمی، شاہد ذکی، اختر عثمان، فیصل عجمی، شہزاد مبشر، حسن عباسی، شاہد زمان، اعجاز رضوی اور ساحل سلہری کے موازنے میں بھی پرکھا ہے اور انھیں بجا طور پر بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ ساحل سلہری نے ایک اہم موضوع پر کام کیا ہے جو یقیناً ان کی پہچان قرار پائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن

شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

حرفِ تہنیت

ساحل سلہری سرزمینِ سیالکوٹ سے تعلّق رکھنے والے باصلاحیت، باکمال اور سلیقہ مند شاعر ہیں مجھے صرف اس بات کا علم تھا۔ مجھے متعدد بار اُن کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ زیرِنظر کتاب ''عباس تابش ایک مطالعہ'' جب میری نظر سے گزری تو مجھ پر یہ کھلا کہ وہ ایک اچھے نقاد اور محقق بھی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک غیر شاعر محقق سے شاعر محقق بہتر کام کرسکتا ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو انتہائی لگن، محنت اور بھرپور جوہرِ تحقیق وتنقید کو بروئے کار لاتے ہوئے مکمل کیا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ کسی موضوع یا شخصیت پر تحقیقی کام جذباتی وابستگی اور رشتہءِ عقیدت کے بغیر ممکن نہیں لیکن ساحل سلہری کے معاملے میں یہ رائے قابلِ تردید ہے کہ انھیں عباس تابش کی شخصیت اور فکروفن سے کوئی ربطِ خاص ہے۔ زیرِنظر کتاب کا ایک مثبت اور بہترین پہلو یہ ہے کہ اس میں عباس تابش پر تحقیقی کام کے دوران معاصر شعرا کے تذکرے اور نمونہءِ کلام شامل کر کے عباس تابش کی انفرادیت کی تائید کی گئی ہے۔ ساحل سلہری نے جملہ شعرا کو اس کتاب کا حصّہ بنا کر ایک عہد کی غزل کی ترجمانی رقم کر دی ہے۔

تحقیقی مقالہ بیک وقت مطالعہ کی چیز بھی ہوتا ہے اور استفادہ کی بھی، اس میں دونوں صفات پیدا کرنا مقالہ نگار کی ذمہ داری ہے۔ زیرِنظر مقالے کے تجزیہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور ساحل سلہری اس میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ کوئی کامیابی معمولی نہیں ہوتی ہے اس لیے کہ وہ بہت سی مزید کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ساحل سلہری نے عباس تابش کی شاعری کے موضوعاتی اور اسلوبیاتی پہلو کو بے حد محنت اور مہارت سے تحقیقی وتنقیدی عمل سے گزارا ہے اور سلیقہ مندی و جامعیت کے ساتھ اپنا نکتہ نظر بیان کیا ہے۔ عباس تابش کی شاعری کے فنی محاسن اور اُن کے بارے میں تجزیاتی رائے نے ساحل سلہری کو مشکل میں ضرور ڈالا ہوگا مگر وہ اس دوہری آزمائش میں یقیناً سرخرو ہوئے ہیں۔ اپنی اس سرخروئی پر وہ بجاطور پر ''حرفِ تہنیت'' کے سزاوار ہیں۔

سرور ارمان

۵ مارچ ۲۰۱۵ء، لاہور

ساحل سلہری کا تحقیقی کام

ساحل سلہری کو ہم ایک شاعر نغز گو کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اُس کے مجموعہء کلام ''کوئی کمی سی ہے'' کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس شاعری میں تازہ کاری کی ایک لہر موجود ہے۔ شعر و ادب کے سلجھے ہوئے قاری نے اس کتاب کا خیر مقدم کیا۔ سیالکوٹ کے ادب خیز شہر سے یہ آواز بلند ہوئی اور غزل کے قاری تک پہنچی۔

اب ساحل سلہری کا تحقیقی کام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک تجزیہ کار نقاد اور محنتی محقق بھی موجود ہے۔ اُس نے حال ہی میں اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ''عباس تابش ایک مطالعہ'' مکمل کیا ہے۔ اُس نے یہ مقالہ ''ایم فل اُردو'' کی نصابی ضرورت کے تحت لکھا ہے اور اس کی تکمیل پر اُسے ایم فل کی ڈگری سے نوازا گیا ہے۔ تاہم یہ بات دھیان میں رہے کہ بعض جامعاتی نصابی مقالات میں حقیقی تنقید و تحقیق کا اس قدر فقدان ہوتا ہے کہ وہ کتابی صورت چھپنے لائق بھی نہیں ہوتے اور نہ ہی چھپتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر تمام جامعاتی مقالات شائع کر دیے جائیں تو ہماری جامعات کے معیارِ تحقیق سے پردہ اُٹھ جائے گا۔

ساحل سلہری کا یہ مقالہ بصورتِ کتاب شائع ہو رہا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کے مندرجات ادبی اہمیّت رکھتے ہیں اور ساحلؔ کی تحقیق کا استحقاق ہے کہ کہ ادب کے قاری تک پہنچے۔ عباس تابش عہدِ موجود کے غزل نگاروں میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی غزل میں ایک عجیب سی تاثیر اور گھلاوٹ ہے۔ اُن کا شعر سنتے ہی حصّہء جاں ہو جاتا ہے۔ یہ عہد، جس میں سے ہم سب گزر رہے ہیں، کو عباس تابش نے فنی

رچاؤ کے ساتھ اپنی غزل میں بیان کر دیا ہے۔ اس عہد کا ملال، جواب اجتماعی ملال بنتا جاتا ہے، تابشؔ کی غزل میں صورتِ جمال جلوہ گر ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں روایت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ محبت کا انفرادی تجربہ اس عہد کے اجتماعی تجربے کی صورت تابشؔ کی شاعری میں بھی محفوظ ہوا ہے۔ ساحل سلہری نے دراصل ''عباس تابش ایک مطالعہ'' میں نہ صرف تابشؔ کی غزل کا تنقیدی مطالعہ اور فنی محاکمہ پیش کیا ہے بلکہ انھیں اپنے ہم عصروں پر جو تفوق حاصل ہے، اُسے بھی نشان زد کیا ہے۔

میرے مطالعے کی رو سے تاریخ ادب کے اکثر اہم شعرا متنازع رہے، زندگی کے کسی نہ کسی دور میں، فکر، شخصیت اور شاعری کے کسی نہ کسی رخ سے وہ اپنے معاصرین میں متنازع ضرور ہوئے۔ میر و غالب، اقبال و جوش، یگانہ و فیض، احمد ندیم قاسمی و منیر نیازی، ن م راشد و انیس ناگی کے نام از خود ذہن میں آ گئے۔ اسی فہرست میں ظفر اقبال و ساقی و فاروقی کے نام بھی شامل کر لیں۔ ان سب کو مختلف انداز میں ہم عصروں کی تنقیص و جرح اور دُشنام و اتہام کا سامنا رہا۔ عباس تابش کا حال بھی کچھ ایسا ہی رہا جبھی تو کہتے ہیں:

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تری گلیوں میں پھرایا گیا میں

اس کتاب میں اگرچہ ساحل سلہری نے عباس تابش کی معاصرانہ چشمکوں کا زیادہ پیچھا نہیں کیا تاہم کسی حد تک تذکرہ ضرور کیا ہے۔ ہم سب یہ جانتے ہیں کہ وقتی تنازعے اور معاصرانہ چشمکیں کسی ادیب کے ادبی مقام و مرتبے پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ وقت از خود کسی کے کام کی اہمیّت و مقام کا تعیّن کر دیتا ہے (اگرچہ ہر بار نہیں بھی کرتا! مشفق خواجہ کہا کرتے تھے کہ میری لائبریری میں سینکڑوں ایسے مخطوطے ہیں کہ چھپ جائیں تو موجودہ کام سے بہت بہتر قرار پائیں!)

چالیس سال پر پھیلے ہوئے عباس تابش کے ادبی مقام کی وقعت نہ صرف نقادانِ فن پر آئینہ ہے بلکہ عام شائقینِ ادب پر بھی روشن ہے۔ ساحل سلہری نے اس اعتراف کو مرتب و منضبط کر دیا ہے۔ اہم نقادوں کے حوالے سلیقے سے داخلِ متن کیے ہیں اور اس طرح یہ کتاب عباس تابش پر حوالے کی ایک کتاب کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

مجھے اس کتاب کے دو ابواب خاص طور پر پسند آئے۔ دوسرے باب میں ساحل سلہری نے تاریخ غزل میں سے گزرتے ہوئے، عباس تابش کی غزل کے رومانوی، جمالیاتی، فنی، عصری اور سماجی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہ کام خوبی اور اختصار سے کرنے میں کامیاب رہا۔ چوتھے باب میں اس نے عباس تابش کا شعری مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں تعیّنِ قدر کی ذیل میں دیگر شاعروں کے کلام سے موازنہ و مقایسہ کر کے کسی کے انفرادی نکات اُجاگر کرنا عملِ مستحسن ہے۔

مجھے ساحل سلہری کا یہ تحقیقی وتنقیدی کام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ اُس نے اس مقالے میں جا بجا میرے تخلیقی وتنقیدی کام کے حوالے دیے ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ ایک توانا شاعر کا، محنت اور ذہانت سے کیا ہوا تحقیقی وتنقیدی کام ہے جس میں شعر کی تفہیم کے بعض پہلو خوبی سے اُجاگر ہوئے ہیں۔ اس کام میں ایک اصالت اور صلابت پیدا ہوئی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ میں ساحل سلہری کے اس مقالے کی تکمیل اور بصورت کتاب اشاعت پر مبارک پیش کرتا ہوں۔

شہزاد نیّر

۵ مارچ ۲۰۱۵ء، راولپنڈی

ساحل سلہری بطور نقاد

ساحل سلہری بہترین دوست، عمدہ شاعر اور اچھا انسان ہے۔ وہ اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا شخص ہے۔ پانچ برس قبل جب میری اُس سے پہلی ملاقات ہوئی وہ مجھے سادہ، آسان اور معصوم لگا تھا بالکل اپنی شاعری کی طرح۔ اب جب کہ اس کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور اس نے ایم فل بھی کر لیا ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ میں نے اس کو دوستوں کے لیے فکرمند ہی پایا ہے۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' کے لیے وہ اپنی غزل کے ساتھ دوست شعراء کی غزلیں بھی ارسال کرتا ہے۔ میں ساحل سلہری کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُس کے شخصی اوصاف کا بھی قائل ہوں۔

عباس تابش کے فن وشخصیت پر ساحل سلہری کا مقالہ میں نے پڑھا ہے۔ یہ نہایت معیاری کام ہے جس میں اس نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ تنقید و تحقیق کے جو تقاضے اور معیارات ہیں اُن کو پورا کیا جائے اور اس میں کافی حد تک وہ کامیاب رہا ہے۔ اس نے عباس تابش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے عہدِ حاضر کے جدید اردو غزل گو شعرا کا تذکرہ بھی بخوبی کیا ہے اس طرح یہ مقالہ جدید اردو غزل کی تاریخ کا حصّہ بن گیا ہے۔ ساحل سلہری کو میں نے ''عباس تابش ایک مطالعہ'' خوب سے خوب تر لکھنے کی جستجو میں سرگرداں پایا ہے۔ اس کا اسلوب منفرد ہے اور اس کی تنقید ایک تخلیق لگتی ہے۔ اس مقالے کی اشاعت پر میں ساحل سلہری کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

حسن عباسی

۲۶ مارچ ۲۰۱۵ء، لاہور

باب اوّل

عباس تابش ________ سوانح و شخصیت

(الف) سوانحی حالات

(ب) شخصیت

باب اوّل

عباس تابش ________ سوانح و شخصیت

(الف) سوانحی حالات

کسی بھی شاعر کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اُس کے سوانحی حالات کے بارے میں آ گہی حاصل کرنا بہت ضروری ہوتا ہے .تا کہ اُس کی پیدائش سے لے کر اُس کی وفات تک کا زمانہ ہماری نظروں کے سامنے ہو۔تحقیق میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ مذکور شاعر کس عہد میں شعر کہتا رہا، اُس کے ہم عصر کون کون تھے۔اُس کا تعلّق کس علاقے سے تھا۔اُس کے زمانے میں ادبی ،سیاسی وسماجی ماحول کیسا تھا۔اُس نے کن حالات میں ،کس طرح اور کب ادبی سفر کا آغاز کیا۔اُس کی شخصیت کیسی تھی اور اُس کے ذاتی مسائل و معاشی حالات کیسے تھے۔شاعر نے اپنی زندگی کے روز و شب کیسے گزارے اور کہاں کہاں کا سفر اختیار کیا۔اُس کے آباؤ اجداد کا شجرہ نسب کیا تھا اور کہاں آباد تھے۔اُس نے اپنی تعلیم کہاں کہاں سے حاصل کی اور اُس زمانے میں کون سے اساتذہ کرام اُسے ملے۔اُس کی کفالت و تربیت کن لوگوں کے سپرد تھی۔شاعر نے کن گلی کوچوں میں اپنا دورِ بچپن اور ایامِ شباب گزارے، ان تمام پہلوؤں کا علم بہت ضروری ہوتا ہے۔

''عباس تابش ایک مطالعہ'' پر کام کرتے ہوئے میں نے اُن کی ذاتی و ادبی زندگی (پیدائش و خاندانی پسِ منظر، بچپن، تعلیم، ادبی سفر کا آغاز، عملی زندگی اور ازدواجی

زندگی) کو ہر ممکن تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اِس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پیدائش و خاندانی پس منظر

عباس تابشؔ کی پیدائش ۱۵/ جون ۱۹۶۱ء کو میلسی ضلع وہاڑی میں ہوئی تھی۔ اُن کا اصل نام غلام عباس ہے جب کہ قلمی نام عباس تابشؔ ہے۔ شاعری میں تابشؔ تخلص کرتے ہیں۔ یہ بات عباس تابشؔ نے ''دنیائے ادب'' کو ایک انٹرویو کے دوران یوں بتائی:

> ''میرا تعلّق میلسی ضلع وہاڑی سے ہے۔ تاریخ و سال پیدائش ۱۵/ جون ۱۹۶۱ء ہے''(۱)۔

عباس تابشؔ کا تعلّق راجپوت بھٹی گھرانے سے ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد میلسی میں آباد تھے۔ اُن کے والد کا نام فیض بخش تھا۔ وہ عمارتیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ وہ چار بہن بھائی (دو بھائی اور دو بہنیں) ہیں۔ عباس تابشؔ کے بڑے بھائی کا نام مشتاق احمد ہے وہ میلسی کے ایک ہائی سکول میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ عباس تابشؔ کے والد ۱۹۷۷ء میں انتقال کر گئے تھے، اُس وقت وہ میٹرک کے طالب علم تھے۔ یہ اُن کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ اُن پر اِس صدمے کا بڑا گہرا اثر ہوا کیوں کہ شاعر زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اِس عمر میں انسان کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ والد کی وفات کے وقت اُن کی تعلیم ابتدائی درجے میں تھی، اِس لیے انھیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بقولِ عباس تابشؔ:

> ''میرے والد کا نام فیض بخش تھا، ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میرے بڑے بھائی کا نام مشتاق احمد ہے اور وہ میلسی کے ہائی سکول میں ٹیچر ہیں۔ ہم راجپوت بھٹی ہیں

> میرے والد عمارتیں بنانے کا کام کرتے تھے اور وہ ۱۹۷۷ء میں انتقال کر گئے''(۲)۔

عباس تابشؔ کے آباؤ اجداد میں کوئی بھی شاعر و ادیب نہ تھا۔ تابشؔ اپنے خاندان میں پہلے شاعر ہیں البتہ اُن کے گھر میں کتابیں پڑھنے اور سننے کا رواج عام تھا اس لیے اُن کے اندر بچپن ہی سے ایک تخلیق کار پروان چڑھنا شروع ہو گیا تھا جو بعد میں ایک شاعر کے روپ میں ۱۹۷۵ء میں سامنے آ گیا۔ عباس تابش کے بڑے بھائی تعلیم یافتہ تھے اس لیے اُنھیں گھر میں بھی تعلیمی ماحول مل گیا۔ اُن کی کتاب و قلم سے دوستی اور پختہ ہو گئی جس سے اُن کی طبیعت میں پڑھنے لکھنے کا رجحان بڑھتا گیا اور اُن کے اندر ایک ادیب نئی کونپلوں کی صورت پھوٹنے لگا۔

عباس تابش کے والد شاعری (بالخصوص صوفیانہ کلام) اور قصے، کہانیاں سننے کے بڑے شوقین تھے اور گھر میں ایسی کئی کتابیں لا کر رکھا کرتے تھے۔ یہی کتابیں بعد میں عباس تابش کے علمی و ادبی مزاج پر اثر انداز ہوئیں اور وہ پیدائشی طور پر ہی ایک شاعر پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے عباس تابش ''دنیائے ادب'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''میرے بزرگوں میں کسی کو بھی شعر و شاعری سے شغف نہیں تھا البتہ میرے والد ''بانگِ درا'' اور ''سیف الملوک'' شوق سے سنتے تھے اور یہی کتابیں بعد ازاں مجھ میں شاعری کے جراثیم منتقل کرنے میں کامیاب رہیں''(۳)۔

بچپن

عباس تابشؔ کا بچپن میلسی کے گلی کوچوں میں گزرا، وہ شروع ہی سے سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ البتہ کبھی کبھی بڑا قہقہہ لگا دیتے ہیں۔ عباس تابش نے بھی اپنا بچپن روایتی بچوں کی طرح کھیل کود کر گزارا لیکن اپنے سکول کی پڑھائی کی طرف خاص دھیان دیتے تھے۔ گھر میں سب لوگ اُن سے پیار کرتے تھے، چھوٹے ہونے کی وجہ سے تھوڑے ضدی بھی تھے اور اکثر اپنی بات منوا کر ہی دم لیتے تھے۔ اس بات کا احساس اُن کی شاعری میں بھی ہوتا ہے کہ وہ جدید غزل کے معیار کے معاملے میں بھی ضدی ہیں کیوں کہ شاعری میں سمجھوتا اُنھیں کسی طور پسند نہیں اور ایک اچھے شاعر کا ضدی ہونا ایک فطری سی بات ہے عباس تابش کی طبیعت کا یہ پہلو آج بھی اُن کے مزاج کا ایک حصّہ بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں خالد احمد، ''تمہید'' کے دیباچے میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش اپنی طبیعت میں نیاز رکھتے ہوئے بھی ذرا ہٹ دھرم واقع ہوا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک صاحبِ اسلوب فنکار کا ذرا سا ضدی ہونا فطری طور پر ضروری ہوتا ہے کیوں کہ سمجھوتے کا رویہ ایک شاعر کو ''مقبول شاعر'' کے درجے پر تو فائز کر سکتا ہے ''صاحبِ اسلوب شاعر'' ہرگز نہیں بننے دیتا۔ وہ شعرا جو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ٹھہریں ان کے معاملے میں سمجھوتا قاری کی طرف سے ہوتا ہے۔ غالب ایک ایسی ہی مثال ہے'' (۴)۔

عباس تابش کے والدین کو ان سے بڑی توقعات تھیں، اس لیے وہ بچپن میں بھی بڑے محنتی اور زیرک لگتے تھے عام بچوں کی نسبت وہ تھوڑے مختلف بھی تھے۔ بچپن کا زمانہ بڑا سہانا ہوتا ہے یہ ہر کسی کو بڑا یاد آتا ہے، آدمی بچپن کے دوستوں اور واقعات کو کبھی بھول نہیں پاتا۔ عباس تابش کو اپنا بچپن کچھ زیادہ ہی یاد آتا ہے کیوں کہ وہ اوائل عمری ہی میں اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر لاہور آ گئے تھے۔ اپنے وطن سے یہ دوری بھی اُن کی طبیعت میں اُداسی پیدا کرنے کی ایک وجہ بنی۔ اُن کو میلسی کی وہ گلیاں آج بھی یاد ہیں جہاں وہ پل کر جوان ہوئے تھے۔ اس لیے عباس تابش نے اپنے بچپن کا تذکرہ کئی اشعار میں کیا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

بچپن کا دور عہد جوانی میں کھو گیا
یہ امر واقعہ بھی کہانی میں کھو گیا
(تمہید)

میں اب بھی ڈھونڈ سکتا ہوں ترا کھویا ہوا بچپن
مجھے الٹے قدم چلنا مگر اچھا نہیں لگتا
(تمہید)

تعلیم

عباس تابش کی ابتدائی تعلیم اُن کے والد کی نگرانی میں ہوئی۔ اُنھوں نے ۱۹۷۷ء میں میٹرک کا امتحان میلسی کے ہائی سکول سے درجہ اوّل میں پاس کیا۔ اِسی سال اُن کے والد جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ عباس تابشؔ پر اِس صدمے کے اثرات ایسے پڑے کہ اُن کی تعلیم کچھ عرصے کے لیے رک گئی۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھنے سے اُن کی زندگی بری طرح متاثر ہوئی۔ معاشی مسائل کے باعث چار سال کے وقفے کے بعد اُنھوں نے دوبارہ

تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔عباس تابش ، مجید امجد سے کافی متاثر تھے اس لیے اُنھوں نے ساہیوال کا رخ اختیار کرلیا۔

اُس زمانے میں مجید امجد ایک بڑے شاعر تھے اس لیے مجید امجد کی طرف اُن کا جھکاؤ فطری تھا۔اس طرح عباس تابش نے گورنمنٹ ڈگری کالج ساہیوال میں داخلہ لے لیا۔ بارہویں جماعت کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد ۱۹۸۱ء میں عباس تابش لاہور آ گئے۔ پہلے اُنھوں نے روز نامہ ''جنگ'' میں ملازمت اختیار کی اور کچھ عرصے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ چار سال کے وقفے کے بعد عباس تابش نے ۱۹۸۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور ہی سے ایم اے اُردو کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا۔اُنھوں نے ایم اے اُردو کا مقالہ ''احمد ندیم قاسمی کی شاعری'' کے عنوان سے لکھا۔عباس تابش نے محنت کرتے ہوئے والد کی وفات کے بعد ماسٹر لیول تک اپنی تعلیم مکمل کر لی۔عباس تابش ''دنیائے ادب'' کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے تعلیمی سلسلے کے بارے میں یوں کہتے ہیں:

> ''۱۹۷۷ء میں میٹرک کیا......اسکولنگ میلسی میں ہوئی۔ ڈگری کالج ساہیوال سے انٹرمیڈیٹ کیا اور ۱۹۸۱ء میں لاہور آ گیا اور روز نامہ 'جنگ' میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۸۵ء میں بی اے کیا اور ۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کی سند حاصل کی'' (۵)۔

عباس تابش کے والد فیض بخش نے اُن کی تربیت اچھے ماحول میں کی تھی۔ میٹرک تک تعلیم میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔اُنھیں اپنے والد کی شفقت و محبت اچھی طرح یاد

ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ وہ والد کی تربیت کی وجہ سے آج اِس مقام پر پہنچے ہیں۔سولہ سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد عباس تابش سخت مشکلات سے گزرتے ہوئے اِس مقام پر پہنچے ہیں۔وہ آج اُردو ادب کے اہم شاعر اور محکمہ تعلیم میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ خود اُن کے بقول یہ سب اُن کے والد کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔عباس تابش اپنے بچپن اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے کہتے ہیں:

> '' جب میں نے پانچویں جماعت کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو گھر آ کر سب سے پہلے اپنے والد صاحب کو یہ خبر سنائی اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ میرا فلاں دوست جو اچھے نمبروں کا دعویٰ کرتا تھا صرف پاس ہوا،تو میرے والد صاحب نے اِس بات کا برا محسوس کیا اور مجھے سمجھایا کہ آئندہ کسی کے بارے میں ایسی بات کبھی نہ کرنا ہوسکتا وہ دل ہی دل میں تیری بات کا برا منائے'' (۶)۔

عباس تابش کے والد بڑے نیک دل اور درویش صفت انسان تھے اس لیے اُن کے گھر کا ماحول بڑا اچھا تھا۔ اسی ماحول میں اُنھوں نے آنکھ کھولی اور اس وجہ سے عباس تابش بھی بڑے ملنسار، با اخلاق، محبِ وطن، سچّے اور کھرے کردار و شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ سب عباس تابش کے بزرگوں کی صحبت اور تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہے کیوں کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اُس کے اثرات اُس پر مرتب ہوتے ہیں۔عباس تابش کے بڑے بھائی بھی پڑھے لکھے ہیں اس لیے گھر میں ایک تعلیمی ماحول کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ عباس تابش نے بچپن ہی سے علم و ادب میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔اُن کو علم و ادب
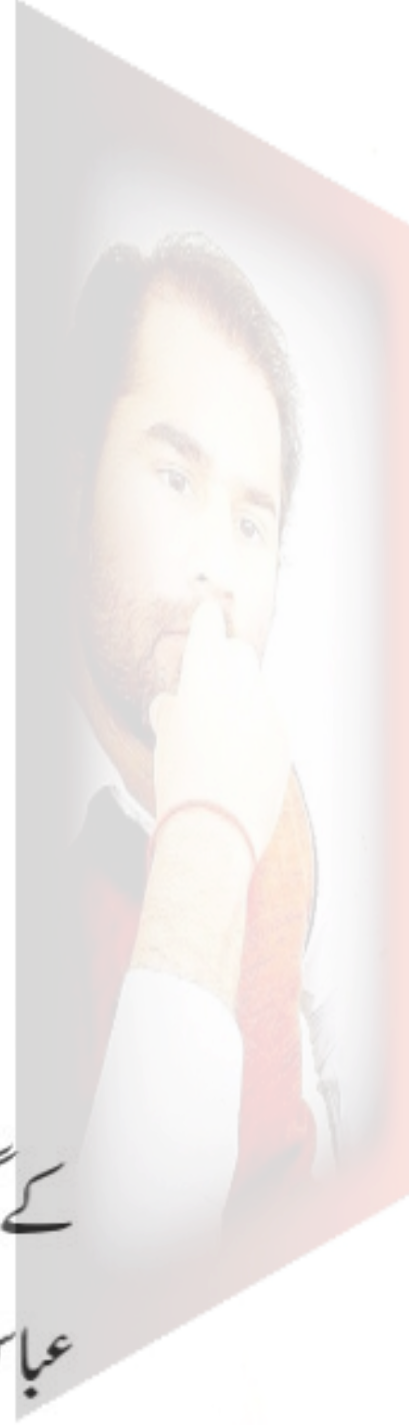
سے شغف کچھ اپنے والد کی کتابوں کی وجہ سے بھی ہوا۔ عباس تابش نے معاشی تنگ دستی کے باوجود میلسی سے ساہیوال اور پھر ساہیوال سے لاہور کا سفر اختیار کیا، یہ سب اُنھوں نے حصولِ تعلیم کی غرض سے کیا۔

ادبی سفر کا آغاز

عباس تابش نے شاعری کا آغاز سکول کے زمانے سے کر دیا تھا۔ اُنھوں نے ۱۹۷۵ء ہی میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ عباس تابش ایک غزل گو شاعر ہیں، تاہم اُنھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن زیادہ پذیرائی اُن کو بطور غزل نگار شاعر ہی ملی ہے۔ ابتدائی دور میں حسبِ روایت تابش نے بھی اصلاح میلسی کے ایک شاعر نذیر ازفر سے لی۔ اُس وقت میلسی میں ۸۰ کے قریب شاعر تھے۔ پہلی دفعہ کیف انصاری نے اپنے اخبار روز نامہ ''آفتاب'' میں اُن کی غزل شائع کی تھی جس کا مصرع تھا۔

''شب کی دیوار گرے صبح کا منظر جاگے''

اپنی غزل کو پہلی مرتبہ کسی اخبار میں پڑھ کر اُن کو بے حد خوشی ہوئی۔ اِس سے اُن کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی۔ بقولِ عباس تابش:

> ''جب میں نے پہلی بار اپنی غزل کو اخبار میں دیکھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اِسی خوشی سے مجھے ساری رات نیند نہ آئی تھی۔ پھر میں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی''(۷)۔

عباس تابش نے اگرچہ سکول کے زمانے ہی سے باقاعدہ شعر کہنا شروع کر دیا تھا مگر اُنھیں اعتماد ۱۹۸۱ء میں لاہور آنے کے بعد ہی ملا، ۱۹۸۳ء میں جب اُن کی تین غزلیں

''فنون'' میں شائع ہوئیں تو اُس وقت اُنھوں نے بطور شاعر سند حاصل کی۔ شاعری کے آغاز اور اپنے استاد (نذیر ازفر) سے اصلاحِ سخن کے حوالے سے عباس تابش کہتے ہیں:

> ''میں نے شاعری کا آغاز ۱۹۷۵ء میں کیا، میں اُس وقت ہائی سکول میلسی کا طالب علم تھا۔ ابتدا میں میلسی کے ایک شاعر نذیر ازفر کو غزلیں دکھاتا تھا۔ اُس زمانے میں میلسی شہر میں ۸۰ شاعر تھے''(۸)۔

عباس تابش نے اسکولنگ دور میں ہی اچھا شعر کہنا شروع کر دیا تھا، سکول کے اساتذہ اکثر اُن سے غزل سنانے کا مطالبہ کرتے تھے اور تابش اُنھیں اپنی غزلیں سنا کر خوب دادِ تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں میلسی کے ادبی حلقے میں بھی اُن کا اچھا تعارف ہو چکا تھا۔ ''ماہِ نو'' اور ''نوائے وقت'' میں اُن کا کلام ۱۹۷۸ء میں شائع ہونا شروع ہو گیا تھا مگر اُنھوں نے دو سال تک اساتذہ کے کلام کا خوب مطالعہ کیا اور شاعری کی ریاضتیں کرتے رہے۔ اِس دوران اُنھوں نے نذیر ازفر اور خالد احمد سے مکمل رہنمائی حاصل کی۔

ادبی حلقوں میں اس نوجوان اور توانا لہجے کے شاعر کا خوب چرچا ہونے لگا اگرچہ تابش، سکول کے زمانے ۱۹۷۵ء سے شعر کہتے تھے اُن کی شاعری شائع بھی ہوتی رہی مگر اُنھوں نے اپنے شعری سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۳ء میں تسلیم کیا جب اُن کی تین غزلیں ''فنون'' میں شائع ہوئیں۔ ادبی رسالے 'فنون' میں غزلیں شائع ہونے کے تین سال بعد عباس تابش نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''تمہید'' ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ اِس حوالے سے عباس تابش کہتے ہیں:

''۱۹۷۸ء میں ''ماہِ نو'' میں......روزنامہ ''نوائے وقت'' میں میرا کلام اشاعت کے مراحل سے گزرتا رہا......دو سال تک محض اساتذہ کا مطالعہ اور شاعری کی ریاضت کرتا رہا۔ اسی دوران خالد احمد نے میری رہنمائی کی ۱۹۸۳ء میں میری تین غزلیں ''فنون'' میں شائع ہوئیں اور یوں میرے شعری سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا''(۹)۔

عباس تابش کے پہلے شعری مجموعے ''تمہید'' کی اشاعت کے وقت اُن کی عمر ۲۵ سال تھی اور وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اُردو کے طالب علم تھے۔ اس عمر میں اُنھوں نے اُردو ادب میں ایک یادگار شعری مجموعے کا اضافہ کیا جس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور پہلی شاعری کو بڑی شاعری بھی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ ''تمہید'' کی شاعری بڑی شاعری ہے۔ خالد احمد، عباس تابش کی ابتدائی شاعری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۲۵ برس کے عباس تابش کا نورِ شعور ''تمہید'' کے نام سے طلوع ہو رہا ہے اور میں یہ سوچ کر پشیمان ہو جاتا ہوں کہ جب میں ۲۵ برس کا تھا تو میرے دامن میں کیا تھا؟ میرا اپنا تشخص بھی نہیں! جب کہ عباس تابش پاکستانی ادب کی بیکرانی میں ''زمزمہ انا البحر'' کے ساتھ ''ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟'' کہتا ہوا پاکستانی تشخص کی چمک بن کر شامل ہو چکا ہے کسی منزل شناس کے لیے

منزل کنار ہونے سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی ہے''(۱۰)

عباس تابش کے ابتدائی دور کی شاعری کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

میرے سینے سے ذرا کان لگا کر دیکھو
سانس چلتی ہے کہ زنجیر زنی ہوتی ہے
(تمہید)

چراغ صبح جلا کوئے ناشناسی میں
اک اور دن کا اضافہ ہوا اداسی میں
(تمہید)

یوں تھوک نہ مجھ پر مرے ہارے ہوئے دشمن
یہ میری کماں ہے یہ مرے تیر پڑے ہیں
(تمہید)

عباس تابش نے مجید امجد، سلیم احمد، ظفر اقبال، خالد احمد اور مرتضیٰ برلاس جیسے جدید غزل گو شعرا کو اپنا آئیڈیل چنا۔ اس لیے وہ آج جدید اُردو غزل کے ایک اہم شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے پیش رو شعرا کی شاعری پر مکمل نظر رکھی اور اُن سے آگے کی شاعری تخلیق کی۔ عباس تابش نے اساتذہ کا کلام اچھی طرح سے پڑھا یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں میرؔ، غالب، یگانہ سمیت عصر حاضر کے اہم شعرا احمد ندیم قاسمی، خالد احمد اور مرتضیٰ برلاس کا ذکر ملتا ہے۔ عباس تابش آئیڈیل کے حوالے سے کہتے ہیں:

''اگر آئیڈیل بیدلؔ ہے تو غالبؔ بنتا ہے، رومیؔ ہو تو اقبالؔ بنتا ہے لہٰذا اگر ہمیں بڑا شاعر بننا ہے تو ہمیں کسی بہت

بڑے شاعر کو idealize کرنا ہوگا''(۱۱)۔

عباس تابش نے اپنے پیش روشعرا میں بعض کے اثرات بھی قبول کیے لیکن یہ بات اُن کے ابتدائی دور کی ہے بعدازاں اُنھوں نے لمحۂ موجود کے اثرات ترک کر کے اپنا ایک نیا و منفرد اسلوب بنالیا کیوں کہ کسی کے اثرات کب تک ساتھ چلتے ہیں۔ ابتدا میں تابش نے مجید امجد کی شاعری کے اثرات قبول کیے۔ عباس تابش کے پہلے شعری مجموعے ''تمہید'' میں مجید امجد کا رنگ نظر آتا ہے۔ مجید امجد کے اثر کا اعتراف اُنھوں نے خود کیا ہے۔ عباس تابش ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کراچی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ابتدا میں ہر نوجوان شاعر عہدِ رواں کے کسی نہ کسی شاعر کے اثرات قبول کرتا ہے۔ انھی دنوں مجید امجد کا انتقال ہوا تھا اور اُن پر تواتر سے ریڈیو پروگرام اور اُن کا کلام براڈ کاسٹ ہوتا تھا۔ اِس جانب میری رغبت فطری تھی چنانچہ میں نے مجید امجد کے شہر ہی سے انٹرمیڈیٹ کرنے کا فیصلہ کیا یہ میری مجید امجد کے اثرات قبول کرنے کی انتہا تھی۔ آپ کو میری ابتدائی شاعری میں مجید امجد کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوں گے بعدازاں سلیم احمد اور ظفر اقبال کے اثرات قبول کیے۔ اس ضمن میں، میں نے ''آبِ رواں'' کو بار بار پڑھا اور ظفر اقبال کے کرافٹ کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اب بھی جو جدید حسیت ہے اس میں روز بروز ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے خالد احمد کی

> گفتگو میری سمت نمائی کرتی ہے لہٰذا مجھ پر زیادہ اثرات خالد احمد کے ہیں''(۱۲)۔

تمام شعرا کی روایت ہے کہ وہ کسی نہ کسی سے ضرور متاثر ہوئے، اساتذہ سے اصلاح لیتے رہے اور ایک عرصہ اُن کے رنگ میں شعر کہتے رہے۔ اقبال نے بھی داغ دہلوی سے اصلاح لی اور اُن کے رنگ میں غزلیں تخلیق کیں لیکن جلد ہی اُنھوں نے غزل کا رسمی رنگ ترک کر کے اپنے مزاج کا تعیّن خود کیا۔ اسی طرح عباس تابش نے بھی کچھ دیر کے بعد اپنے پیش رو شعرا کے اثرات سے کنارا کشی اختیار کر لی اور مستقل بنیادوں پر غزل میں ایک نیا رنگ و آہنگ استعمال کر کے خود کو ایک صاحب اسلوب شعرا کی فہرست میں شامل کروالیا ہے۔ بقولِ عباس تابش:

> ''مستقل مطالعے نے مجھ پر ایک حقیقت روشن کی کہ شاعری لمحۂ موجود کے اثرات قبول کرنے کا نام نہیں ہے کیوں کہ یہ تھوڑی دیر تک تو کی جا سکتی ہے، مستقل نہیں ۱۹۸۱ء میں جب لاہور آیا تو مجھے اساتذہ کو پڑھنے کا موقع میسر آیا اس سے قبل ۱۹۷۸ء میں ''ماہِ نو'' میں جب کشور ناہید، مدیرہ تھیں میرا کلام شائع ہوتا رہا اس کے ساتھ ہی روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور میں بھی میرا کلام اشاعت کے مراحل سے گزرتا رہا تاہم لاہور آ کر احساس ہوا کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ مین اسٹریم کی شاعری نہیں ہے لہٰذا دو سال تک محض اساتذہ کا مطالعہ اور

شاعری کی ریاضت کرتا رہا'' (۱۳)۔

عباس تابش کو اس لیے روایت سے جڑا ہوا جدید غزل گو شاعر کہتے ہیں کیوں کہ انھوں نے روایت کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ اُنھوں نے روایت سے اکتسابِ فیض ضرور کیا ہے مگر اُن کے کلام میں کسی کا تتبع کرنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ عباس تابش نے غالب کی زمینوں میں بھی غزلیں لکھی ہیں مگر اُن کا اپنا اسلوب، اپنا لہجہ، اور اپنے مضامین ہیں۔ اُنھوں نے شاعری بڑی ریاضت کے بعد تخلیق کی ہے۔ اُن کی نظر اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر رہتی ہے جب وہ شعر کہتے ہیں تو اس وقت یہ تینوں زمانے اُن کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ اس لیے عباس تابش کی غزل میں روایت کی چاشنی، حال کی کثیر الجمالی اور مستقبل کی آواز شامل ہے۔

عباس تابش عہد حاضر کے ایک اہم جدید غزل گو شاعر ہیں، اُن کے قارئین اور مداح پوری دنیا میں موجود ہیں اس لیے عباس تابش اکثر بیرونِ ملک اور عالمی مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے پہلی بار ۱۹۹۶ء میں دبئی کے مشاعرے میں شرکت کی، ۱۹۹۷ء میں امریکہ مشاعرے کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے انگلینڈ، اسٹریلیا، ناروے، ابوظہبی، بحرین کے مشاعروں میں شرکت کی۔ عباس تابش بھارت میں بے حد مقبول ہیں اس لیے وہ بھارت متعدد بار جا چکے ہیں۔ وہ ملک کے بڑے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے ہیں اور اکثر مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ انھوں نے کب پہلی بار کسی بیرونِ ملک مشاعرے میں شرکت کی، اس حوالے سے، عباس تابش ''دنیائے ادب'' کو بتاتے ہیں:

> ''میں پہلی مرتبہ سلیم جعفری کی دعوت پر ۱۹۹۶ء میں جشنِ سپاس کے موقع پر دبئی گیا۔ یہ مشاعرہ میرے لیے بریک

> تھرو ثابت ہوا کیوں کہ بعد میں اُن کی مشاعرہ کیسٹ نے میری راہیں ہموار کر دیں اور یوں مجھے ۱۹۹۷ء میں نیئر جہاں کی دعوت پر امریکہ بلایا گیا'' (۱۴)۔

عباس تابش مشاعرے کے کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں اس لیے احباب انھیں بار بار مشاعروں میں بلاتے ہیں، اس حوالے سے شکیل جاذب، ''عشق آباد'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''تم مشاعروں کے بھی کامیاب شاعر ہو۔ ایک بڑے شاعر کے لیے مشاعرے کا کامیاب شاعر ہونا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ مگر تم نے اس فلسفے کے غبارے سے بھی ہوا نکال دی جس کے بل بوتے پر بڑے بڑے شاعر اپنے آپ کو مشاعروں میں داد نہ ملنے پر تسلی دے لیا کرتے تھے۔ آج سب جانتے ہیں کہ عباس تابش مشاعرے کی وجہ سے کامیاب شاعر نہیں بلکہ عباس تابش کی وجہ سے مشاعرہ کامیاب بن جاتا ہے۔ تم عوام کے شاعر بھی ہو اور شاعروں کے شاعر بھی'' (۱۵)۔

عباس تابش مشاعروں کے حوالے سے بے حد مقبول ہیں جب بھی کہیں کسی مشاعرے کا انعقاد ہوتا ہے اہلِ ذوق اور اہلِ ادب انھیں ضرور یاد کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اصغر ندیم سید لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش آج بے حد مقبول شاعر کے طور پر امریکہ،

یورپ، خلیجی ریاستوں اور ہندوستان میں جانا پہچانا جاتا
ہے اُس نے کسی گلوکار کا سہارا نہیں لیا بڑے گلوکار تو گزر
گئے اس نے کسی پاپ سنگر یا یوسف صلاح الدین کی حویلی
میں پروان چڑھنے والی گائیکی کا بھی سہارا نہیں لیا۔
گورنمنٹ کالج لاہور سے سیدھا عملی زندگی میں آیا،
پاؤں پاؤں چلتا ہوا سفرِ زیست میں آیا'' (۱۶)۔

عباس تابش کی مشاعروں میں کامیابی اُن کے جدید اُردو غزل کے اچھوتے پن اور منفرد اسلوب اور رنگ و آہنگ کی وجہ سے ہے۔ اُنھوں نے عالمی مشاعروں کو بھی لوٹا ہے۔ اِس حوالے سے حسن عباسی کہتے ہیں:

''ادبی دنیا میں عباس تابش کی شخصیت کافی حد تک
متنازع رہی اور انھیں بہت مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تو
میری اس میں رائے یہ ہے کہ دوستوں کی شکایات ہو سکتا
ہے اُن سے متعلّق کسی حد تک درست ہوں مگر مخالفین
صرف اُن کو اچھے شاعر ہونے کی سزا دیتے رہے
ہیں کیوں کہ عباس تابش کی موجودگی میں اُن کی دال نہیں
گلتی۔ مشاعرہ ہمیشہ عباس تابش نے لوٹا ہے'' (۱۷)۔

عباس تابش کو اُن کے پانچویں شعری مجموعے ''رقصِ درویش'' کی زبردست پذیرائی کی بنا پر ''تہذیب فاؤنڈیشن کراچی'' کی جانب سے ۲۰۰۸ء میں بہترین شعری مجموعے کا ایوارڈ دیا گیا۔ علاوہ ازیں عباس تابش کو ادبی تنظیموں کی طرف سے ایوارڈز اور

اعزازی شیلڈز مل چکی ہیں۔ عباس تابش کو یہ ایوارڈز اُن کی بہترین شعری صلاحیتوں کی بنا پر دیے گئے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ کہتے ہیں:

زندگی بھر میں کوئی شعر تو ایسا ہوتا
میں بھی کہتا جو مرا زخمِ دروں ہے یوں ہے
(رقصِ درویش)

عباس تابش ایک جدید غزل گو شاعر ہیں لیکن اُنھوں نے چند آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ عباس تابش کے اب تک پانچ شعری مجموعے اور ایک کلیات اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام درج ذیل ہیں۔

- ☆ تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعتِ اوّل ۱۹۸۶ء، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء
- ☆ آسمان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعتِ اوّل ۱۹۹۲ء، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء
- ☆ مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت ۱۹۹۸ء
- ☆ پروں میں شام ڈھلتی ہے، لاہور، اپنا ادارہ، اشاعت ۲۰۰۳ء
- ☆ رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، اشاعت جون ۲۰۰۸ء
- ☆ عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۱۱ء

عملی زندگی کا آغاز

عباس تابش نے ۱۹۸۱ء میں میلسی کے ایک گاؤں ''شاہ پور ثانی'' کے ایک پرائمری سکول میں بطور مدرس اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ چند ماہ ملازمت کرنے کے بعد یہاں اُن کو اپنا کوئی خاص مستقبل نظر نہ آیا تو ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ لاہور میں روزنامہ ''جنگ'' میں ملازمت کی اور ایم اے اُردو تک تعلیم حاصل کر لی۔ اِس دور میں وہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے شام کو پاک ٹی ہاؤس چلے جاتے۔ عباس تابش نے

بہت جلد لاہور کے بڑے مشاعروں میں جانا شروع کر دیا اور اُن کی پہچان لاہور کے اچھے شعرا میں ہونے لگی۔ لاہور گروپوں کا شہر ہے لیکن اُنھوں نے کسی گروپ میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ لاہور میں عباس تابش کو ابتدا میں بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑا مگر بعد میں جلد ہی انھیں چند مہربان دوست مل گئے۔ لاہور میں ان کا اٹھنا بیٹھنا خالد احمد اور مرتضیٰ برلاس جیسے اچھے شعرا کے ساتھ ہو گیا۔ مرتضیٰ برلاس نے عباس تابش کی اُس وقت رہنمائی کی جب وہ شروع شروع میں میلسی چھوڑ کر لاہور آئے۔ اِس سلسلے میں عباس تابش کہتے ہیں:

> ''جب میں لاہور آیا تو بڑی مشکلات کا سامنا رہا۔ میں اِن مشکلات کی وجہ سے کئی بار مایوس بھی ہوا۔ یہاں میں اپنے ایک محسن، مرتضیٰ برلاس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اُس مشکل دور میں جب میں پہچان بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُنھوں نے مجھے آل پاکستان مشاعروں میں بُلا کر اعتماد بخشا اور اُس وقت میرا ہاتھ پکڑا جب بڑے شاعر میرے سلام کا جواب بھی مشکل سے دیا کرتے تھے''(۱۸)۔

والد کی وفات کے بعد عباس تابش کے مالی حالات اچھے نہ رہے مگر پھر بھی وہ اپنے مشن پر ڈٹے رہے اور حصولِ علم کے لیے میلسی سے ساہیوال اور بعد ازاں لاہور آ گئے۔ اُنھوں نے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے 'جنگ' میں بطور پروف ریڈر ملازمت کی اور خود کما کر گورنمنٹ کالج لاہور کی فیس ادا کرتے رہے۔ اس قلیل تنخواہ میں عباس تابش بڑی مشکل سے گزر بسر کرتے تھے۔ اس سلسلے میں عباس تابش مجھے احسان

دانش کی طرح لگتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ احسان دانش نے ہاتھ سے مزدوری کی اور علم و ہنر میں کمال حاصل کیا، جب کہ عباس تابش نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کر کے تعلیم حاصل کی اور شعر و سخن میں مقام پیدا کیا۔ اس دوران اُنھوں نے اپنا پہلا شہرہ آفاق شعری مجموعہ ''تمہید'' شائع کر دیا، اس مجموعے کو اُردو ادب میں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی اور عباس تابش کی مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔

عباس تابش کو کچھ سال معاشی مسائل کا سامنا تو کرنا پڑا مگر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو پاس کرنے کے دو سال بعد ہی انھیں ۱۹۸۹ء میں بطور لیکچرار لالہ موسیٰ کے ایک سرکاری کالج میں ملازمت مل گئی۔ چار سال بعد ۱۹۹۳ء میں وہ لالہ موسیٰ سے تبادلہ کروا کر لاہور آ گئے، پہلے گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ، لاہور میں پڑھاتے رہے اور آج کل وہ گورنمنٹ بوائز کالج گلبرگ لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ یہ سب ان کی محنت کا نتیجہ ہے بقولِ عباس تابش:

> ''۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۹ء میں بطور لیکچرار تقرر ہوا اور لالہ موسیٰ میں تعیناتی عمل میں آئی۔ ۱۹۹۳ء میں لاہور ٹرانسفر ہو گیا اور ہنوز لاہور ہی میں ہوں''(۱۹)۔

عباس تابش کی زندگی، والد کی وفات کی وجہ سے معاشی مسائل کا شکار ہو چکی تھی۔ عباس تابش نے رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ معاشرتی رویوں، معاشی تنگ دستی جیسے پہلوؤں سے بھی بہت کچھ سیکھا اس لیے یہ شعر کہا:

یہ نکتہ کٹتے شجر نے مجھے کیا تعلیم
کہ دکھ تو ملتے ہیں گر خواہشِ نمو کی جائے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ازدواجی زندگی کا آغاز

عباس تابشؔ ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء کو رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔ اس لیے وہ لالہ موسیٰ سے تبادلہ کروا کر لاہور آ گئے اُن کی بیوی کا تعلّق تحصیل علی پور کے ایک علاقے ''شہر سلطان'' سے ہے۔ وہ خاندانی حوالے سے قریشی ہیں۔ وہ گلبرگ کالج میں اسلامیات کی پروفیسر ہیں، عباس تابش اپنی شادی کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''میں نے شہر سلطان کی ایک قریشی فیملی میں ۱۲/فروری ۱۹۹۳ء کو شادی کر لی۔ میری بیوی گلبرگ کالج میں اسلامیات کی پروفیسر ہے''(۲۰)۔

عباس تابش ایک ایسے شاعر ہیں جن کو بہت کم عرصے میں اور اپنی زندگی میں شہرت نصیب ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں شاعری جیسی نعمت دی ہے مگر دوسری طرف شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے بعد تک عباس تابشؔ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ اولاد قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ اور انسان کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے اس کے بغیر گھر میں رونق نہیں آتی۔ ایک عرصہ اولاد سے محروم رہنے کے بعد بھی ان کے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات انتہائی خوشگوار رہے۔ عباس تابش نے بچوں کی کمی شدت سے محسوس کی۔ اُن کی اس کیفیت کی ترجمانی، انھی کے اشعار کر رہے ہیں:

فقط مال وزرِ دیوار و در اچھا نہیں لگتا
جہاں بچے نہیں ہوتے وہ گھر اچھا نہیں لگتا

گلی میں کھیلتے بچوں کے ہاتھوں کا میں پتھر ہوں
مجھے اس صحن کا خالی شجر اچھا نہیں لگتا
(تمہید)

تم مانگ رہے ہو مرے دل سے مری خواہش
بچہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا
(آسمان)

کبھی کبھی کسی بچے کی روح آتی ہے
کبھی کبھی مرے گھر گیند اُچھلنے لگتے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی شے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اب اُنھیں خدا نے ایک بیٹی عطا کر دی ہے اور اس کی عمر چار سال ہے اُنھوں نے اپنی بیٹی کا نام ہادیہ تابش رکھا ہے۔

(ب) شخصیت

شخصی حوالے سے بات کریں تو عباس تابشؔ وسیع المشرب اور خوش اخلاق آدمی ہیں۔ کسی کو ان سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ تمام دوست احباب ان کی خوش طبعی سے خوش ہیں۔ وہ اجنبی کو بھی فوراً دوست بنا لیتے ہیں۔ کسی کو ان سے کوئی شکایت ہو تو فوراً اس کا ازالہ کر دیتے ہیں، دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر اُنھیں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ وہ انسان سے پیار کرنے والے شخص ہیں اس لیے اُن کے کلام میں معاشرے کے مسائل اور اس کی ناہمواریوں کا ذکر عام ملتا ہے۔ اُن کے نزدیک سبھی انسان ایک جیسے ہیں کسی امیر، غریب کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے وہ چھوٹے طبقے کی بڑے طبقے کے ہاتھوں استحصالی کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعے سخت احتجاج کرتے ہیں۔

عباس تابشؔ بڑے اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں اگر کسی سے ناراض بھی ہو جائیں تو برسوں اُس کو خبر نہیں ہونے دیتے۔ وہ لوگوں کی زیادتیاں خاموشی سے برداشت کر جاتے ہیں۔ عباس تابشؔ بڑے ملنسار آدمی ہیں، لوگ اُنھیں مل کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ خدّ وخال ہی سے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ عباس تابش کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلّق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

یہ شعر بالکل عباس تابش کی طبیعت کے عین مطابق ہے وہ دوستوں میں ہمیشہ

خوش رہتے ہیں اور سالوں اس تعلّق کی پاسداری کرتے ہیں۔ عباس تابش بڑے بااخلاق آدمی ہیں وہ دشمنی بھی بڑے طریقے سلیقے سے کرتے ہیں، درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

مری خندق میں اس کے قرب کی قندیل روشن ہے
مرے دشمن سے کہہ دینا میں اُس سے پیار کرتا ہوں

(تمہید)

عباس تابش اچھے اخلاق کے مالک ہیں، بقولِ محمد یونس بٹ:

''بڑا احساس آدمی ہے دوسروں سے اُس کو اکثر ہمدردی ہو جاتی ہے۔ وہ بے وقوفی کی حد تک مخلص ہے، یعنی ہر کسی کے ساتھ مخلص ہے۔ اِس سے پہلے کہ کوئی اُس کا برا کرے یہ اُس کا بھلا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی وہی کچھ کرتا ہے جو کر سکتا ہے آج کل ہر شخص دوسرے کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اِس کا تو پورا وجود آنکھ ہے جو مسلسل شب و روز بیداری کے باعث سوجتی جا رہی ہے''(۲۱)۔

عباس تابشؔ کی ساری وفاداریاں اپنی مٹی، اپنے ملک کے ساتھ ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ بڑے مزے سے رہ رہے ہیں، وطن کی محبت ایک فطری سی بات ہے جو ہر انسان میں ہوتی ہے۔ عباس تابش کو بھی ملک پاکستان سے بے حد لگاؤ ہے، اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:
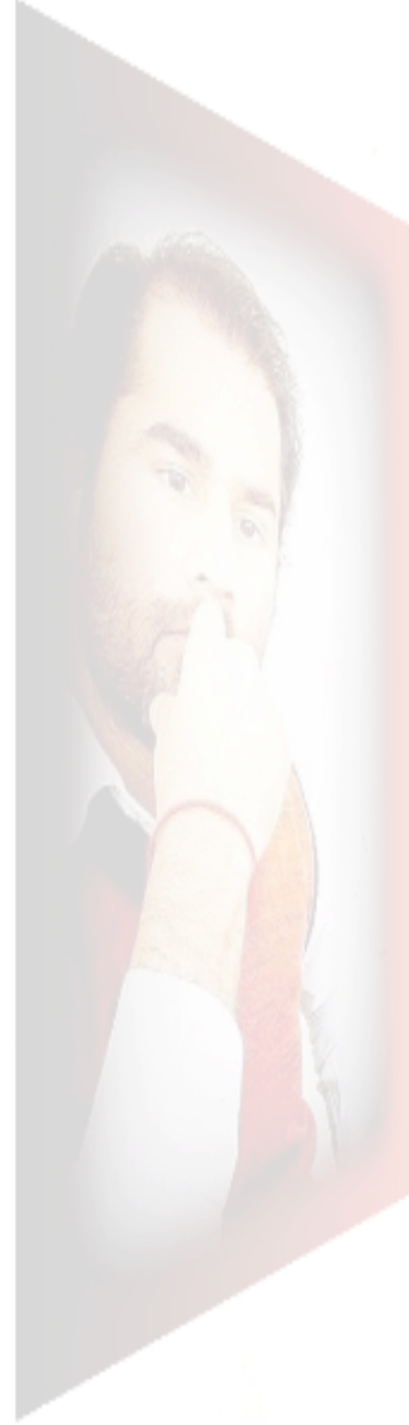
نہ اہل تخت نہ اُن کے مخالفین کے ساتھ
مری ہیں ساری وفاداریاں زمین کے ساتھ

اُداس شام ، تھکے سائے ، غالبِ خستہ
بڑے مزے میں ہوں اپنے معاصرین کے ساتھ
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش اپنے دوستوں اور معاصرین کے ساتھ بڑے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے ہیں، اُن کے درمیان رہ کر وہ بڑا لطف اندوز ہوتے ہیں کبھی اپنے دوستوں کو نظر انداز نہیں کرتے، اس بات کی عکاسی درج بالا شعر سے ہوتی ہے۔عباس تابش کے اخلاق کے بارے میں محمد اظہار الحق ''رقصِ درویش'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

''نفسانفسی اور افراتفری کا وہ دور ہے کہ شاعر کو پرندوں کی سلامتی کی فکر ہے۔ پرندے اس کے لیے معصومیت اور کمزوری کی علامت ہیں۔ معاشرہ بدقسمتی سے اس مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں معصوم اور کمزور ہونا خطرناک ہے۔عباس تابش سارے معصوموں اور کمزوروں کے لیے دعا کرتا ہے''(۲۲)۔

عباس تابش کا اس طرح کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ان کے بچوں کو خدا سانپ سے محفوظ رکھے
دن میں ہوتے ہیں پرندوں کے ٹھکانے خالی

عباس تابش ایک صاحبِ کردار اور با اخلاق آدمی ہیں، وہ اخلاقی حوالے سے اس قدر مضبوط ہیں کہ اُنھوں نے اپنے شعری سفر میں بھی کبھی کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لیا۔ کسی زمانے میں عباس تابش ''ادبی اُفق'' کے نام سے ہفت روزہ رسالہ نکالتے تھے، اس بات پر اُن کے مخالفین نے کہا کہ تم ''ادبی اُفق'' کو بیساکھی کے طور پر استعمال کر رہے ہو لیکن مخالفین کی اس بات کی وجہ سے اُنھوں نے ''ادبی اُفق'' کی اشاعت بند کر دی۔ عباس تابش کی شہرت اور اچھی شاعری کا کچھ لوگ حسد کرتے تھے جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک عباس تابش ایسے لوگوں سے دور رہے، اُنھوں نے کہا کہ مجھے اچھے دوستوں کی ضرورت ہے، میں دوست رکھنا چاہتا ہوں نہ کہ ''ادبی اُفق''، عباس تابش بڑے محبِّ وطن، ملنسار، خوش وضع، خوش طبیعت اور خوش اخلاق انسان ہیں، وہ ہر کسی کو فوراً دوست بنا لیتے ہیں۔عباس تابش ''دنیائے ادب'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''بڑی اچھی بات کی آپ نے بیساکھی سہارا ہوتی ہے اگر وہ اخبار (ادبی اُفق) میری بیساکھی ہوتا تو میں اُسے بند نہیں کرتا میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے لیے اُس کا پرچہ اُس کے منظر نامے کو دھندلا دیتا ہے۔''ادبی اُفق'' کے دوران مجھے بیسیوں خطوط ملتے تھے جب سے یہ بند ہوا ہے مجھے خط نہیں ملتے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے خط لکھنے والے میرے دوست یا خیر خواہ نہیں ہیں۔اُن کی ضرورت اخبار ہے جب کہ مجھے دوستوں کی ضرورت تھی۔جس دن یہ بات میری سمجھ میں آئی میں نے ''ادبی اُفق'' بند کر دیا''(۲۳)۔

ثروت مند طبقہ جو اپنے معاشرے کے غریب اور نچلے طبقے کے لوگوں سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ عباس تابشؔ اس طبقے کے لوگوں کو کتنے خوبصورت انداز میں نصیحت کرتے ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

دہکتے دن میں عجب لطف اٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایہ کرتا تھا

تلاشِ رزق میں بھٹکے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانہ کھلایا کرتا تھا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست، اچھے بیٹے، اچھے بھائی اور اچھے شوہر بھی ثابت ہوئے ہیں، یہ سب اُن کے والدین کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ عباس تابش کا تعلّق ایک نیک اور معزز گھرانے سے ہے یہاں اخلاقی قدریں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اُن کے والد بھی اچھے اور نیک انسان تھے جن کے عباس تابش کی شخصیت پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے آبا وَاجداد کو فالو کیا ہے۔ وہ کسی شخص کا حسد نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے بل بوتے پر کوئی مقام حاصل کرنے کے حق میں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عزت خدا کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے نواز دے۔ پوری دنیا میں اُن کے دوست احباب اور مداح موجود ہیں جو اکثر انھیں بلا کر سنتے ہیں، اُن کے ساتھ محفل کرتے ہیں، اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تابشؔ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق و خصائل کے مالک بھی ہیں۔ وہ انسان دوست آدمی ہیں۔ اُن کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ صحبتِ یاراں
میں جانتا ہوں کہ فرصت سے میں نہیں آیا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے کسی زمانے میں ''الرزاق پبلی کیشنز'' کے نام سے ایک پبلشنگ ہاؤس بھی بنا رکھا تھا۔ حسن عباسی بھی اس ادارے کے ساتھ کئی برس تک منسلک رہے، اس لیے وہ عباس تابش کی شخصیت کے بارے میں بہتر جانتے ہیں۔ بقولِ حسن عباسی:

> ''عباس تابش کے ساتھ دوستی اور رشتہ بیس برس پر محیط ہے۔ کئی برس تک اُن کے ادارے الرزاق پبلی کیشنز کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے میں اُنھیں بہت قریب سے جانتا ہوں، وہ ایک ملنسار، خوش اخلاق اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ عاجزی اور انکساری اُن کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں...... عباس تابش ایک صوفی منش اور درویش شخص کا نام ہے۔ تصوف سے اُن کو گہرا شغف ہے اور یہ اُن کی شخصیت اور مزاج کے عین مطابق ہے میں نے اُن کو ہمیشہ اپنے دوستوں اور حلقے کے لوگوں کے لیے فکرمند اور پریشان دیکھا ہے'' (۲۴)۔

عباس تابش سے کسی کو بھی شکایت نہیں ہوتی وہ اپنے سینئرز اور جونیئرز سب کا احترام کرتے ہیں۔ شاعروں میں یہ تاثر عام ہے کہ وہ اپنے جونیئرز کو راستہ نہیں دیتے، ان کے ساتھ نا انصافی کرتے ہیں جب کہ عباس تابش کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے

معاصرین میں خوش رہتے ہیں اور اُن کے اشعار دوستوں کو سناتے رہتے ہیں ۔ وہ اپنے سب احباب کا بڑے اچھے لفظوں میں ذکر کرتے ہیں۔اس کیفیت کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

مرے بعد آنے والوں سے کہو وہ حوصلہ رکھیں
میں خود کو کاٹ کر ان کے لیے رستے بناتا ہوں
(رقصِ درویش)

عباس تابش جونیئرز کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلتے ہیں، اُن کی حتی الامکان رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور سینئرز کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔اس بارے میں عباس تابش ''دنیائے ادب'' میں کہتے ہیں:

''پہلی مرتبہ میں مشاعرہ پڑھنے امریکہ ۱۹۹۷ء میں گیا تھا تاہم دوسری مرتبہ ۱۹۹۸ء میں امریکہ گیا تو میرے ہمراہ خالد احمد اور نجیب احمد تھے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد لاہور کے چند سینئرز نے وہاں ایسی فضا بنائی کہ کوئی نہیں جا سکا تاہم میں اپنی کوششوں میں مصروف رہا۔ میں نے قمر رضا شہزاد کے لیے کوشش کی انہیں ویزہ نہیں ملا۔ سید مبارک شاہ کو اسپانسر لیٹر دلایا انہیں بھی ویزہ نہیں ملا۔ اسی طرح احمد عقیل روبی کے لیے کوشش کی انہیں بھی ویزہ نہیں ملا۔ اُس کے بعد 9/11 کا سانحہ پیش آ گیا اور امریکیوں کی ویزہ پالیسی میں مزید سختی آ گئی جس سے سب ہی نقصان سے دوچار ہیں لیکن میں یہاں یہ بات بھی بیان کرتا چلوں کہ میں جب بھی باہر جاتا ہوں

میرے ہمراہ میرے دوست اور بہت اچھے شعرا ہوتے ہیں۔ میں ان کے اشعار وہاں سناتا ہوں اس طرح سب کا تعارف وہاں ہے''(۲۵)۔

عباس تابش کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ عباس تابش جہاں اچھے غزل گو ہیں وہاں اچھی شخصیت کے مالک بھی ہیں۔تمام احباب اُن کے معترف ہیں، اُن کے اچھے اخلاق کی وجہ سے اُن کو ادبی حلقوں میں بکثرت یاد کیا جاتا ہے۔عباس تابش بڑے مہمان نواز ہیں، اُن کے ہاں اکثر دوستوں کی آمد و رفت کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ وہ سب کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتے ہیں۔

حواشی

(۱) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۶

(۲) عباس تابش،انٹرویو،راقم،لاہور،۶ جولائی ۲۰۱۳ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ الف
،ص۳۵۷)

(۳) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۶

(۴) خالد احمد،دیباچہ،تمہید،لاہور،الرزاق پبلی کیشنز،اشاعتِ دوم۱۹۹۹ء،ص۱۳

(۵) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب کراچی اپریل۲۰۰۴ص۴۶،۴۷

(۶) عباس تابش،انٹرویو،راقم،لاہور،۶ جولائی ۲۰۱۳ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ الف،ص
۳۵۸)

(۷)عباس تابش،انٹرویو،راقم،لاہور،۶ جولائی ۲۰۱۳ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ الف،
ص۳۵۸)

(۸)عباس تابش،انٹرویو،راقم،لاہور،۶ جولائی ۲۰۱۳ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ الف،ص۳۵۸)

(۹) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۷

(۱۰) خالد احمد،دیباچہ،تمہید،لاہور،الرزاق پبلی کیشنز،اشاعتِ دوم۱۹۹۹ء،ص۱۲

(۱۱) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۸

(۱۲) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۷

(۱۳) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۷

(۱۴) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ص۴۷،۴۸

(۱۵) شکیل جاذب،دیباچہ،عشق آباد(کلیات)،لاہور،العصر پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء،ص۲۳

(۱۶) اصغر ندیم،سید،دیباچہ،سلسلہ دلداری کا(عباس تابش)،انتخاب،شکیل جاذب،
لاہور،الحمد پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء،ص۱۵

(۱۷) حسن عباسی،انٹرویو،راقم،لاہور،۱۵مارچ ۲۰۱۴ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ ب،ص۳۶۲)

(۱۸) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۷

(۱۹) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۷

(۲۰)عباس تابش،انٹرویو،راقم،لاہور،۶ جولائی ۲۰۱۳ء(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ الف،ص
۳۵۹)

(۲۱) محمد یونس بٹ،دیباچہ،تمہید،لاہور،الرزاق پبلی کیشنز،۱۹۹۹ء،ص۱۹

(۲۲) محمد اظہار الحق،دیباچہ،رقصِ درویش،لاہور،العصر پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء،ص۱۷

(۲۳) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۹

(۲۴) حسن عباسی،انٹرویو،راقم،لاہور،۱۵مارچ ۲۰۱۴(ملاحظہ کیجیے ضمیمہ ب،ص۳۶۱،
۳۶۲)

(۲۵) عباس تابش،انٹرویو،ماہنامہ،دنیائے ادب،کراچی،اپریل۲۰۰۴ء،ص۴۹

☆☆☆☆☆

باب دوم

عباس تابش بطور غزل گو

(الف) اُردو غزل کی روایت ______ جدید اُردو غزل تک

(ب) جدید اُردو غزل کی روایت اور عباس تابش

(ج) عباس تابش کی اُردو غزل کا فنی واسلوبیاتی جائزہ

(د) عباس تابش کی اُردو غزل کا فکری وموضوعاتی جائزہ

(س) معاصر اُردو غزل میں عباس تابش کا مقام ومرتبہ

باب دوم

عباس تابش بطور غزل گو

(الف) اُردو غزل کی روایت ______ جدید اُردو غزل تک

جدید اُردو غزل کی روایت جو مولانا الطاف حسین حالؔی سے شروع ہو کر عباس تابشؔ تک آتی ہے، اِس کا ذکر کرنے سے پہلے میں اُردو غزل کے پسِ منظر میں جانا چاہتا ہوں کہ حالؔی سے پہلے غزل کی روایت کیسی تھی اور غالبؔ و حالؔی نے غزل کو کیسے جدّت عطا کی۔

غزل عربی زبان کا لفظ ہے (یہ ایک مصدر ہے) جس کا معنی ہے ''رسی کا تنا'' غزل ہی سے لفظ مغزل اخذ کیا گیا ہے، جس کا مفہوم چرخہ یا تکلا ہے فرہنگِ عامرہ میں لفظ ''غزل'' کی تعریف کچھ یوں ملتی ہے:

> ''عاشقانہ اشعار کی ایک قسم، عورتوں کے ساتھ گفتگو اور عشق، ڈورا، سوت، رسی، غزل گو، عورتوں سے باتیں اور عشق کرنے والا'' (۱)۔

غزل کے معنی لغت میں عشق بازی کرنے اور عورتوں سے مخاطب ہونے کے

ہیں، عربی میں کہتے ہیں ”زید اغزل من عمرو“ یعنی زید عشق کے مضامین عمرو سے بہتر باندھتا ہے یا زید عمرو سے زیادہ عشق باز ہے۔

عربی اور فارسی کے سارے لغات اِس مطلب سے اتفاق کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غزل کو محبُوب کی بے وفائی و شکوہ، شکایت کہا گیا ہے۔ زخمی ہرن کے منہ سے نکلنے والی دردناک چیخ کو بھی غزل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب شکاری کتے ہرن کے پیچھے بھاگتے ہیں، تو بھاگتے ہوئے ہرن جھاڑیوں میں پھنس جاتے ہیں یا شکاری کے تیر سے گھائل ہو جاتے ہیں تو اس وقت جو کرب انگیز آواز نکالتے ہیں اُسے ”غزل“ کہتے ہیں۔ غزل اچھی شاعری کی علامت ہے اور اصنافِ شاعری میں مقبول ترین اور کامیاب قرار دی جاتی ہے۔

جدید دور میں اُردو غزل میں متعدد موضوعات کو سمو دیا گیا ہے۔ غزل میں اِس کے مختصر ترین اشعار اپنا مکمل مفہُوم رکھتے ہیں۔ غزل کے بارے میں رشید احمد صدیقی اپنی کتاب ”جدید غزل“ میں لکھتے ہیں:

> ”غزل مختصر افسانوں کا مجموعہ ہوتی ہے جس میں شعر مختصر ترین اور ساتھ ہی مکمل افسانہ ہوتا ہے“(۲)۔

ڈاکٹر انور صابر، غزل کے بارے میں اپنی کتاب ”پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقا“ میں لکھتے ہیں:

> ”لغوی اعتبار سے غزل کو حسن و عشق کی واردات و کیفیات اور معاملات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن عملاً شعرا نے غزل میں حیاتِ انسانی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ آج غزل، محض غزل ہونے

> کے علاوہ ایک نقطۂ نظر، ایک اندازِ فکر، ایک اصولِ تلخیص اور ایک سلیقۂ اظہار کی نمائندہ صنف ہے۔ داخلی جذبات و احساسات کے اظہار کے ساتھ ساتھ خارجی واقعات و حالات کو بھی غزل نے داخلی کیفیات میں جذب کر کے بیان کیا ہے“(۳)۔

اِس طرح فراق گورکھپوری کے خیال میں موضوعِ غزل کے تین حصّے ہیں:
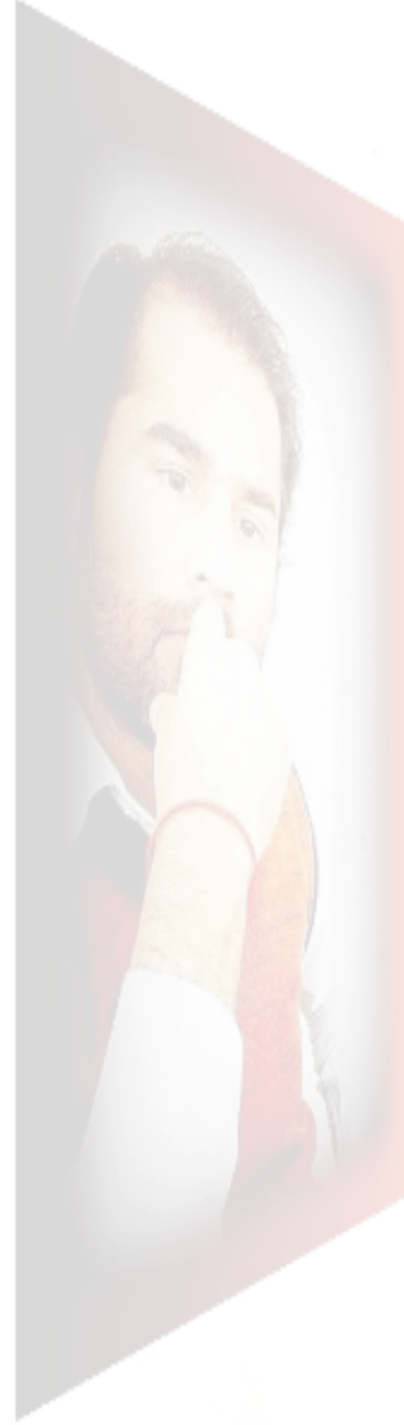
> ”(الف) معرفت و تصوف
>
> (ب) حیات و کائنات اور اخلاقیات پر انفعالی یا فلسفیانہ طور پر حکم لگانا
>
> (ج) عشقِ مجازی
>
> لیکن اِن تین حصوں کے درمیان کوئی حد بندی قائم نہیں ہو سکی کیوں کہ موضوعات کا پیوند ایک دوسرے سے بڑا گہرا ہوتا ہے اور غزل کی زبان اور تغزل کا انداز اِن میں ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے“(۴)۔

مولانا الطاف حسین حالی اپنی کتاب ”مقدمہ شعر و شاعری“ میں غزل کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں:

> ”غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کہ کوئی خاص مضمون مسلسل

بیان نہیں کیا جاتا......اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگر چہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل میں پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی۔ مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کرلیا ہے''(۵)۔

غزل ابتدا میں عشقیہ مضامین کے لیے مخصوص تھی مگر بعد میں شعرا نے اسے تمام مضامین کے لیے وسیع کر دیا۔غزل شاعری کی وہ صنف ہے جس میں ہر شعر الگ حیثیت اور مکمل مضمون و مفہوم رکھتا ہے۔

غزل عربی میں با قاعدہ نہیں تھی بلکہ تشبیب تھی۔ایران میں غزل کی ابتدا ہوئی۔فارسی غزل کو سعدی نے مقبولیت بخشی۔ ہندوستان میں غزل بہت بعد میں وارد ہوئی اور اُردو غزل کا قدیم تاریخی دور امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے۔ولی کو اُردو غزل کا باوا آدم قرار دیا گیا ہے اگر چہ اِس سے پہلے بھی کئی شعرا نے غزل گوئی کی۔ ولی نے غزل کو معتبر مقام دیا اور ولی اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔غزل کی ابتدا و آغاز کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب ''شعر العجم''میں لکھتے ہیں:

''ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدے سے ہوئی اور ابتدا

میں غزل جوش طبع سے نہیں بلکہ یہ اقسام شاعری کو پورا کرنے کی غرض سے وجود میں آئی۔قصیدے کی ابتدا میں عشقیہ اشعار کہنے کا دستور تھا۔ اِس حصّے کو الگ کرلیا تو غزل بن گئی''(۶)۔

غزل کی ابتدا ایران سے ہوئی پہلے پہل غزل فارسی میں کہی گئی اور اِس کو قبولِ عام سعدؔی نے بخشا۔ ہندوستان میں غزل ایران سے آئی۔ اِس دور میں سعدی، جامی، خسرو،نظیری، صائب اور بیدل ممتاز غزل گو سمجھے جاتے تھے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اِس بات کو اپنی کتاب ''غزل اور متغزلین'' کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

'' اردو غزل کا تاریخی دور امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے''(۷)۔

امیر خسرو نے اُردو غزل میں فارسی کا استعمال کیا۔کچھ نقاد امیر خسرو کو پہلا شاعر قرار دیتے ہیں جب کہ کچھ کہتے ہیں کہ اُردو غزل کی با قاعدہ روایت ولی دکنی سے مقبول ہوئی۔امیر خسرو نے شمالی ہند میں اُردو شاعری میں غزل کی صنف کو بہت فروغ دیا۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنی کتاب ''تجربے اور روایت'' میں یوں رقمطراز ہیں:

''غزل کی یہ روایت جسے ہم شمالی ہند میں اُردو شاعری کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ یہ غزل صحیح معنوں میں ریختہ کا پہلا نمونہ ہے اور ریختہ کی یہ اصطلاح بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے''(۸)۔

اگر چہ اُردو ادب کی ابتدا دکن سے ہوئی لیکن اِس کے اثرات شمالی ہند کے شعرو ادب پر بہت کم پڑے۔ شروع شروع میں دکن میں مثنویاں لکھی جاتی تھیں، غزل کا رواج نہیں تھا۔ غزل کے مقابلے میں یہاں مثنوی کو زیادہ اہمیّت حاصل تھی۔ دکن میں اُردو غزل کی با قاعدہ روایت ولی دکنی نے ڈالی۔ اُنھوں نے غزل کو معتبر مقام عطا کیا۔ ولی جب دلّی آئے تو ان کی پیروی کی گئی، اِس لیے ولی دکنی کو اُردو غزل کا باوا آدم قرار دیا گیا ہے۔ اگر چہ اِس سے پہلے بھی متعدد شعرا نے غزل میں طبع آزمائی کی لیکن ولی نے پہلی مرتبہ غزل کو بلند مقام عطا کیا اور اُردو غزل احساسِ کمتری سے نکل آئی۔

ولی کے زیرِ سایہ غزل دکن میں مضبوط بنیادوں پر رواج پائی اور شمالی ہند نے بھی ولی کے اثرات لیے۔ جب دکن اور شمالی ہند میں یکساں ولی کی غزل کی پیروی کی جانے لگی تو ولی غزل گو شعرا میں اوّلین شاعر قرار پائے۔ اُردو غزل کی با قاعدہ روایت ولی دکنی سے مقبول ہوئی۔ دکنی دور کی اُردو غزل پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اُردو غزل فارسی غزل کا ترجمہ ہے۔ اِس دور میں ہندی کے اثرات بھی اُردو غزل پر پڑے۔ اِس دور کی غزل ایک دوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔ فارسی کی گہری چھاپ ہے اور ہندی گیتوں کا عام لہجہ بھی غزل نے قبول کیا ہے۔ ولی جمال پرست شاعر ہے ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب ''اُردو شاعری کا مزاج'' میں ولی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ولی کی حیثیت ایک مشعل بردار کی سی ہے کہ وہ دکن کی خاک سے اُردو غزل کی مشعل اُٹھائے دہلی تک آیا چنانچہ ولی کے بعد اُردو غزل کی نشوونما کا مرکز دکن سے دہلی منتقل ہوگیا'' (۹)۔

دکنی دور میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، شاہی، میراں ہاشمی اور نصرتی وغیرہ شامل تھے۔ اُردو غزل کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب دکنی غزل کا ہے۔ دوسرا باب اٹھارویں صدی کی ابتدا سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کا ہے بلکہ ۱۸۵۷ء اِس کی حد ہے۔ تیسرا باب ۱۸۵۷ء سے لے کر اقبالؔ تک ہے۔ چوتھا اور آخری باب اقبالؔ سے لے کر جدید دور تک ہے۔ دکنی دور کی غزل کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

اے خوش خبر صبا تُوں لے جا جواں قداں کوں
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں
(محمد قلی قطب شاہ)

تو پیاری ، عشق بھی تیرا ہے پیارا
بہوت لکیا ہے تج سوں دل ہمارا
(عبداللہ قطب شاہ)

زمانے آج کی مجنوں ہو پیدا
ہُوا مشہور غواصیؔ دکن میں
(غواصی)

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہُوا دل کا ہرن لگیا نشان تج ہات کا
(شاہی)

رضا گر مج کو دیتے ہو کروں گی گھر میں جا دارو
اگر مج ہووے گی فرصت صبح پھر آ ؤں گی چھوڑو
(میراں ہاشمی)
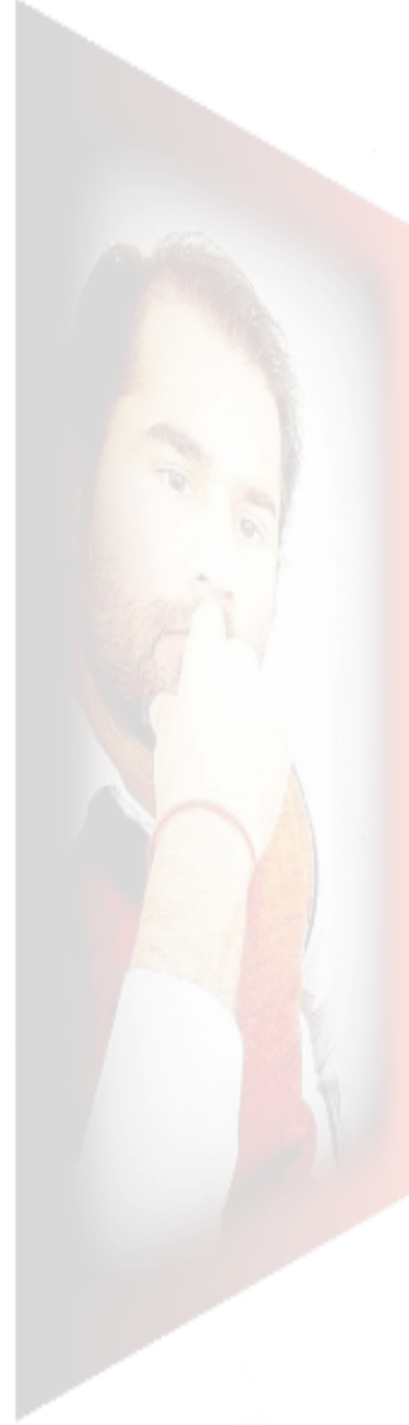
چندر مکھی کہیا تو کہی مُوں سنبھال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول
(نصرتی)

تجھ رخ سوں جب کنارے صبح نقاب ہووے
عالم تمام روشن جیویں آفتاب ہووے
(ولی دکنی)

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستم گر ہے
(شاہ حاتم)

دوسرے دور کی غزل ۱۷۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک دو رنگوں میں ملتی ہے۔ اِس میں بت پرستی، سراپا نگاری اور بدن کی پرستش ہے۔ دہلی کی غزل میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے اور لکھنؤ کی غزل میں خارجیت کا رجحان کافی توانا ہے۔ لکھنؤ میں رسوم، عقائد، مادہ پرستی، زبان دانی اور محفلوں کے آداب غزل میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اُردو غزل کے اِس دور میں تصوف اور صوفیانہ تصورات فارسی کی تقلید میں آئے تھے۔ حاتمؔ، دردؔ، اور آتشؔ کی غزلوں میں صوفیانہ رنگ ملتا ہے۔ دردؔ ایک صوفی شاعر قرار پائے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
(میر دردؔ)

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا
(آتش)

کہا میں نے کتنا ہے گُل کو ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
(میر تقی میرؔ)

جب خیال آتا ہے اِس دل میں ترے اطوار کا
سر نظر آتا نہیں دھڑ پر مجھے دو چار کا
(سوداؔ)

اِس دور کی غزل میں صوفیانہ رنگ کثرت سے ملتے ہیں۔ تقریباً تمام شعرا نے صوفیانہ رنگ اپنایا، میر تقی میر نے بھی صوفیانہ تصورات پیش کیے ہیں۔ لکھنؤ کی غزل میں سراپا نگاری کی روش عام ہے اِس میں تصوّف کے تصورات کم ہیں تاہم مصحفی اور آتش اِس زمرے میں نہیں آتے۔ مصحفی، آتش کے استاد تھے، مصحفی کی نسبت آتش کے ہاں تصوّف کے نظریات زیادہ ملتے ہیں۔ آتش کے ہاں دہلی کی داخلیت اور لکھنؤ کی خارجیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اِس دور کے آخری شاعر غالبؔ کے ہاں بھی تصوّف کا رنگ کثرت سے ملتا ہے:

یہ مسائلِ تصوّف ، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا
(غالبؔ)

ایہام گوئی کی وجہ سے دکنی دور کی غزل بھی کوئی واضح معیار برقرار نہ رکھ سکی۔ ایہام گوئی کی تحریک لفظی بازی گری کی تحریک تھی، اِس میں الفاظ کو زیادہ اہمیّت دی گئی۔ اِس تحریک میں شیخ ظہورالدین قائم سب سے نمایاں شاعر تھے لیکن یہ تحریک جلد ختم ہو گئی۔ اِس کے خلاف مظہرِ جانِ جاناں نے ردِّعمل ظاہر کیا۔ ایہام گوئی کے فوراً بعد میرؔ و سوداؔ کا دور شروع ہوا۔ اِس دور کو اُردو غزل کا عہدِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ یہ غزل کا پہلا معیاری دور کہلاتا ہے۔ دردؔ بھی اِس دور کے اچھے شاعر تھے۔ میر و سودا نے اُردو غزل کو عروج بخشا، میر کے ہاں ناکامی کا احساس اُن کے سماجی پس منظر کی وجہ سے ہے۔ اُن کے کلام میں سوز و گداز ہے۔ سوداؔ کا کلام میرؔ کے کلام سے مختلف ہے کیوں کہ اُنھوں نے فارسی کا اثر قبول کیا، وہ شگفتہ اور زندہ دل شاعر تھے۔ اِس لیے میرؔ کا کلام آہ اور سوداؔ کا کلام واہ کہلایا۔

خواجہ میر دردؔ بھی اِس دور کے نمایاں اور اہم شاعر تھے، اُن کا کلام تصوف کے مضامین سے مالامال ہے۔ اِس کے بعد ۱۸۰۳ء میں غزل گو شاعروں کا آغاز ہوا۔ اِس دور میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اپنے عہد کے مقبول شاعر رہے۔ شیفتہ بھی اِسی عہد کا شاعر تھا مگر سب سے زیادہ اہم شاعر غالبؔ تھے۔ اِس لیے اس دور کو غالب و مومن کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کی غزل کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

یہ ہم جو ہجر میں ، دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو ، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
(غالبؔ)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومنؔ)

ہم رونے پہ آ جائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
(ذوقؔ)

شاید اِسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
(شیفتہؔ)

ولیؔ سے غالبؔ تک کا زمانہ اُردو غزل کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں غزل مقبول صنفِ سخن بن گئی۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

> ''ولی سے غالب تک کا دور اُردو غزل کے فروغ کا زمانہ ہے۔ اِس دور میں اُردو غزل دوسری اصناف (یعنی گیت اور نظم) کے تسلّط سے آزاد ہے گیت سے اِس دور کے شعرا نے شعوری طور پر انحراف کیا جب کہ نظم سے متصادم ہونے کی انھیں ضرورت ہی پیش نہ آئی، چنانچہ اِس سارے عرصے میں غزل ہی اُردو کی اہم ترین صنف ہے''(۱۰)۔

اُردو غزل کی روایت چوں کہ فارسی غزل سے وجود میں آئی، اِس لیے تلمیحات،

استعارات اور تراکیب بھی وہیں سے لی گئیں۔ پھر انیسویں صدی میں ہندوستان کی فضا میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ غالب بھی غزل میں وسعت کے خواہاں تھے، چنانچہ غدر کے بعد حالؔی نے ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھی اور غزل کے موضوعات بدلنے اور ان میں وسعت پیدا کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ غزل پر کافی عرصے سے ایک جمود سا طاری تھا۔ حالؔی نے اِس انجماد کو توڑنے کی کوششیں کیں۔ اُردو غزل نے ڈیڑھ سو برس تک ایک خاص قسم کی تلمیحات، استعارات اور علامات سے اظہارِ خیال کا کام لیا تھا اور اب زمانے کی ایک ہی کروٹ نے انھیں فرسودہ اور فضول قرار دے دیا تھا۔ اِس دور میں حالؔی نے غزل کی اصلاح کرنا شروع کر دی۔ غزل کو کسی حد تک نئے پیکر میں ڈھالا۔ غزل کا اصل حسن تو تحریکِ اصلاح سے متاثر ہوا مگر اِس سے اُردو غزل میں مضامین کی وسعت پیدا ہوگئی، زندگی کے تمام مسائل، معاشرتی رسوم و رواج اور دیگر پہلوؤں کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔

(ب) جدید اُردو غزل کی روایت اور عباس تابش

غزل کے جدید دور کا باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا اور اُردو غزل میں داخلی احساسات و جذبات سمونے کے ساتھ ساتھ دیگر خارجی پہلوؤں کو بھی پیش کیا گیا۔ الطاف حسین حالؔی نے غزل میں وسعتیں پیدا کیں اور غزل کے اسلوب کو بدل دیا۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے مضامین اور مواد کو شامل کر دیا۔ زندگی کے مسائل، روزمرّہ کی باتیں غزل کے دائرہ کار میں آ گئیں۔ جدید دور کو فروغ دینے میں اکبرالہ آبادی کا کردار بھی قابلِ ستائش ہے۔ اُنھوں نے جدید غزل کے دامن کو وسعت عطا کی۔ حالؔی کی جدید غزل کی روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور صابر اپنی کتاب ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا الطاف حسین حالی کی غزلیہ شاعری کا آغاز تو غالب کی شاگردی اور شیفتہ کی صحبت میں بہت پہلے ہو چکا تھا لیکن سرسیّد کی اصلاحی تحریک کے زیرِ اثر انھوں نے مسدّس لکھی۔ غزل گوئی کی نئی روایت کو جنم دیا پھر ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر جدید شاعری کو تنقیدی شعور کی مضبوط اساس فراہم کی''(۱۱)۔

الطاف حسین حالؔی غزل کے ایک معتبر شاعر تھے، وہ غالب کے شاگرد تھے اور اُنھوں نے غزل کی روایت میں نیا آہنگ رائج کیا۔ حالؔی کو جدید غزل کا بانی قرار دیا جاسکتا

ہے۔اُس دور میں اکبرالہ آبادی نے بھی جدید رنگ میں غزلیں کہیں اور نئی روایت قائم کرنے میں حالؔی کے اچھے معاصر ثابت ہوئے لیکن غزل کی اِس صحت مند وتوانا روایت کے سرخیل مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔ اِس اجتہاد میں اوّلیت کا سہرا بلاشبہ حالؔی ہی کے سر ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا اِس اجتہاد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''حالی نے اس کے ذریعے غزل کے صرف خاص رنگ (ابتذال، تقلید، تتبع) کو بدلنے کی کوشش کی تھی، جس نے غزل کو میکانکی صورت دے رکھی تھی۔غزل کے مزاج میں کوئی تبدیلی حالؔی کا مقصد ہرگز نہ تھا'' (۱۲)۔

حالؔی غزل کی مقبولیت کے بڑے خواہاں تھے، وہ سمجھتے تھے کہ غزل ہی زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی ترجمانی کرسکتی ہے۔حالؔی کی غزلوں میں جذبات کی شائستگی، لہجہ کی نرمی، خیال کی بلندی، پاکیزگی، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا، حالؔی کے دور کو غزل کے گومگو کا دور قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''غزل کے اُفق کو وسیع کرنے اور نئے موضوعات کو غزل میں داخل کرنے کی یہ کاوش تو اِس لحاظ سے قابلِ تعریف ضرور تھی کہ اِس نے غزل کے جدید آہنگ کے لیے راہ ہموار کی لیکن خود حالؔی اِس نئی تبدیلی کو رائج کرتے وقت غزل کے اصل مزاج کو ملحوظ نہ رکھ سکا۔چنانچہ اُس کی اِس قسم کی غزلیں، غزل کی باس سے بیگانہ اور اِس کے مخصوص تاثر سے عاری ہیں...... اِس گومگو کی صورت حال

> نے جہاں غزل کو نقصان پہنچایا وہاں غزل کے مستقبل کو روشن کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔اس طور غزل میں نہ صرف نئی ارضی تبدیلیوں کا شعور پیدا ہوا بلکہ نئی صورت حال میں کبھی تو نئی علامتیں وضع کرنے اور کبھی پرانی علامات کو نئے مفہوم میں استعمال کرنے کا رجحان بھی اُبھر آیا'' (۱۳)۔

حالؔی کی غزل کا رنگ ملاحظہ کیجیے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ غالب جدید اُردو غزل کے پہلے علمبردار تھے۔ اُنھوں نے حالؔی سے پہلے ہی جدید لہجے کی بنیاد رکھ دی تھی، جس کو بعد میں حالی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔غالب، حالی کے استاد تھے۔اس لیے اکثر ناقدین خیال کرتے ہیں کہ حالی سے پہلے غالب نے جدید آہنگ اختیار کیا مگر باقاعدہ جدید اُردو غزل کی روایت حالی ہی سے ملتی ہے۔غالب دلّی دبستان کے آخری شاعر تھے۔اُن کی شاعری میں ہمہ گیریت ہے۔اُن سے پہلے غزل جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔غالب نے غزل کو فکر آشنا کیا اور جدید رنگِ تغزل بخشا۔

حالی جدید غزل گوؤں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔اُن کا نام جدید غزل کے اوّلین

معماروں میں خاص طور پر نمایاں ہے مگر نظیر صدیقی غالب کو جدید اُردو غزل کا پہلا علمبر دار مانتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''جدید اُردو غزل ______ ایک مطالعہ'' میں رقمطراز ہیں:

''غزل میں جدیدیت زبان، لہجہ، موضوع، اندازِ فکر، طرزِ احساس اور زندگی کی طرف روایتی رویّے میں تبدیلی سے عبارت ہے۔ اور یہ تبدیلی جس قدر واضح شکل میں غالب کے ہاں نظر آتی ہے اتنی اِن سے پہلے کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی ۔اس لحاظ سے جدید غزل کی ابتد غالب سے ہوتی ہے گویا غالب جدیدیت کے سب سے پہلے علمبر دار ہیں'' (۱۴)۔

غالبؔ نے غزل میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا بعد میں اُن کی روایت کو حالیؔ نے گہرا کرنے کی اس قدر کوشش کی کہ حالیؔ کو جدید اُردو غزل کا بانی اور سر خیل قرار دے دیا گیا۔ غالب کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیاں کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مولانا الطاف حسین حالی نے اُردو غزل میں جو روایت نکالی تھی اُسے اقبالؔ نے اپنے حکیمانہ اندازِ تکلم سے فروغ دیا۔ اقبال کی شاعری پر سب سے زیادہ اثر مرزا غالب کا

ہے۔ اقبال جدید اُردو غزل میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئے، استاد و شاگرد (غالب و حالی) کی نئی روایت کو آگے لے کر چلے۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

'' اقبال کی حیثیت ایک سنگِ میل کی سی ہے وہ یوں کہ اقبال کی آمد سے اُردو غزل کے جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال سے قبل حالیؔ نے غزل کے اُفق کو کشادہ کرنے کی جس تحریک کی ابتدا کی تھی اُسے اقبالؔ نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا'' (۱۵)۔

حالی و غالب کی جدت بیسویں صدی میں اقبال کی صورت میں سامنے آ گئی۔ اقبال نے جدید اُردو غزل کو فروغ دیا۔ اقبال نے موضوعات، لہجے اور اسلوب کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور روایتی مضامین و اندازِ سخن کو مکمل طور پر ترک کر دیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو ترقی پسند شعرا نے اقبال پر سخت تنقید کی۔ اُنھوں نے اقبال کو غزل گو شاعر ماننے سے انکار کر دیا۔ اِس بات کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو شاعری کا مزاج'' میں یوں کرتے ہیں:

'' بہت سے ترقی پسند شعرا نے اپنے اپنے وقت میں اقبال کو خاص طور تنقید کا ہدف بنایا کہ اُس کا نظامِ فکر ترقی پسند شعرا کے لیے قابلِ قبول نہیں مگر جہاں تک غزل میں موضوع کی کشادگی، تخاطب کے انداز اور پرانی تلمیحات کو نئے مفہوم میں استعمال کرنے کا تعلّق ہے۔ ان شعرا نے اقبال ہی کی پیروی کی ہے اور جدید اُردو غزل میں سیاسی اور سماجی بیداری کا آغاز اقبال ہی کے دکھائے

ہوئے راستے سے ہوا''(۱۶)۔

اقبال کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

جدید اُردو غزل میں حسرت موہانی کو بڑی اہمیّت حاصل ہے۔ وہ اس قافلہ کے سالار تھے جنھوں نے غزل کی ساکھ دوبارہ بحال کی اور غزل میں نئی شعوری روایت قائم کی۔ اُنھوں نے غزل کو نئی تہذیب سے روشناس کروایا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جن شعرا نے غزل کو زندہ رکھا اُن میں حسرتؔ کا نام نمایاں ہے۔ وہ قدیم و جدیدیت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے رسمِ عاشقی کو بھی تہذیب کا مقام بخشا، حسرت کی انفرادیت کے بارے میں وزیر آغا، داغؔ اور حسرتؔ کی غزل کا فرق بیان کرتے ہیں:

''دونوں کے اکثر اشعار محبُوب کے سراپا کے بیان یا اُس سے باتیں کرنے کے عمل سے متعلّق ہیں۔ ایک بڑا فرق البتہ ضرور ہے کہ داغؔ کے ہاں محبُوب واضح طور سے طوائف ہے۔ اِس لیے داغؔ کی محبت میں چھچل، فقرہ بازی، لگاوٹ، اور وار کرنے اور وار سہنے کا انداز نمایاں ہے جب کہ حسرت کے ہاں محبُوب وہ عورت ہے جو انگریزی تہذیب کے نفوذ، تعلیم اور آزادیِ نسواں کی تحریک کے تحت اُبھر رہی تھی''(۱۷)۔

حسرت نہ صرف قدیم دور کی یادگار ہیں بلکہ جدید اُردو غزل کے موجد بھی قرار

دیے جا سکتے ہیں۔ حسرتؔ کے نئے رنگ و آہنگ کے متعلّق یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
(حسرت)

مولانا الطاف حسین حالؔی کی طرح فراقؔ نے بھی غزل اور تنقید دونوں میں اہم مرتبہ حاصل کیا۔ انیسویں صدی میں حالؔی نے جس جدید غزل کا بیڑا اُٹھایا تھا فراق اس بیڑے کو پار لگانے کے لیے بیسویں صدی میں داخل ہو گئے۔ بیسویں صدی کی جدّت میں فراق نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ حسرت کے بعد فراق گورکھپوری کے مقام و مرتبے کا تعیّن کرتے ہوئے ڈاکٹر انور صابر لکھتے ہیں:

''حسرتؔ موہانی کے بعد فکری اعتبار سے جس شاعر نے غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، وہ فراق گورکھپوری ہیں۔ فراق بنیادی طور پر عشق مجازی کے شاعر ہیں مگر اُنھوں نے حسن و عشق کی واردات و کیفیات کا نزاکت احساس اور عمیق نظری سے احاطہ کیا ہے''(۱۸)۔

فراق کی غزل میں مسائل و حقائق اور جذبات کے پہلو ملتے ہیں:

چمکتے درد، کھِلے چہرے، مسکراتے اشک
سجائی جائے گی اب طرزِ نو سے بزمِ حیات
(فراقؔ)

میر درد کی طرز پر اصغر گونڈوی نے تصوّف کے مضامین اُردو غزل میں منفرد انداز میں پیش کیے۔ اصغر گونڈوی کا شمار حسرتؔ اور فراقؔ کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ ان کی غزل میں روایتی انداز نہیں بلکہ اُنھوں نے رومانی تجربات سے گزر کر غزل کی فکر کو کشادگی عطا کی۔ اصغر نے قدیم انداز اختیار کرتے ہوئے اس کو منفرد لہجہ بخشا جو قدیم و جدید شعرا کے ہاں کم ملتا ہے۔ اصغر گونڈوی کے اسلوب پر نظیر صدیقی کی رائے کچھ یوں ہے:

''تصوّف میں تازگی اور شادابی پیدا کرنے کے علاوہ اصغر کے ہاں دو خصوصیات اور بھی ہیں جن کی بنا پر ان کی غزلیں جدید معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو زندگی کی طرف رجائیہ اور نشاطیہ انداز اور دوسرے ان کا انداز بیان جو یقیناً غزل کے اسالیب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی پختگی اور دل کشی میں شروع سے آخر تک ہمواری پائی جاتی ہے'' (۱۹)۔

اصغر گونڈوی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
(اصغر گونڈوی)

جگر مرادآبادی، حسرتؔ، اصغر اور فانی کے دور کے غزل گو شاعر تھے۔ اُن کا رنگِ تغزل جاندار ہے۔ اُن کی غزلوں میں رندی و بادہ نوشی اور حسن و عشق کے مضامین ملتے ہیں:

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسباب ماتم ہوتی جاتی ہے
(جگر مرادآبادی)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جدید اُردو غزل

ترقی پسند تحریک ایک واضح سماجی منشور کے ساتھ عمل میں آئی۔ اِس تحریک نے ادب و شاعری کو حالتِ انسان سے جوڑنے کا کام کیا۔ اقبال کے بعد غزل کے موضوعات میں وسعت ترقی پسند تصورات کے زیر اثر آئی۔ اِسی تحریک نے معاشرتی و معاشی فکر کو اردو شاعری میں رائج کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ڈاکٹر انور صابر اپنی کتاب ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بعض ادبا نے جو ادب پیش کیا، اس میں زندگی کی سچّی تصویر ہی نہیں بلکہ اس کی تنقید بھی موجود ہے اور اس نے مستقبل کا ادبی ماحول متاثر کیا'' (۲۰)۔

کئی ترقی پسند شعرا پہلے رومانوی تحریک سے وابستہ رہے۔ ان میں حسرت موہانی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، اسرار الحق مجاز، اور علی سردار جعفری اہم شاعر تھے۔ تحریک کے دیگر شعرا میں ظہیر کاشمیری، سبط حسن، اوپندر ناتھ، اختر انصاری، ساحر لدھیانوی، ابن انشا، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، مجروح سلطان پوری، جمیل ملک رضا ہمدانی، قتیل شفائی، ظہور نظر، حمایت علی شاعر، شور علیگ، محسن بھوپالی اور انجم اعظمی قابل ذکر ہیں۔

حلقہ اربابِ ذوق کے زیرِ اثر جدید اُردو غزل

حلقہ اربابِ ذوق، ترقی پسند تحریک کے خلاف ردِّعمل کے طور پر تو نہیں بنایا گیا تھا مگر اِس حلقے نے ترقی پسند تحریک سے نامتفق شعرا کو ایک پلیٹ فارم دیا۔ حلقے نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی جس نے ادب کی حالت کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ حلقے کے بارے میں ڈاکٹر انور صابر رقمطراز ہیں:

> ”حلقے کے پلیٹ فارم سے تخلیقِ ادب پر کوئی قدغن لگانے کے بجائے تخلیق کار کے سماجی شعور اور زندگی کے مشاہدے کو اہم جانا گیا اور شاعر و ادیب سے توقع کی گئی کہ وہ روحِ عصر کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے غرض حلقہ اربابِ ذوق کی اس تخلیقی رو نے اُردو غزل کو جدیدیت کے نئے امکانات سے روشناس کرنے میں بھر پور کردار ادا کیا اور بہت سے جدید شعرا نے حلقے کے زیرِ اثر لکھی گئی غزل کے تنوع، وسعت اور گہرائی کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنی مقدور بھر کوشش کی“ (۲۱)۔

حلقہ اربابِ ذوق کے اس تخلیقی مشن نے اپنا بھر پور کردار ادا کیا اور بہت سے جدید شعرا نے حلقے کے زیرِ اثر غزل کے تنوع اور وسعت کی روایت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے پلیٹ فارم سے جن شعرا نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا اُن میں میرا جی، یوسف ظفر، قیوم نظر، ضیا جالندھری، ناصر کاظمی، مختار صدیقی، انجم رومانی، الطاف گوہر، اختر ہوشیار پوری، حفیظ ہوشیار پوری، عظیم قریشی، تابش دہلوی،

تابش صدیقی، مجید امجد، سلام مچھلی شہری، تخت سنگھ، اختر الایمان، منیر نیازی، شکیب جلالی، وزیر آغا، اقبال ساجد، اعجاز فاروقی، شہزاد احمد، عرش صدیقی، مبارک احمد، سید فیضی، کمار پاشی، عمیق حنفی، شاذ تمکنت، شہاب جعفری، ساقی فاروقی، ریاض مجید، نثار ناسک، آفتاب اقبال شمیم، ساحل احمد، ثروت حسین، سرمد صہبائی، وقار عزیز، شہرت بخاری، سجاد باقر رضوی، سلیم شاہد، احمد مشتاق اور سیف زلفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جدید اُردو غزل کے اہم شعرا

آزادی سے پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد جو شعرا جدید اُردو غزل میں معتبر ٹھہرے اُن میں سے کچھ کا تعلّق ترقی پسند تحریک سے ہے اور کچھ حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ ہیں۔ جدید اُردو غزل کے اہم شعرا کا ذکر ملاحظہ کیجیے:

فیض احمد فیض

فیض احمد فیضؔ کی ادبی پہچان تقسیم کے پہلے کی ہے لیکن اُن کو سند قیامِ پاکستان کے بعد ملی۔ وہ اپنے رومانی اور انقلابی پہلوؤں کی وجہ سے بے حد نمایاں ہوئے کم غزلیں کہہ کر خود کو غزل گو شاعر تسلیم کروایا اور معاصرین کو متاثر کیا۔ فیض احمد فیضؔ کے ہاں ترقی پسند نظریے کا شعور بڑا واضح طور پر ملتا ہے۔ اُن کی غزل میں انقلاب کا جوش موجود ہے۔ ڈاکٹر انور صابر، فیضؔ کی شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ”فیضؔ کی ایک بڑی خصوصیّت یہ ہے کہ اس نے اپنے رومانوی خیالات اور جذبات کو کلاسیکی ضبط اور غزل کے روایتی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ساری ترقی پسندی اور انقلابی دعوؤں کے باوجود اپنی غزل اور فن کو

اشتراکی نعرہ بازی کا شکار نہیں ہونے دیتا"(۲۲)۔

فیض کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید "اُردو ادب کی تحریکیں" میں لکھتے ہیں:

"فیضؔ کی منفرد عطا یہ ہے کہ انھوں نے لفظ کے گرد نیا اساسی دائرہ مرتب کیا اور اسے سیاست آشنا بنا دیا۔۔۔۔۔فیضؔ نے نہ صرف نئے استعارے تخلیق کیے بلکہ قدیم شعرا کے مستعمل الفاظ کو بھی نئی تابندگی عطا کی اور ایسی تراکیب وضع کیں جن پر ساختۂ فیض کی مہر ثبت ہے"(۲۳)۔

فیض احمد فیضؔ کا رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری ایک اہم ترقی پسند شاعر ہیں۔ اُنھوں نے غزل کو انقلابی آہنگ کے قریب رکھتے ہوئے بھی رس، رچاؤ اور فکر کی آمیزش برقرار رکھی۔ اُن کا شعری اسلوب فارسی کی خوشگوار تراکیب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اُن کی غزل میں اشتراکی فکر اور خارجی پہلو نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"ظہیر کی شاعری نے رومان سے انقلاب کی طرف ہی سفر نہیں کیا بلکہ اس کی شاعری سے ایک ایسے شخص کا اعتماد بھی جھلکتا ہے جس نے زندگی کا سفر ایک مضبوط نظریے کی روشنی میں طے کیا ہے چنانچہ ان کے ہاں رجائیت کا زاویہ نمایاں ہے۔۔۔۔۔تاریخ اور فلسفے کے گہرے شعور نے اسے فکری توانائی عطا کی ہے اور اس کی شاعری میں سرخ انقلاب کا خواب ایک حقیقت بن کر نمودار ہوا ہے"(۲۴)۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی ترقی پسند شاعر تھے مگر بیک وقت شباب و انقلاب اُن کی شاعری میں موجود ہے۔ ترقی پسندوں میں اہم ہیں اُن کو انقلابی شاعر کہتے ہیں۔ اُن کی غزل میں لب و لہجے کا جوش اور باغیانہ گھن گرج موجود ہے۔ اُن کی غزل میں سلاست، روانی اور بلند آہنگی و مردانگی پائی جاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی کا درج ذیل شعر حظہ کیجیے:

پتہ منزل کا ہم کو تو ملا جوش
بغاوت کر کے میرِ کارواں سے

میراجی

حلقہ اربابِ ذوق سے تعلّق رکھنے والے شعرا میں میراجی بڑے اہم شاعر تھے۔

اُن کی شمولیت سے حلقے نے نہ صرف اجتہاد اور ترقی کی طرف پیش قدمی کی بلکہ ترقی پسند تحریک کی یکسانیت اور مقصدیت کے خلاف سخت ردِعمل بھی ظاہر کیا۔ میرا جی بڑی اہم اور موثر ادبی شخصیت تھے ان کی مغربی جدید تحریکوں پر نظر ہوتی تھی۔ میرا جی اگرچہ نظم گو شاعر تھے لیکن اُنھوں نے دلی اور لکھنؤ کے شعرائے غزل کے اعتراض کے جواب میں غزل گوئی میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ میرا جی کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں لکھتے:

> ''میرا جی نے غزل کو ایک کنواری عورت سے مماثل قرار دیا ہے چنانچہ انھوں نے اِس عورت سے لطف کلامی اور ملائمت سے گفتگو کرتے ہوئے گیت کی استھائی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے...... میرا جی کی لمبی بحر کی غزلوں میں دل گرفتہ کیفیت زیادہ نمایاں ہے اور مزاجاً یہ گیت کے ٹکڑے نظر آتے ہیں'' (۲۵)۔

میرا جی کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے:

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی کی غزل روایت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اُنھوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کو جدید خطوط پر استوار کر کے شاعری میں ایک نئے لہجے کو متعارف کروایا۔ اُن کی غزل میں میر کا سا رنگ نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود بھی ناصر کاظمی جدید دور کے شاعر تھے۔

وہ غمِ جاناں دل میں بسائے عقل و شعور لیے اُردو غزل کو نیا لہجہ و اسلوب دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے اس وقت غزل کا پرچم اٹھایا جب نظم گوئی کا رواج عام تھا۔ غزل کو اہمیّت نہ دی جاتی تھی، ناصر نے فیضؔ و ندیمؔ کی طرح ایک عرصہ غزل پر قبضہ جمائے رکھا۔ ناصر کاظمی کا رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

آئینہ لے کے صبا پھر آئی
بجھتی آنکھوں میں ضیا پھر آئی

تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گل زمینوں کی ہوا پھر آئی

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری کا شمار رومانوی شعرا میں ضرور ہوتا ہے مگر حفیظ کی خصوصیات یہ ہے کہ اُنھوں نے نئے مضامین اور نئے اسلوب برتے ہیں۔ اُن کی غزلیں اُن کی جدید نظموں کی طرح نیا آہنگ رکھتی ہیں۔ حفیظ کا ایک شعر دیکھیے:

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش و خروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

اثر صہبائی

اثر صہبائی نئی غزل کے نمایاں شاعر تھے۔ ان کے ہاں مجازی عشق کے بجائے حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ ملتا ہے۔ اثر صہبائی کی غزل میں فلسفیانہ فکر، اخلاق و حکمت اور مناظر فطرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے ہاں بلند تخیل، جدت و تازگی، مستی و سرشاری، سوز و

گداز، شوخی اور رنگینی کے عناصر بھی نمایاں ملتے ہیں:

موجود بھی ازل سے ہوں اور جاوداں بھی ہوں
خوفِ فنا نہیں ہے کہ مرنا نہیں مجھے

عبدالحمید عدم

عہد جدید میں عدمؔ کی غزل کا اپنا ایک منفرد رنگ ہے۔ اُن کی چھوٹی اور مترنم بحروں نے غزل کو ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ عدمؔ اپنے سادہ اور عام فہم اندازِ سخن کی وجہ سے مشکل سے مشکل بات بھی بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی سے بیان کر دیتے ہیں۔ عدمؔ زندگی اور اس کی ہر چیز سے پیار کرتے ہیں:

ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

حفیظ ہوشیارپوری

یہ بھی عہد جدید کے خوبصورت شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں حکایتِ غمِ دوراں اور فسانۂ غمِ دل کی سحر کاری بھی نمایاں ہے۔ وہ نفسیات کے پیچیدہ اور ناقابل گرفت پہلوؤں کو بھی غزل کے پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ اُنھوں نے انسان کے معاشی و معاشرتی مسائل کو محسوس کیا ہے۔ بلاشبہ حفیظ ہوشیارپوری اُردو غزل کے خوش فکر اور خوش بیان شاعر ہیں:

سنا رہا ہوں برنگِ غزل زمانے کو
حکایت غم دوراں فسانۂ غم دل

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

احسان دانش

یہ بھی جدید غزل کے شاعر ہیں لیکن ان کی غزلوں میں رومانوی رنگ نمایاں ہے۔ ان کا ماضی معاشی تنگ دستی میں گزرا، اس لیے ان کی غزل ایک مزدور کے تلخ روز و شب کی عکاس ہے۔ رومانوی لہجے کے ہونے کے باوجود احسان دانش کا شمار جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

یہ اُڑی اُڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

مجید امجد

مجید امجد کی غزل میں موضوعاتی تنوع، فنی پختگی اور فلسفیانہ استدلال کے ساتھ ملتا ہے۔ اُن کی شاعری میں انفرادی کرب اور معاشی و معاشرتی مسائل و آلام کی چمک نظر آتی ہے۔ انھوں نے اردو غزل کی بدلتی ہوئی روایت کو ایک اہم زاویہ دیا۔ مجید امجد کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''مجید امجد کی شاعری کا مرکزی کردار ایک ایسا نوجوان ہے جس نے دیہات کی کشادہ فضا میں پرورش پائی ہے اور اب شہری زندگی کے تضادات میں حیران و سرگرداں ہے چنانچہ وہ جب فطرت کے ساتھ ہم کنار ہوتا ہے تو اس کے آزاد جذبے کھلکھلانے لگتے ہیں لیکن جب تہذیب

انسانی فطرت کا چہرہ مسخ کرنے لگتی ہے تو وہ افسردہ ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس کی نظموں میں ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ غزلوں میں بھی موجود ہے''(۲۶)۔

مجید امجد کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

دن کٹ رہے ہیں کش مکش روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایہ ابر بہار میں

یوسف ظفر

یوسف ظفر کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی، اُن کی غزل میں حب الوطنی کے جذبات کی فراوانی ہے وہ گرد و پیش کو اشعار کے سانچے میں ڈھالتے ہوئے شعر میں زبردست نئی معنویت اور درد انگیز غنایت پیدا کر دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری زندگی کی تختیوں اور تلخیوں سے بھری پڑی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، یوسف ظفر کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فنی طور پر یوسف ظفر الفاظ کے علامتی استعمال سے نئی معنویت اور ان کے اظہار سے درد انگیز غنایت پیدا کرتے ہیں اور اس انداز کو انھوں نے نظم اور غزل دونوں میں بڑی خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے''(۲۷)۔

زنجیر حوادث کی ہے جھنکار بہ ہر گام
کیا جرم کِیا تھا کہ گرفتار ہوئے ہیں

احمد ندیم قاسمی

جدید غزل کہنے والوں میں ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ندیم کی غزل روایت پسندی سے جڑی ہوئی ہے مگر اُن کا رشتہ ترقی پسندوں سے ہے۔ اقبال کی جدید غزل کا رنگ اُن کی غزل پر ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''ندیم کے پرانی تلمیحات کو نئے مفہوم میں استعمال کرنے کی روش بھی اقبال ہی کی غماز ہے لیکن ندیم ان چند شعرا میں ہیں جو دوسروں کے اثرات سے الگ ہو کر اپنی انفرادیت کو منظر عام پر لے آئے ہیں''(۲۸)۔

یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

قتیل شفائی

قتیل شفائی قیام پاکستان کے بعد غزل کے بہترین شاعر قرار پائے ہیں۔ ان کی غزل میں انفرادیت، موضوعات کا تنوع اور تجربات و مشاہدات ملتے ہیں۔ ان کا شعری اسلوب غنائی ہے۔ وہ انھی غنائی عناصر کے سبب شہرت پا گئے۔ ان کے ہاں معاملات زندگی کی طرف جدید رویے خوبصورت انداز میں ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں زندگی کے حقائق

مترنم انداز اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ادا کئے گئے ہیں:

پریشاں رات ساری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ
سکوتِ مرگ طاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

سیف الدین سیف

یہ بھی جدید غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا رنگِ تغزل ذاتی تجربے اور روحِ عصر کا ترجمان ہے، ان کے ہاں سہل ممتنع کی مثالیں ملتی ہیں۔ غزل سے سیف کو فطری لگاؤ تھا اگرچہ اُنھوں نے فلمی نغمہ نگاری بھی کی ہے:

ان کے جوہر بھی کھلے اپنی حقیقت بھی کھلی
ہم سے کھنچتے ہی وہ تلوار نظر آنے لگے

منیر نیازی

منیر نیازی کی شاعری سے روایت کا ایک تہذیبی شعور جھلکتا ہے وہ عہدِ حاضر کے مقبول شاعر تھے۔ منیر نیازی کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

"انسانی زندگی کی لایعنیت، اکتاہٹ، عہد حاضر کی وجودی احساسات میں سے ہے منیر نیازی کے بعض شعروں میں ان کے احساسات کا عکس ملتا ہے" (۲۹)۔

منیر نیازی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

وزیر آغا

وزیر آغا خوش رنگ غزل گو شاعر تھے۔ اُنھوں نے غزل کا منفرد انداز اختیار کیا، نئی غزل اور نئی تنقید کو ایک مضبوط روایت فراہم کی۔ وزیر آغا فنی اور لسانی حوالے سے ایک معتبر اور صاحبِ اسلوب شاعر تھے:

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ ابھی سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

عرش صدیقی

عرش صدیقی ایک اہم جدید غزل گو شاعر ہیں۔ اُنھوں نے روایت اور جدید عصری تقاضوں سے کام لیا ہے۔ اُنھوں نے جدید غزل کی روایت کو فروغ دینے اور مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنھوں نے شعرا کی نئی کھیپ کو نئے راستے فراہم کیے۔ اُن کی شاعری میں حیات و کائنات کے بارے میں غور و فکر کے عناصر شامل ہیں۔ عرش صدیقی غزل کی روایت کے سبھی تقاضوں کو سامنے رکھ کر زبان و بیان اختیار کرتے ہیں:

گھر سے چلو تو باندھ کے سر سے کفن چلو
شہر وفا سے دشت فنا ہے ملا ہوا

حبیب جالب

حبیب جالب کا شمار مقبول عوامی شعرا میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے فیض کی طرح مزاحمتی اور سیاسی شاعری کو فروغ دیا۔ اُن کی شاعرانہ طبیعت کی روانی نے غزل کو وہ آہنگ دیا جو بعد میں بغاوت کی آواز میں تبدیل ہو گیا۔ اُنھوں نے غزل کے روایتی رموز و علائم کو

نئی سیاسی معنویت عطا کر کے دلکش بنا دیا۔ اُن کی غزلوں میں کوئے دار سے سوئے دار تک کے سفر میں درپیش آنے والی صعوبتوں کا بیان اور سیاسی دلچسپی زیادہ نظر آتی ہے:

کتنا سکوت ہے رسن و دار کی طرف
آتا ہے کون جرأت اظہار کی طرف

شکیب جلالی

جوانی میں انتقال کر گئے مختصر زندگی میں خوبصورت غزلیں کہیں۔ قیام پاکستان کے بعد شہرت پانے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے علامتوں اور استعاروں کا بڑا استعمال کیا جو جدید شاعروں میں مروّج تھا۔ اُن کے ہاں لہو رنگ کی تصویریں اور دیہاتی فضا کے استعارے عام ہیں:

آ کے گرا تھا اک پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

ظہور نظر

فیضؔ اور ندیمؔ کے بعد اگر کوئی ترقی پسند شاعر اہم ہے تو وہ ظہور نظر ہیں۔ اُن کی غزل میں موضوعات کا تنوع، لفظیات کی منفرد بنت ملتی ہے۔ اُن کی غزلیں تجربے کی وسعت، علامت کی معنی خیزی اور گہرائی کے سانچے میں ڈھل کر روحِ عصر کی ترجمانی کرتی ہیں:

دل لہو ہوتا تب آنکھ میں اشک آتا
وقت گرہنس کے گزر جائے تو کیوں روئیں لوگ

عارف عبدالمتین

عارف عبدالمتین کا شمار اہم ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں زندگی کے خارجی پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اُن کے اشعار میں بھاری بھرکم الفاظ کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ اُن کے ہاں رجائیت کا پہلو نمایاں ملتا ہے۔ اُنھوں نے عدل و مساوات کے نظریات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے، وہ فن اور مقصد کو الگ الگ کرنے کے قائل نہیں:

ہوئی ہیں خونِ بشر سے جو کھیتیاں سیراب
اُگے ہیں ان سے کبھی مہر تو کبھی مہتاب

مظفر وارثی

جدید اُردو غزل میں مظفر وارثی بڑے منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی، مظفر وارثی کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مظفر وارثی اُردو کے اُن چند جدید غزل نگاروں میں شامل ہیں جنھوں نے جدّت کو محض جدّت کی خاطر اختیار نہیں کیا بلکہ اس سے غزل میں نکھار، تازگی اور توانائی پیدا کی ہے۔ لفظوں کے نئے آہنگ کے ساتھ ان کے بلیغ استعمال پر اسے قدرت حاصل ہے وہ نئی علامتیں تخلیق کرتا ہے۔ نئی تراکیب ڈھالتا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ نئے مسائل پر، اپنے عصر کے مسائل پر غور کرتا ہے''(۳۰)۔

میں نے بینائیاں بو کر بھی اندھیرے کاٹے
شہر میرا تھا مگر آب و ہوا کس کی تھی

شہزاداحمد

شہزاداحمد بھی جدید غزل کے شاعر تھے اُن کی حقیقت بھی رومان میں چھپی ہوتی ہے۔اُن کی غزل میں خارجی مناظر کے مضامین بڑی ہنرمندی سے بیان ہوئے ہیں۔اُن کی غزل جذبات واحساسات کی عکاس ہے۔اُن کے ہاں محبت جیسے آفاقی جذبے کثرت سے ملتے ہیں:

ذرا سی دھوپ سے پہلو میں آنچ اٹھتی ہے
میں برگِ خشک ہوں ، موجِ فنا بہا لے جا

خالداحمد

ایک اچھے غزل گوشاعر تھے۔انھوں نے غزل میں نئے نئے موضوعات شامل کیے۔خالد احمد جدید رنگ وآہنگ کے نمائندہ شاعر تھے۔انھوں نے نئی لسانی تشکیلات کو غزل میں متعارف کرانے کی کوشش کی ہے:

اک شمعِ گل اندام دہکنے لگی مجھ میں
ہم پیرہن بادہ گل ناز ہوا میں

خورشیدرضوی

خورشید رضوی کے ہاں غزل کا ایک جدید اور نیا انداز ملتا ہے۔اُنھوں نے عہدِ موجود کی غزل کو ایک توانا روایت بخشی ہے۔اُنھوں نے جدید انکشاف کرتے ہوئے پرانے تصورات کو نئی صورتیں عطا کی ہیں۔نئے لسانی عمل کو آگے بڑھانے میں اُن کی غزل بھی اپنا

حصّہ رکھتی ہے:

نبضِ ایام ترے کھوج میں چلنا چاہے
وقت خود شیشۂ ساعت سے نکلنا چاہے

ظفراقبال

قیامِ پاکستان کے بعد جدید غزل میں ناصر کاظمی،منیر نیازی اور شہزاداحمد کی طرح ظفر اقبال بھی اپنے معاصرین پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔نئی نسل کی غزل گوئی پر اُن کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ظفر اقبال کا ابتدائی دور''آبِ رواں'' کی اشاعت تک ہے۔انھوں نے غزل کو نئے مزاج اور موضوعات سے آشنا کر دیا۔ظفر اقبال کی نئی لفضیات نے آنے والے غزل گوشعرا کے لیے راستہ ہموار کر کے مشعل راہ کا کام کیا ہے:

جھوٹ بولا ہے ظفؔر تو اِس پہ قائم بھی رہو
آدمی کو صاحبِ کردار ہونا چاہیے

اداجعفری

اداجعفری عہدِ حاضر کی ایک معتبر شاعرہ ہیں۔خواتین کی شاعری کا اعتبار انھی سے قائم ہوا ہے۔اُن کی غزل زندگی کے جدید رجحانات کی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ روایت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔انھوں نے قدیم اور فرسودہ نظامِ زندگی کے خلاف سخت بغاوت اختیار کی ہے۔وہ زندگی کے سبھی محرکات وعوامل کو اپنی شاعرانہ بصیرت سے غزل میں پرونے کا سلیقہ رکھتی ہیں:

جلنا تو چراغوں کا مقدر ہے ازل سے
یہ دل کے کنول ہیں کہ بجھے ہیں نہ جلے ہیں

احمد مشتاق

احمد مشتاق نئے غزل گو شعرا میں شامل ہیں، اچھے نمائندہ شاعر ہیں۔ اُنھوں نے غزل کو نیا آہنگ دیا اور نئی نسل کے اچھے شاعر ثابت ہوئے۔ اُنھوں نے زندگی کے دکھوں اور خوشیوں کو غزل میں جگہ دی ہے۔ اُن کے اسلوب میں دھیما پن نظر آتا ہے:

کوئی شرر نہیں بچا پچھلے برس کی راکھ میں
ہم نفسان شعلہ خو آگ نئی جلائیے

پروین شاکر

پروین شاکر جدید غزل کی اہم شاعرہ تھیں۔ اُن کی غزل فنی طور پر روایتی مگر جدید آہنگ رکھتی ہے۔ اُن کی شاعری میں کئی عمدہ رنگ نظر آتے ہیں۔ اُن کے ہاں تازہ امیجز اور نئی تمثیل کاری ہے جس نے شعر کے مجموعی تاثر اور تفہیم میں اضافہ کیا ہے انھوں نے سادگی اور مرصع سازی کے ایک نئے آہنگ کا تجربہ کیا:

کہرے میں چھپا ہوا تھا جنگل
چڑیا کہیں دور بولتی تھی

ناصر زیدی

ناصر زیدی کی غزل میں روایتی شاعری کا انداز اور جدید لب و لہجے کا تاثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا انداز روایتی ہے مگر اس میں آہنگ نیا ہے۔ ناصر زیدی نئی غزل لکھنے والوں میں اہم ہیں۔ ناصر زیدی کی غزل میں رومانوی لب و لہجے کے ساتھ ساتھ جدّت بھی دیکھنے میں آتی ہے:

نارسائی نے عجب کھیل دکھائے ناصرؔ
چاند بھی ریت کی ٹوٹی ہوئی دیوار لگے

محبوب خزاں

محبوب خزاں کی غزل میں موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی جدّت واضح نظر آتی ہے۔ وہ غزل کے رسمی انداز سے ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔ اُن کے موضوعات و مضامین منفرد ہیں۔ اُنھوں نے اپنے پیرایۂ اظہار میں پیچ و خم پیدا کر کے اور بیان میں جدیدیت لا کر اپنے شعری اسلوب کو دلکش بنا دیا ہے:

کچھ لوگ جی رہے ہیں شرافت کو بیچ کر
تھوڑی بہت انھی سے شرافت خریدیے

مرتضیٰ برلاس

مرتضیٰ برلاس کی شاعری میں روح عصر کی عکاسی ملتی ہے۔ اُنھوں نے انفرادی اور اجتماعی آواز کو اپنی غزل میں شامل کیا ہے۔ اُن کے انداز نے نئی غزل میں نئی لفظیات کو متعارف کروایا ہے۔ مرتضیٰ برلاس کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

مجرم ہو با رسوخ تو قانون کچھ نہیں
کس نے یہ نقش کر دیا میزانِ عدل پر

اقبال ساجد

اقبال ساجد بڑے معتبر شاعر ہیں، اُن کے ہاں جدید شعری روایت موجود ہے۔ وہ معاشی حالات سے پریشان مگر شعری مقام رکھتے ہیں۔ جدید غزل کے آئینہ دار ہیں، اُنھوں نے جدید غزل کو عصری تقاضوں میں ڈھالا:

دہر کے اندھے کنویں میں کس کے آوازہ لگا

کوئی پتھر پھینک کے پانی کا اندازہ لگا

علاوہ ازیں جدید غزل کے علمبرداروں میں کشور ناہید، ریاض مجید، محسن نقوی، احمد فراز، عدیم ہاشمی، نجیب احمد، جان کاشمیری، خالد شریف، احمد عقیل روبی، جمیل الدین عالی، ابن انشاء، حمایت علی شاعر، جون ایلیا، افتخار عارف، عبیداللہ علیم، انور شعور، سلیم کوثر، فہمیدہ ریاض، ثروت حسین، سحر انصاری، منظر ایوبی، صابر ظفر، اعتبار ساجد، شبنم شکیل، سرور بارہ بنکوی، ثمینہ راجہ، جواز جعفری، سعد اللہ شاہ، انجم سلیمی، قمر رضا شہزاد، فخر زمان، فاطمہ حسن، سرور ارمان، فیصل عجمی، شاہد ذکی، اختر عثمان، سعود عثمانی، شہزاد نیّر، عاطف کمال رانا، حسن عباسی، شاہدہ حسن، شاہین عباس، مقصود وفا، یاسمین حمید اور ارشد نعیم شامل ہیں۔

جدید اُردو غزل کے ارتقا پر طائرانہ نظر ڈالیں تو جدید غزل عہد بہ عہد سفر (ارتقائی مدارج) طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں پہنچی ہے۔ ہر عہد کے شعرا نے اس میں مقدور بھر حصّہ ڈالا۔ اُردو ادب بڑا خوش بخت واقع ہوا ہے کہ اِسے ہر عہد میں ایسے شعرا میسر رہے جن کی بدولت اُردو غزل مسلسل ارتقا پذیر رہی۔ قدیم سے جدید کی طرف آئیں تو حالی کا نام سامنے آتا ہے مگر جب جدید سے جدید تر کی طرف آئیں تو عباس تابشؔ کا نام اہمیّت اختیار کر لیتا ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد ۸۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک غزل کا مزاج دیکھیں تو بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ عباس تابش نے جدید غزل میں نیا لہجہ برتا ہے۔ اُن سے پہلے غزل جدید رنگ لیے ہوئے تھی مگر انھوں نے اس کو نیا آہنگ، نیا اسلوب اور نیا ڈکشن عطا کر دیا ہے۔ وہ جدید غزل جس کی بنیاد غالب و حالی نے رکھی تھی عباس تابش نے اس کو جدید تر بنا کر بامِ عروج پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ بات ہرگز درست نہیں کہ وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ غزل جدید یا جدید تر ہو جاتی ہے۔ دراصل غزل کا مزاج اُس وقت نیا ہوتا ہے جب اُس میں مقدور بھر تبدیلیاں کی جائیں۔

عباس تابشؔ نے جب غزل گوئی شروع کی تو اُس وقت ساہیوال میں مجید امجد جیسے جدید اسلوب کے شاعر شعری اُفق پر تھے۔ ہر طرف جدید رنگ و آہنگ غزل کا حسن سمجھا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں جو شاعر آغازِ سخن کرے اُس کا رنگ و آہنگ جدید تر ہونا باعثِ تعجب نہیں، بلاشبہ عباس تابشؔ اکیسویں صدی کے منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ اُنھوں نے جدید غزل کے تقاضوں کو نہ صرف سمجھا ہے بلکہ بخوبی نبھایا بھی ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں کا مطالعہ کریں تو ہر سو تازہ شگوفے کھلے ملتے ہیں۔ اُنھوں نے نئے نئے رنگ غزل میں بھر دیے ہیں۔ عباس تابشؔ کی غزل کے حوالے سے شہزاد نیئرؔ کہتے ہیں:

''عباس تابش کے ہاں موضوعاتی تنوع اور خیال کی رنگا رنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لیکن اُن کا ایک خاص فن ایک ہی خیال کو دو مختلف پہلوؤں یا انداز سے شعر میں سمونا بھی ہے یوں خیال کے متنوع پہلو روشن ہوتے ہیں۔ عباس تابش کمٹمنٹ کے شاعر ہیں وہ سچّی لگن اور تخلیقی انہماک کے ساتھ محوِ کارِ سخن ہیں'' (۳۱)۔

عباس تابشؔ کا جدید رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

وقت لفظوں سے بنائی ہوئی چادر جیسا
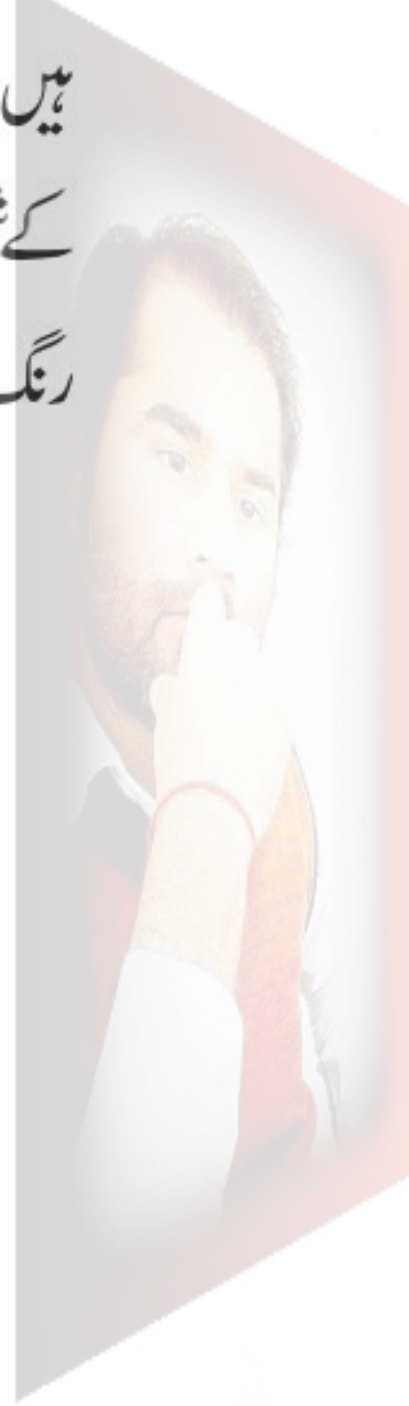
اوڑھ لیتا ہوں تو سب خوابِ ہنر لگتا ہے

ایک مدّت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے
(آسمان)

ان اشعار میں کمال کی جدّت نظر آتی ہے یہ شعر عباس تابش کا مقبولِ عام شعر ہے اور ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی رکھتا ہے ۔اُنھوں نے تراکیب وتشبیہات کا استعمال خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ایک دوسری غزل کے اشعار دیکھیے :

دیوار ہے کسی کی دریچہ کسی کا ہے
لگتا ہے گھر کا گھر ہی اثاثہ کسی کا ہے

اک اور ہاتھ بھی ہے پسِ رقصِ حیلہ جُو
ہم تم تو پتلیاں ہیں تماشا کسی کا ہے

اشکوں سے بھر رہا ہوں میں اپنی دریدہ مشک
اتنے برس کے بعد بھی دریا کسی کا ہے
(آسمان)

عباس تابشؔ کا لہجہ غزل کا لہجہ ہے ۔ان کا اسلوب جدید ہے اور نئے نئے موضوعات ان کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں۔''تمہید'' ،''آسمان'' ، ''مجھے دعاؤں میں یادرکھنا'' ، ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' کے بعد عباس تابشؔ کا پانچواں شعری مجموعہ ''رقصِ درویش'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ۔''رقصِ درویش'' پر عباس تابشؔ کو تہذیب فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے ۲۰۰۸ء میں ایوارڈ دیا گیا۔اِس مجموعے میں ایک نعت اور

چھیاسٹھ غزلیں ہیں۔ ہر غزل جدید لہجے، تراکیب، تشبیہات اور مضامین سے لبریز ہے۔ ''تمہید'' سے لے کر ''رقصِ درویش'' تک اُن کی فکر اور فن میں ایک معیّن رفتار سے ارتقا ہوتا ہوا نظر آیا ہے ۔ یہ ارتقا مصرعے کی تراش ،فکر کی رفعت ، بلاغتِ کلام اور شعر در شعر پھیلے ہوئے حسنِ تغزل میں جلوہ گر ہے۔اُن کے کلام میں موضوعاتی تنوع جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ جس کی بنا پر عباس تابشؔ کا شمار جدید تر شعرا کی صف میں ہوتا ہے۔

عباس تابشؔ روایت سے جڑے ہوئے ضرور ہیں مگر اُن کا شعری شعور جدید آہنگ رکھتا ہے۔اُنھوں نے روایت سے کسبِ فیض کرتے ہوئے غزل کے فن کو آگے بڑھانے کی سعی کی ہے۔ اُنھوں نے مضمون آفرینی ، تاثیر پذیری، حسنِ تغزل اور رمز و ایمائیت کو برقرار رکھا ہوا ہے، اِس لیے اُن کا کلام منفرد دکھائی دیتا ہے۔ اِس سلسلے میں شہزاد نیّر مزید لکھتے ہیں:

> ''اکیسویں صدی میں غزل کے نقیبوں میں ایک نمایاں نام عباس تابشؔ کا ہے۔انھوں نے روایت کا سرمایہ آنکھ میں رکھ کر جدید تر عہد کی نمائندہ غزلیں تخلیق کی ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ درخت کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو جائے ، جڑیں زمین میں پیوست رکھے گا تو موسم اُسے ضرور برگ و بار دیں گے'' (۳۲)۔

عباس تابشؔ مصرعوں میں صوتی آہنگ بھر دیتے ہیں۔اُن کی غزلیں موسیقی سے لبریز ہیں اور آسانی کے ساتھ گنگنائی بھی جاسکتی ہیں۔ان کا کلام پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر کہتے ہوئے وہ میرؔ کو بھی مدِّ نگاہ رکھتے ہیں۔کیوں کہ وہ سہل زمینوں کے استعمال سے

اشعار کو گداز اور دل نشیں بناتے ہیں مگر ساتھ ہی قافیہ، ردیف اور زمین کے انتخاب کے وقت کلاسیکی اور عہدِ حاضر کی غزل اُن کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ وہ ان میں مناسب تبدیلی کر کے اپنی غزل میں نیا آہنگ بھر دیتے ہیں۔ بولتے ہوئے قافیے اور خوبصورت و جان دار ردیفیں ان کے اشعار میں حسن بھر دیتی ہیں:

ہمارے دکھ نہ کسی طور جب ٹھکانے لگے
ہم اپنے گھر میں پرندوں کے گھر بنانے لگے

میں برگِ خشک ہوں، ٹہنی سے جھڑ نہیں سکتا
درخت کیوں مجھے اپنی طرف بلانے لگے

(پروں میں شام ڈھلتی)

عباس تابشؔ عہدِ جدید کی تمام باریکیوں پر نظر رکھنے والے حساس شاعر ہیں۔ جنھوں نے اپنی شاعری میں فطرت کے مناظر، عشق و محبت، انسانیت کا درد، بے گھری، پرندوں سے محبت، نقل مکانی، زندگی میں درپیش سماجی مسائل، انصاف، سیاست اور کونج کے پروں سمیت تمام موضوعات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ اُن کا زندگی کے تمام پہلوؤں کو غزل میں سمونا دریا کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ عباس تابشؔ نے اُردو غزل میں جدّت پیدا کی یا یوں کہہ لیں کہ جدّت کی روایت کو پروان چڑھاتے ہوئے اس کو اگلی نسلوں تک پہنچایا ہے۔ عباس تابشؔ کا رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

دن نکلتا تو کہیں شور مچانے جاتا
میں پرندوں میں پرندہ نظر آنے جاتا

میرے مانند اگر اُن کی بھی آنکھیں ہوتیں
میں نیا زخم درختوں کو دکھانے جاتا

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

دیکھ اے حسنِ فراواں یہ بہت ممکن ہے
میرا دل تک نہ لگے تیرے خزانے لگ جائیں

کارِ دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی مری خیر منانے لگ جائیں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

دکھ ہوا آج دیکھ کر اُس کو
وہ تو ویسا ہی خوبصورت ہے

(آسمان)

یہ اشعار جدّت کے عمدہ نمونے ہیں، اُنھوں نے ان اشعار میں پرندوں، درختوں کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ عباس تابش کی یہ خوبی ہے کہ وہ کی ہوئی بات کو ایسے دہراتے ہیں کہ وہ اُن کی ہو جاتی ہے۔ یہی انداز اُن کی اہمیّت میں اضافہ کرتا ہے، انھوں نے اشعار میں عشق و محبت کی باتیں بھی کی ہیں لیکن انھوں نے انداز نئے برتے ہیں اُن کے اشعار میں روایتی شاعروں کی طرح سوز و گداز اور محبُوب کی بے وفائی اور بے مروتی بھی پائی جاتی ہے۔ اُن کے ہاں رومانوی لہجہ بھی استعمال ہوا ہے۔ عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو پھر یوں ہے کہ میں نے اُس کو چاہا ہی نہیں تابشؔ
اگر اُس کی شباہت کا گماں مجھ پر نہیں ہوتا

(آسمان)

کبھی نیندیں کبھی آنکھوں میں پانی بھیج دیتا ہے
وہ خود آتا نہیں اپنی نشانی بھیج دیتا ہے

(آسمان)

پرندے پوچھتے ہیں تم نے کیا قصور کیا
وہ کیا کہیں جنھیں ہجرت نے گھر سے دور کیا

(آسمان)

ہمیں تو خاک پہ حکمِ سفر دیا اُس نے
وہ اور ہوں گے جنھیں کوئی گھر دیا اُس نے

اُسے نہ ملنے سے خوش فہمیاں تو رہتی ہیں
میں کیا کروں گا جو انکار کر دیا اُس نے

(آسمان)

عباس تابش کے ان اشعار میں جدّت بھی ہے اور کلاسیکیت بھی ہے کیوں کے ان اشعار کے مضامین کا انداز روایتی ہے۔انھوں نے رومانوی لہجے کا استعمال کیا ہے۔وہ محبُوب سے اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں اور اُس کے انکار سے خائف بھی ہیں مگر انھوں نے اپنا اسلوب اختیار کیا ہے۔وہ ہجر وہجرت کی بات بھی کرتے ہیں اور وصالِ یار کے خواب بھی بنتے ہیں۔اُنھیں خبر ہے کہ اُن کا محبُوب بے مروت ہے اس لیے وہ اُس سے کوئی عہد و پیمان

نہیں باندھنا چاہتے تا کہ وہ ایک خوش فہمی میں رہیں۔عباس تابش کے کچھ مزید اشعار ملاحظہ کریں جن میں جدید رنگ و آہنگ بھرا ہوا ہے:

میری تنہائی بڑھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہنس تالاب پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں

(رقص ردویش)

دیکھا نہ جائے دھوپ میں جلتا ہوا کوئی
میرا جو بس چلے کروں سایہ درخت پر

(آسمان)

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

(رقص درویش)

دھندلی سمتوں میں اگر کونج کا پر مل جائے
پھر تو اے دربدری مجھ کو بھی گھر مل جائے

اور ہی رنگ میں ہو برگ و ثمر کا ہونا
جس کی خواہش ہے مجھے وہ بھی اگر مل جائے

(آسمان)

عباس تابش سے اپنے محبُوب سے بچھڑ کر کسی اور کا ملاپ نہیں دیکھا جاتا، ہنس جب تالاب پہ آتے ہیں تو اُن کی تنہائی میں اور اضافہ کر جاتے ہیں۔دوسرے شعر میں شاعر نے انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے وہ کسی کو مصیبت اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے اس شعر میں
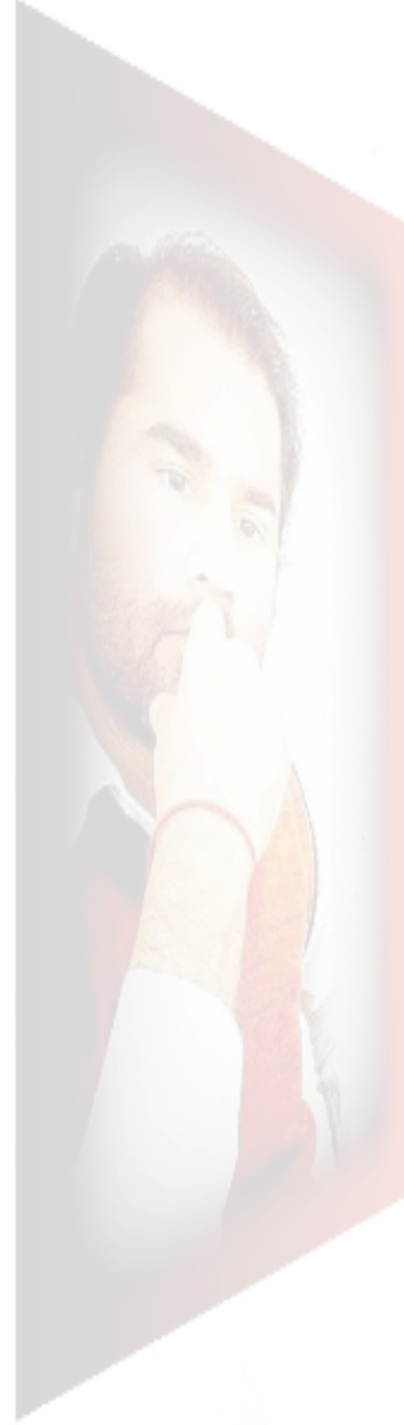
انھوں نے درخت اور دھوپ کا خوبصورت استعارہ استعمال کیا ہے۔وہ کہتے ہیں یہ درخت سارا دن سورج کی تپش برداشت کرتے ہیں اگر میرا بس چلے تو میں ان پر سایہ کردوں۔اس شعر میں کمال کی جدّت نظر آتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ انسان زندگی میں بے شمار خواہشیں کرتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اگر کسی کی کوئی خواہش پوری ہو جائے تو موسمِ بہار کچھ اور ہی رنگ میں لگتا ہے۔ان اشعار میں انداز نیا اور اچھوتا ہے،عباس تابش کی یہی خوبی انھیں معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔وہ فنی وفکری حوالے سے ایک باکمال غزل گو شاعر ہیں۔عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

عشق نے پھینک دیا وقت سے باہر اُس کو
ہو مکاں میں تو کوئی نقل مکانی مانگے
(رقصِ درویش)

کبھی دل کی طرف بھی برشگالِ موسمِ ہجراں
کہ یہ مٹی کی ڈھیری بھی بڑے امکان رکھتی ہے
(تمہید)

عباس تابش کے جدید رنگِ تغزل کا ذکر اُن کے معاصرین بھی کرتے ہیں،اس سلسلے میں شکیل جاذب کہتے ہیں:

"تمہاری غزل روایت کے رچاؤ اور جدیدیت کی تازگی سے عبارت ہے۔تمہاری غزل کا آہنگ ہی نہیں اِس کی فضا بھی جداگانہ ہے۔پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو تمہاری شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے"(۳۳)۔

عباس تابش نے پرندوں کو اپنے اشعار میں کئی طرح سے باندھا ہے۔یہی جدّت،یہی جدید طرزِ سخن کی علامت ہے۔پرندوں سے انھیں خاص رغبت ہے،پرندہ ان کی شاعری کا استعارہ ہے۔شہزاد نیئر،عباس تابش کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"تابش کی لفظیات کا خمیر دھرتی سے اٹھا ہے۔سادگی، برجستگی اور کلاسیکیت اِس کے نمایاں پہلو ہیں۔پرندے، پیڑ، دشت، جنگل، چاند، حسرت، بام، ستارہ، فلک، گھر، در، شمشیر اور اس طرح کے الفاظ سے وہ اشعار میں جہانِ معنی بھر دیتے ہیں۔وہ تراکیب، تشبیہ اور استعارے کے باب میں ندرت وجدّت کا اظہار کرتے ہیں، تاہم تجربہ کرتے ہوئے خیال کی قربانی انھیں منظور نہیں"(۳۴)۔

عباس تابش اکیسویں صدی کے اہم نمائندہ شاعر ہیں۔اُنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے جدید طرزِ احساس کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اُن کے لہجے اور شعری اسلوب میں اجتہادی خصوصیات ملتی ہیں۔اُن کی شاعری تخلیقی امتزاج کی ایک حسین مثال ہے۔غزل میں اُنھوں نے نئی راہیں اختراع کی ہیں۔اُن کے اپنے معاصرین اور بعد میں آنے والے شعرا میں سے کئی ایک نے ان راستوں کو اپناتے ہوئے فنِ غزل گوئی کو آگے بڑھایا ہے۔عباس تابش نے اپنے فنِ غزل گوئی کو کلاسیکیت وجدیدیت کے امتزاج سے تشکیل دیا ہے وہ کلاسیکی پس منظر لیے نئی غزل کہتے ہیں۔شعر دیکھیے:

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اوراس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابشؔ پرانے الفاظ، پرانی تلمیحات و واقعات کو بڑے نئے انداز کے ساتھ اپنے اشعار میں باندھتے ہیں:

ورنہ ہم لوگ کہاں عشق میں برباد ہوئے
اپنی عزت تو ہے مجنوں کا گھرانہ کر کے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابشؔ، میرؔ و غالبؔ سمیت کلاسیکی شعرا کے نام اکثر اپنے اشعار میں پکارتے رہتے ہیں کیوں کہ پرانی قدروں سے انھیں محبت ہے اور وہ کلاسیکی شعرا کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں، مگر نئے انداز میں اشعار کہتے ہیں۔ تابشؔ نے لمبی اور چھوٹی تمام بحروں میں غزلیں تخلیق کی ہیں۔ تمام اشعار جدید رنگ و آہنگ لیے ہوئے نظر آئے ہیں، لمبی بحر کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہمیں تو بس یہ پتہ چلا تھا کہ اونٹوں والے چلے گئے ہیں
کسی کو اس کی خبر نہیں جو معاملہ ختم ہو گیا ہے

تمہاری باتوں کے جن پہ شہتوت جھڑ رہے ہوں وہی بتائیں
کہ تلخ آباد میں ہمارا تو ذائقہ ختم ہو گیا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اِس شعر میں تابشؔ نے ''تلخ آباد'' کا لفظ کیسے خوبصورت اور نئے انداز میں

باندھا ہے۔ تابش کا خوبصورت اور جدید رنگ تغزل ملاحظہ کیجیے:

دل بستگیِ شوق کے سامان بندھے ہیں
گھر میں کہیں پنجرے کہیں گلدان بندھے ہیں

تم کاٹ نہ دینا اِسے بے کار سمجھ کر
اِس پیڑ کے نیچے کئی پیمان بندھے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے اس شعر میں پیمان باندھنے کی جگہ کی کس طرح منظر کشی کی ہے۔ وہ اپنے اشعار میں خود کہتے ہیں کہ مجھے بھی اوروں کی طرح کا ہی ماحول ملا ہے، میں بھی اِسی فضا میں سانس لیتا ہوں مگر میں اپنی مرضی کا پیشِ منظر بنا تا ہوں۔ بلاشبہ عباس تابشؔ کا اندازِ سخن ممتاز و ممیّز ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نیا پرندہ قفس سے باہر بنا رہا ہوں
میں اپنی مرضی کا پیشِ منظر بنا رہا ہوں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اِن اشعار میں عباس تابشؔ نے کمال مہارت سے جدید لہجہ برتا ہے اور کتنے خوبصورت اور منفرد مضامین بھر دیے ہیں:

دمِ سخن ہی طبیعت لہو لہو کی جائے
کوئی تو ہو کہ تری جس سے گفتگو کی جائے

یہ نکتہ کٹتے شجر نے مجھے کیا تعلیم
کہ دکھ تو ملتے ہیں گر خواہشِ نمو کی جائے

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اِن اشعار میں عباس تابشؔ کا خوبصورت اندازِ تکلّم ملاحظہ کیجیے:

کم سخن ہیں پسِ اظہار ملے ہیں تجھ سے
ملنا یہ ہے تو کئی بار ملے ہیں تجھ سے

کھینچ لاتی ہے ہمیں تیری محبت ورنہ
آخری بار کئی بار ملے ہیں تجھ سے

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

بلا شبہ عباس تابشؔ نے پانچوں مجموعہ ہائے کلام میں اچھا سخن بکھیرا ہے۔ اپنے اِس شعر میں اُنھوں نے اپنے معیار کا اعتراف کرلیا ہے۔ اُنھوں نے جدید غزل کو ایک معیار عطا کیا ہے۔ شعر دیکھیے:

اچانک جو ملے اُس کو اچانک چھوڑ دیتا ہوں
مرے معیار پر پورا اتر آہستہ آہستہ

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش جدید اُردو غزل کے ایک اہم اور نمایاں شاعر ہیں۔ اِس بات کا اعتراف کرتے ہوئے محمد اظہار الحق ''رقصِ درویش'' کے دیباچے میں یوں رقمطراز ہیں:

''مجھے یاد نہیں پہلی بار میں نے عباس تابشؔ کی غزل کہاں پڑھی تھی، کسی ادبی جریدے میں تھی یا اس کا شعری

مجموعہ تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں دم بخود رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا یہ شاعر کون ہے جو بیک وقت جدید بھی ہے اور کلاسیکل بھی اور جس کا شعر چونکا دیتا ہے اور ساتھ ہی ایک ایسی طمانیت بھی بخشتا ہے جو غائب و حاضر دونوں تک رسائی دیتی ہے۔ کیا آپ نے جدّت اور کلاسیک کا اس سے بہتر امتزاج دیکھا ہے؟'' (۳۵)۔

غالبؔ کی زمین میں کہی گئی عباس تابشؔ کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔ غزل پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کی غزل کسی نے نہیں کہی۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ دیکھ مرے نقشِ کفِ پا مرے آگے
آگے بھی کہاں جاتا ہے رستہ مرے آگے

اے تشنہ لبی تو نے کہاں لا کے ڈبویا
اِس بار تو دریا بھی نہیں تھا مرے آگے

ایسے نہیں مانوں گا میں ہستی کا توازن
تقطیع کیا جائے یہ مصرعہ مرے آگے

(رقصِ درویش)

محمد اظہار الحق، عباس تابش کی شاعری کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''جدید شاعری کا طالب علم کلاسیکل شعرا سے گریزاں ہے؟ اس لیے کہ قدیم فارسی غزل سے ورثے میں ملے ہوئے تلازمے اپنی کشش کھو چکے ہیں۔ وہی صحرا اور اُس کے ساتھ محمل اور قیس، وہی کشتی اور اُس کے ساتھ گرداب اور ساحل، وہی باغ اور اُس کے ساتھ قفس اور صیّاد، عباس تابش نے کمال یہ کیا کہ اِسی لفظیات کو نیا زاویہ دیا اور اس جسم کو نیا پیراہن عطا کیا، یوں کہ یہ علامتیں بجائے خود جدّت کا نشان بن گئیں'' (۳۶)۔

اُس کو مدّت سے کوئی قیس نہیں ملتا تھا
میری دہلیز پہ صحرا کو ضرورت لائی
(رقصِ درویش)

عباس تابش نے زندگی کے ہر پہلو کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ حوالۂ غزل کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے تمام مسائل غزل میں پرو ڈالے ہیں۔ اُن کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم پڑتا ہے کہ ہر شعر نئے نویلے انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ ہر شعر ایک الگ مضمون لیے ہوتا ہے۔ اُن کے تمام اشعار پرمغز اور معنی خیز ہوتے ہیں۔ وہ پرانی باتوں کو بھی اپنے انوکھے انداز سے جدید کر دیتے ہیں۔ گھسے پٹے الفاظ استعمال کرنا عباس تابش کی عادت نہیں۔ وہ نئے نئے الفاظ و خیالات نہ جانے کہاں سے لے آتے ہیں، اِسی لیے انھیں عہدِ حاضر کا ایک اہم شاعر قرار دیا گیا ہے، طارق کریم کھوکھر، ''رقصِ درویش'' کے فلیپ پر لکھتے ہیں:

''ظفر اقبال کے بعد اُردو غزل نقطۂ انجماد پر ٹھہر گئی تھی، عباس تابش کی تخلیقی حدت نے اسے ایک دفعہ پھر نئے راستوں پر رواں کر دیا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عباس تابش ۸۰ء کی دہائی کے سب سے بڑے غزل گو ہیں'' (۳۷)۔

عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں ٹھیک سے قدم نہیں زینوں پہ رکھ سکا
میری نگاہ تھی کہیں اوپر لگی ہوئی

کیوں پھیرتی ہے چاند کے بالوں میں انگلیاں
کس کام پر ہے شاخِ صنوبر لگی ہوئی
(رقصِ درویش)

تابش نے کس طرح صنوبر کی شاخ سے چاند کے بالوں میں انگلیاں پھروائی ہیں، یہ انداز بالکل نیا ہے چاند کے بال بنا ڈالے ہیں اور شاخ صنوبر کی انگلیاں بنا دی ہیں۔ اِس شعر میں کمال کی جدّت نظر آتی ہے۔ تابش کے پانچویں مجموعۂ کلام ''رقصِ درویش'' کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

اِسی خاطر تو میں کوزہ گری سے ہاتھ کھینچے ہیں
مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کاسے بناتا ہوں

نہ کیوں ترکِ تعلّق پر گماں گزرے محبت کا
کہ میں تو بے دلی کے کام بھی دل سے بناتا ہوں
(رقصِ درویش)

عباس تابش بلاشبہ ایک جدید شاعر ہیں اِس بات کا اقرار عہدِ حاضر کے بڑے شعرا بھی کرتے ہیں۔ افتخار عارف، اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

''پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی اور اظہار الحق کے بعد عباس تابش اُردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیک روایت کے دائروں میں مضمونِ تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گامزن ہے ......معمولات و مراسم عشق کو نئے ڈھنگ سے باندھنا مشکل کام ہے مگر عباس تابش اِن مرحلوں سے بھی بہت کامیاب گزرے ہیں۔ اکیسویں صدی کی غزل کو وقار و اعتبار بخشنے والوں کا جب بھی ذکر ہوگا، عباس تابش کا نام بہت نمایاں نظر آئے گا، مجھے اس کا یقین ہے'' (۳۸)۔

رقصِ درویش کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

بوئے گل بن کے سر دوش ہوا رہتے ہیں
پھر بھی ہم آبلہ پا آبلہ پا رہتے ہیں

ایک لمحے کو لگا کھل گئے عقدے سارے
پھر یہ سوچا کہ ترے بندِ قبا رہتے ہیں

جب بھی ہوتی ہے ہمیں نقل مکانی منظور
کچھ دنوں کے لیے اک شخص میں جا رہتے ہیں
(رقصِ درویش)

اس شعر میں عباس تابش نے کتنے نئے انداز میں اپنی آبلہ پائی کا ذکر کیا ہے۔ یہ انداز بالکل نیا ہے، ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

تجھ جیسا ہر طرف نظر آنا تو ہے نہیں
دل آئینہ ہے آئینہ خانہ تو ہے نہیں

کیوں خواب اور سانپ میں رہتی ہے کشمکش
آنکھوں کی تہ میں کوئی خزانہ تو ہے نہیں
(رقصِ درویش)

عباس تابش نے یہاں خواب اور سانپ کے لفظوں سے کتنے خوبصورت مطلب نکالے ہیں۔ تابش کی شاعری میں جدید رنگ و آہنگ کا یہ عالم ہے کہ جس غزل کو بھی پڑھیں اس کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے کیوں کہ ہر غزل بلاشبہ عمدہ شاعری کی مثال ہے۔ یہ اشعار کتنے خوبصورت انداز میں کہے گئے ہیں:

کوئی ٹکرا کے سُبک سر بھی تو ہو سکتا ہے
میری تعمیر میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ باہر ہی نمو ہو میری
میرا کھلنا مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ ہم ہار کے جیتیں تابشؔ
عشق کا کھیل برابر بھی تو ہو سکتا ہے
(رقصِ درویش)

عباس تابش کی اس غزل کے تمام کے تمام اشعار ہی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور تا دیر یاد رہنے والے ہیں۔ ہر شعر نئے انداز میں کہا گیا ہے۔ لگتا ہے کہ تابش نے مسلسل ریاضت سے فنِ غزل گوئی میں مہارت حاصل کی ہے۔ وہ نئے ''پینترے'' مارتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، عباس تابش کی شاعری کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے دور کے بیشتر شعرا مختلف محرکات کے تحت شعر گوئی شروع کر دیتے ہیں اور بعض وجوہ کی بنا پر چند ایک کو پذیرائی بھی مل جاتی ہے مگر جلد ہی اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیتے ہیں کیوں کہ مطالعہ ادب سے بے تعلّق ہوتے ہیں۔ عباس تابش البتہ استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے کلاسیکی اور جدید سرمائے پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس وسعتِ مطالعہ کی وجہ سے فنِ شعر کے تمام اسرار و رموز ان پر روشن ہیں۔ وہ خیالات کو ذاتی طور پر محسوس کر کے شعر کا جامہ پہناتے ہیں اس لیے ان

کی شاعری میں قدیم یا جدید شعرا کے خیالات کی تکرار کہیں موجود نہیں۔ ان کے ہاں انفرادیت اور تازہ کاری جگہ جگہ موجود ہے''(۳۹)۔

احسان دانش کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں ہوا کے دباؤ پر
(احسان دانش)

عباس تابش نے اس قدامت کی بساط ہی الٹ دی ہے۔ تابشؔ کا اسی طرح کا ایک شعر دیکھیے، مکمل نئے انداز سے باندھا گیا ہے۔

مجھے بھی اوروں کی طرح کاغذ ملا ہے لیکن
میں اِس سے ناؤ نہیں سمندر بنا رہا ہوں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

ملتی نہیں ہے ناؤ تو درویش کی طرح
خود میں اُتر کے پار اُتر جانا چاہیے
(رقصِ درویش)

مرتضٰی برلاس، عشق آباد (کلیات) کے فلیپ پر تابش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عباس تابش نے روایت سے پیوند کاری کرتے ہوئے ذائقہ دار پھل اور نئے نئے پھول دریافت کیے اور اس تجربہ سے غزل کی ڈکشن کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی
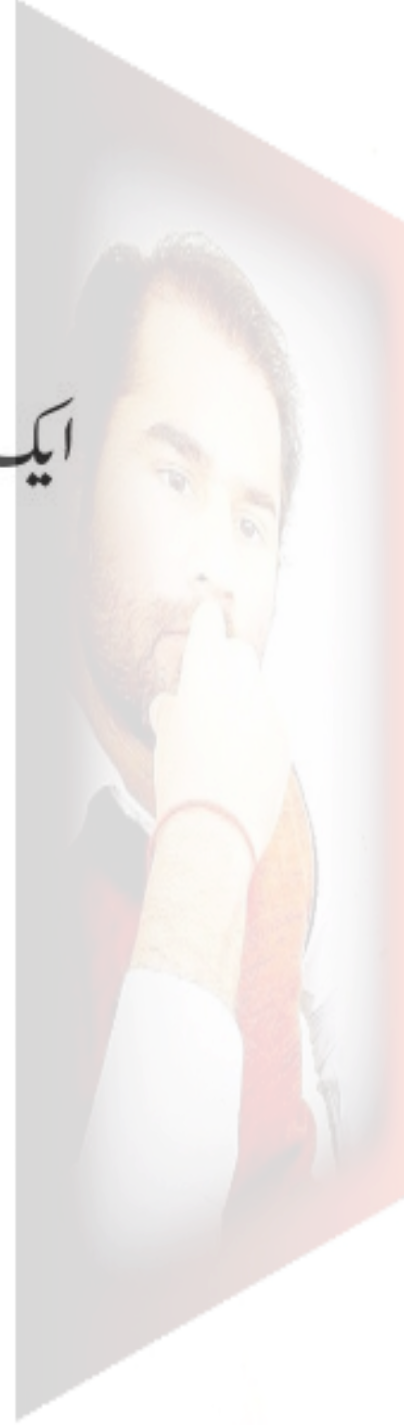
میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔اس لسانی اور موضوعاتی
تجربہ سے اس کو ایک رجحان ساز شاعر کا منصب عطا ہوا
ہے۔ میں پورے اعتماد اور ذمہ داری سے یہ کہتا ہوں کہ
عباس تابش کی غزل ہی عصرِ رواں اور اس سے منسلک
مستقبل کی غزل کہلائے گی''(۴۰)۔

عباس تابش کا جدید رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

اب محبت نہ فسانہ نہ فسوں ہے یوں ہے
صاحبِ دشت تو کہتا تھا کہ یوں ہے یوں ہے

میؔر صاحب ہی نہیں اُس سے پرے بیٹھتے ہیں
جو بھی شائستۂ آدابِ جنوں ہے یوں ہے

نیست میں ہست کا احساس دلاتی ہوئی آنکھ
شور کرتی ہے کہ ہے کن فیکوں ہے یوں ہے
(رقصِ درویش)

عباس تابش کے یہ اشعار جدید رنگ و آہنگ کے آئینہ دار ہیں اُن کی جس غزل کو
بھی چھیڑیں اُسی سے جدیدیت کی خوشبو آنے لگتی ہے۔طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے
نظر آتے ہیں۔تابش نے شبستانِ غزل میں داخلہ لینے کے لیے نئے در وا کیے ہیں۔خالد
احمد ''تمہید'' میں لکھتے ہیں:

''تمہید، یہ مجموعہ کلام غزل پرستوں کے لیے ایک تازہ تر
برگِ سبز کا درجہ رکھتا ہے تو نظم پرستوں کے لیے مستقبل کی
دھند کے پیچھے ایک جھلمل شہر کے بس چکنے کی نوید ہے......
نوجوان نسل کے ان شعرا میں عباس تابش اپنی ہنر آفرینی
کے حوالے سے اپنے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز، ہم
عصروں سے منسلک ہوتے ہوئے بھی منفرد نظر آتا ہے۔
آنکھ بدن کا چراغ ہے اور عباس تابشؔ پاکستانی ادب کے
ہرے بھرے بدن کا تازگی آفریں چراغ ہونے کے
ناطے اِس جسد کا نور ہے''(۴۱)۔

عباس تابش کے اوّلین مجموعہ ''تمہید'' کے اشعار میں اُن کا رنگِ غزل ملاحظہ
کیجیے ۲۵ برس کی عمر کے اس شاعر کی فنی پختہ کاری اور ہنر آفرینی حیرت میں ڈال دیتی ہے:

چاندنی خنداں ہے اپنے حجرۂ مہتاب پر
اور میں نازاں ہوں اس پر میرا گھر مٹی کا ہے
(تمہید)

اُٹھائے پھر رہا ہوں حسرتِ تعمیر کی اینٹیں
جہاں سایہ نہیں ہوتا وہیں دیوار کرتا ہوں
(تمہید)

آبلہ پائی بھی ہوتی ہے مقدر اپنا
سر پہ افلاک کی چادر بھی تنی ہوتی ہے
(تمہید)

نہالِ خشک میں اب تک وہ سوکھا زرد سا پتا
برہنہ لگتا ہے لیکن لباسِ زر میں رہتا ہے
(تمہید)

''تمہید'' میں شامل غزلوں کے یہ خوبصورت اشعار تابشؔ کے جدید رنگِ تغزل کی نمایاں مثال پیش کرتے ہیں۔ ''تمہید'' سے لے کر ''رقصِ درویش'' تک پھیلے ہوئے عباس تابش کے اس شعری سفر میں ہر گام، ہر موڑ پر تازہ کاری دیکھنے میں آئی ہے، کہیں بھی وہ نقطۂ انجماد پر رکے دکھائی نہیں دیے۔ عباس تابش کے تمام مجموعۂ کلام میں تازہ شگوفے ہی کھلے ملتے ہیں، کہیں کوئی پرانی یا دہرائی گئی باتیں نظر نہیں آتیں۔ وہ ہر مصرعے میں نئے پہلو تراشتے ہیں۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کی غزل سے لے کر اب تک کی غزل پر طائرانہ نظر ڈالیں تو عباس تابشؔ جدید اُردو غزل کے منفرد و معتبر شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب ان کا معیارِ غزل، اُن کو معاصرین میں ممتاز کرتا ہے۔

ظفر اقبال کے بعد عباس تابش ہی جدید غزل کے ایک اچھے شاعر قرار پائے ہیں۔ اکیسوی صدی کی غزل کا جب ذکر آئے گا تو عباس تابش کی شاعری کا حوالہ معتبر انداز میں ملے گا مجھے اس کا پورا یقین ہے، کیوں کہ عباس تابش کے کلام میں وہ تمام فنی و فکری عناصر شامل ہیں جو کسی بھی شاعر کو معاصر شعرا میں ممتاز و ممیّز کرتے ہیں۔ تابش کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ اِس لیے تابش نے کہا تھا:

سکوتِ دہر رگوں تک اُتر گیا ہوتا
اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا
(آسمان)

(ج) عباس تابش کی اُردو غزل کا فنی و اسلوبیاتی جائزہ

عباس تابشؔ کی غزل کا اسلوبیاتی جائزہ لیتے ہوئے اسلوب کے پسِ منظر میں کارفرما عوامل اور عناصر کی طرف توجہ مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلوب درحقیقت کسی اہلِ قلم کے اندازِ بیان، طرزِ نگارش، لب ولہجہ اور زبان و بیان کا نام ہے۔ ہر شاعر اپنے فکر و خیالات کے مطابق اپنے قلم سے اشعار نکالتا ہے۔ یہ افکار و تخیلات شاعر کے خارجی و داخلی حالات و واقعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور یہی بات اور طرز بعد میں اُس کے اسلوب کی پہچان بن جاتی ہے۔ بقولِ سیف الدین سیف:

سیفؔ اندازِ بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات ، نئی بات نہیں

اسلوب انگریزی لفظ style کا مترادف ہے جو لاطینی زبان کا لفظ ہے ''لوہے کا قلم'' اس کے لغوی معنی ہیں۔ اسلوب کی وضاحت ڈاکٹر مظفر عباس اپنی کتاب ''اردو کی زندہ داستانیں'' میں مدلل انداز میں کرتے ہیں:

''اسلوب کا انگریزی مترادف style ہے جو بنیادی طور پر لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جہاں لوہے کا قلم اس کے لغوی معنی ہیں۔ اسلوب کی سادہ تعریف کسی شخص کا مخصوص اندازِ بیان یا طرزِ تحریر کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں
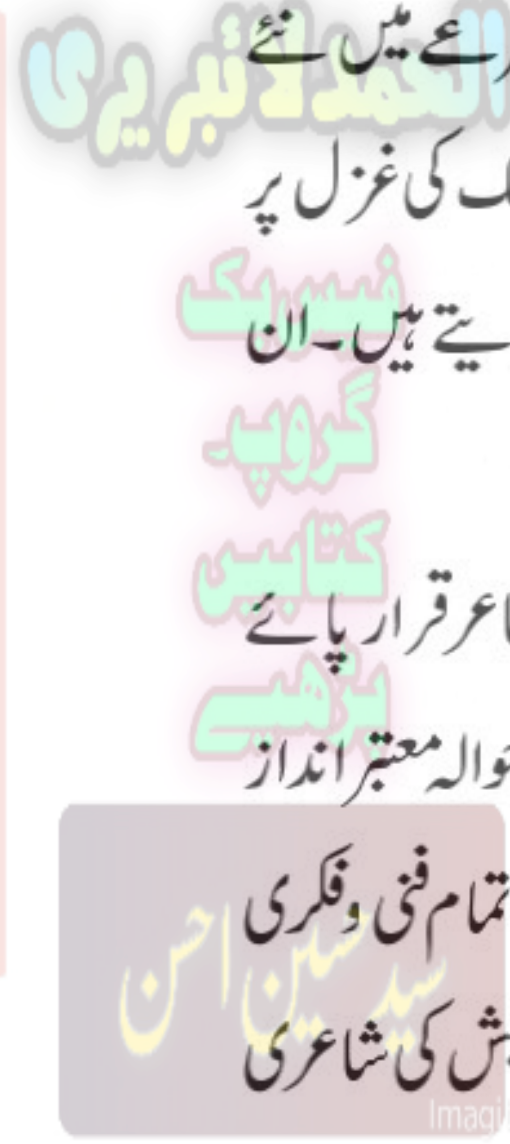
ڈاکٹر Buffan کی اس رائے کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے جو انھوں نے ۱۷۵۰ء میں فرنچ اکیڈمی کے افتتاحی اجلاس میں پیش کی تھی۔ اس رائے کے فرانسیسی الفاظ یہ تھے ''Let style Estt Homme Men'' یعنی اسلوب خود انسان ہے ......یہی تعریف انگریزی میں یوں مستعمل ہے ''Style is the Man Himself''(۴۲)۔

اس طرح بفن کے مطابق اسلوب فنکار ہی کا دوسرا نام ہے۔ کسی صاحبِ اسلوب شاعر کی شاعری پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس کی شاعری ہے۔ غالبؔ کا اپنا انداز ہے، میرؔ، دردؔ، مومنؔ، داغؔ وحسرت کا اپنا اپنا لب ولہجہ ہے۔ اسی طرح عباس تابش کا کلام ان کے نام کے بغیر بھی لکھا ہو تو قوی شک گزرتا ہے کہ لہجہ تو عباس تابش کا ہے۔ تابش ایک ممتاز شاعر ہیں اس لیے اُن کا اندازِ بیان بھی ممتاز وممیّز ہے۔ اُنھوں نے ہجر و ہجرت، درختوں، پرندوں، جھیل، تالاب، ہنس، نقل مکانی، گھر، در، شمشیر، صحرا، چاند، آسمان اور کونج کے پروں کا ذکر عام کیا ہے۔ اُن کی لفاظی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر ہی تابش کے اسلوب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُسلوب کی بابت سید عابد علی عابد اپنی کتاب ''اسلوب'' میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے ......اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں اور اگر آپ اس بات کی مشق کرتے رہیں کہ آیئے بوجھیں یہ شعر یا نثر کا یہ ٹکڑا کس نے لکھا تھا تو آپ بتدریج اتنے مشاق ہو جائیں گے کہ انیسؔ اور دبیرؔ غالب اور ذوقؔ، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے کلام میں امتیاز کر سکیں، یا حالیؔ، سر سید اور غالب کے نثر پاروں میں اُن کی انفرادیت دیکھ سکیں''(۴۳)۔

عباس تابش کی غزل کا مطالعہ کریں تو واضح معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ اُن کا فن اُن کو معاصر غزل گوؤں میں ممتاز وممیّز کرتا ہے۔ اشعار پڑھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اشعار تابش کے ہیں۔ اُن کا لہجہ، اُن کا اندازِ تکلم، اُن کا رنگِ سخن اُن کے محاورات، اُن کی تشبیہات، تراکیب وتلمیحات منفرد ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر ''اسلوب'' سے متعلّق اپنی کتاب ''تنقیدی دبستان'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''اسلوب اندازِ نگارش ہے اور ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کے مطابق تخلیق کاروں کے لسانی شعور کی مناسبت سے اس میں تنوع اور بوقلمونی ملتی ہے''(۴۴)

اسلوب کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی اپنی کتاب ''مقدمہ شعرو شاعری'' میں لکھتے ہیں:

> ''بہر حال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو

ملحوظ رکھیں سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں ۔مگر نا معلوم طور پر رفتہ رفتہ ان کو بڑھاتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں ۔ بلکہ ان کو بھی حقیقی معنوں میں ،کبھی مجازی معنوں میں ،کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرائے میں استعمال کریں‘‘(۴۵)۔

عباش تابش اپنے معاصر شعرا سے الگ و منفرد دکھائی دیتے ہیں۔اُن کا کلام دوسروں سے قدرے مختلف ہے۔وہ روایت سے جڑے ہوئے ضرور ہیں مگر اُن کا لہجہ نیا ہے۔اُن کی غزلیں روایت سے پیوستہ ہوتے ہوئے بھی جدیدت سے لبریز ہیں۔اُن کا رنگ و آہنگ اور طرزِ ادا اکیسویں صدی والے ہیں ۱۸۵۷ء والے نہیں ہیں۔عباس تابش اپنی شاعری میں زور اور حسن تعبیر کی صفات پیدا کر دیتے ہیں۔کسی شاعر کے حسن اسلوب کا اندازہ اُس کے لفظوں کے انتخاب سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس نے الفاظ کس طرح تشکیل دیے ہیں یعنی اشعار میں الفاظ کس طرح برتے ہیں۔لفظوں کے خوبصورت انتخاب کے بغیر اچھا اور عمدہ اسلوب معرض وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی شاعر صاحبِ اسلوب شاعر بنتا ہے۔مختصراً،اُسلوب یہ ہے کہ کوئی اپنی بات کس ڈھنگ سے کہتا ہے۔

اسلوب کا رشتہ الفاظ کی غنایت ،تراکیب و تشبیہات ،محاورات اور ضرب الامثال سے بھی ہوتا ہے چنانچہ عباس تابش کی شاعری و اسلوب کا جائزہ ہم علمِ بیان و بدیع اور مختلف صنعتوں کے تحت لیتے ہیں تا کہ ہمیں اُن کی غزل کے معیار کا اندازہ ہو سکے۔ ہر غزل گو

شاعر اپنے کلام کو خوبصورت اور منفرد بنانے کے لیے مختلف صنعتوں کا استعمال کرتا ہے۔کہیں وہ تشبیہات و استعارات کا سہارا لیتا ہے،کہیں وہ اپنے کلام کو خوبصورت بنانے کے لیے نئی نئی تراکیب و تلمیحات کا استعمال کرتا ہے۔

عباس تابش نے بھی اپنے آپ کو ایک صاحبِ اسلوب شاعر منوانے کے لیے علم بیان کی کئی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔جس سے اُن کے کلام میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔عباس تابش ،تشبیہ،استعارہ،صنائع بدائع ،تکرار لفظی ،صنعتِ تضاد،تجربات،تلمیح،سہل ممتنع، تخلص، فارسی تراکیب (مشکل پسندی)،مفرس شاعری، چھوٹی بڑی بحور،طویل ردیف، ضرب المثل، استفہامیہ لہجہ،جیسی صنعتوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

عباس تابش کی شاعری فنی پختگی ،ندرت خیالی اور مقصدیت کے ساتھ ساتھ منفرد اسلوب کی حامل بھی ہے۔اس سے اُن کے کلام کے حسن میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔آج جہاں اتنے شاعر موجود ہیں ان کی شاعری میں پہچان کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔عمومی و اجتماعی طرز کا لہجہ تو گم ہو کر رہ جاتا ہے لیکن خاص رنگ کا لہجہ اپنی پہچان بنا لیتا ہے۔اگر کلام جداگانہ لذت و سرور کا حامل ہو تو وہ دیگر معاصرین کے کلام سے واضح منفرد لگتا ہے اور اپنی شناخت و اہمیّت میں اضافہ کرتا ہے۔عباس تابش کی شاعری میں ایک الگ اور جداگانہ اندازِ سخن دیکھنے میں آیا ہے۔اُن کا اپنا رنگ ہے اُن کے اپنے ساز ہیں۔اپنی رت ہے، اپنی خزاں ہے،اپنی بہار ہے۔اُن کی شاعری گنگناتی اور بل کھاتی ہوئی ندی کی طرح وادیِ سخن میں مسلسل رواں دواں ہے۔اُن کی شاعری دھنک کی مانند ہے جس کے ساتوں رنگ مختلف ہیں۔اسی جداگانہ رنگ و آہنگ کی بدولت عباس تابش اپنے معاصرین میں واضح طور پر قد آور دکھائی دیتے ہیں۔عباس تابش کی غزل کا رنگ و آہنگ ملاحظہ کیجیے:

زندگی! میں نے ترا بوجھ اُٹھایا ہے بہت
اب ترا سوچ کے تھک جاتے ہیں شانے میرے

میری کوشش تو بہت ہے کہ یہ گھر بچ جائے
اس کی بنیاد میں ہیں دفن خزانے میرے
(رقص درویش)

میں اس لیے بھی پرندوں سے دور بھاگتا ہوں
کہ ان میں رہ کے مرے پر نکلنے لگتے ہیں

عجیب پیڑ ہیں ان کو حیا نہیں آتی
ہمارے سامنے کپڑے بدلنے لگتے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عہدِ موجود میں جہاں ہر طرف جدید غزل کا چرچا ہے اس دور میں جداگانہ اسلوب رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عباس تابش نے مزاحمتی شاعری بھی کی ہے اُنھوں نے اس میں بھی الگ رنگ رکھا ہے۔ انھوں نے سادگی اختیار کی ہے مگر سیدھا سادہ بازاری انداز اختیار نہیں کیا بلکہ کہیں بھی شائستگی اور معیار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تابش نے محبت کے سیدھے سادے معاملات کو خوشگوار اور دل سوز واقعات کی طرح ایک خاص رنگ میں رنگ کر بیان کیا ہے۔ شکیل جاذب، عباس تابش کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمھاری غزل روایت کے رچاؤ اور جدیدیت کی تازگی

سے عبارت ہے۔ تمھاری غزل کا آہنگ ہی نہیں اس کی فضا بھی جداگانہ ہے پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو تمھاری شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے تمھارا شاعری سے رشتہ بھی ایک درخت اور پرندے کا سا لگتا ہے۔ تمھاری شعری فضا میں رچے ہوئے سب اشعار اردو غزل کا سرمایا ہیں'' (۴۶)۔

عباس تابش بلاشبہ ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں ایسا کم شعرا کے ہاں ملتا ہے کہ وہ منفرد اسلوب رکھتے ہوں۔ شعر پڑھتے ہی یہ معلوم پڑتا ہے کہ یہ شعر عباس تابش کا ہے کیوں کہ اُنھوں نے تمام بڑے شعرا کی طرح الگ پہچان بنا رکھی ہے۔ خالد احمد، عباس تابش کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''عباس تابش اپنی طبیعت میں نیاز رکھتے ہوئے بھی ذرا ہٹ دھرم واقع ہوا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک صاحبِ اسلوب فنکار کا ذرا سا ضدی ہونا فطری طور پر ضروری ہوتا ہے کیوں کہ سمجھوتے کا رویہ ایک شاعر کو ''مقبول شاعر'' کے درجے پر تو فائز کرسکتا ہے ''صاحبِ اسلوب شاعر'' ہرگز نہیں بننے دیتا۔ وہ شعرا جو اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ٹھہریں اُن کے معاملے میں سمجھوتا قاری کی طرف سے ہوتا

ہے"(۴۷)۔

ہر خطے، ملک ومعاشرے کا سب سے توانا اور موثر مظہر اس معاشرے کا ادب ہوتا ہے۔ پاکستانی ادب اس لحاظ سے بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے کہ اسے ہر زمانے میں اچھے ادیب ملے ہیں۔ پاکستان کو اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی، منیر نیازی، خالد احمد، ظفر اقبال، خورشید رضوی، مرتضیٰ برلاس، افتخار عارف، شاہین عباس، شاہد ذکی اور اختر عثمان جیسے اہم اور جدید غزل گو شاعر ملے ہیں۔ عباس تابش پاکستانی ادب کی اس بہت بڑی روایتِ فکروفن کا تسلسل نامہ ہیں۔ اُن کے فن کے حوالے سے شکیل جاذب مزید لکھتے ہیں:

"تمہارے شعر لکھنے بیٹھوں تو وہی معاملہ ہو گا جو تمہاری غزلوں کے انتخاب کے وقت ہوا تھا۔ شعر تو حسن ہے اور حسن کی داد تو دی جاسکتی ہے مگر اس کی توجیہہ بیان کرنا "آرائش فردوس بریں" کے مترادف ہے"(۴۸)۔

عباس تابش کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ کہہ کر میرے گھر سے فرشتے چلے گئے
وہ کوئی گھر ہے جس میں پرندوں کا گھر نہ ہو

دیدار چاہتا ہے تہجد گزارِ عشق
یا رب ! قبولیت کی گھڑی تک سحر نہ ہو
(رقصِ درویش)

تشبیہات کا استعمال

روایت سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہر غزل گو شاعر اپنے کلام کو پُرکشش بنانے کے لیے تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعر شعوری طور پر ان اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات غیر شعوری طور پر کرتا ہے عباس تابش نے بھی اپنے اشعار کو خوبصورت بنانے کے لیے تشبیہات کا سہارہ لیا ہے۔ تشبیہ سے مراد ایک شے کو مشترک صفات کی بنا پر کسی دوسری شے کی مانند قرار دینا ہے۔ شبلی نعمانی اپنی کتاب "شعرالعجم" میں تشبیہ کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ فلاں شخص نہایت شجاع اور بہادر ہے تو اگر ان لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے اس بات کو اگر یوں کہیں کہ وہ شخص شیر کی مثل ہے تو تشبیہ ہو گی اور معمولی طریقہ کی نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا"(۴۹)۔

سید عابد علی عابد "البیان" میں اس اصطلاح (تشبیہ) کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"تشبیہ کے معنی ہیں یہ جتانا کہ ایک چیز ایک معنی میں بلا تجرید و بلا استعارہ دوسری چیز کی شریک ہے...... جہاں تک تشبیہ کا تعلّق ہے، وائلڈا نے یہ بات وضاحت سے کہہ دی ہے کہ تشبیہ شعری آرائش کا نمونہ ہے، جس کے ذریعے دو چیزوں کی مشابہتوں کو واضح کیا جاتا ہے"۵۰

عباس تابش نے تشبیہات کا بڑا ہی خوبصورت استعمال کیا ہے۔اس سے اُن کی شاعری میں لطافت اور حسن و تازگی پیدا ہوئی ہے۔اُن کی شاعری عمدہ شاعری کی مثال ہے کیوں کہ اُنھوں نے بڑی جاندار تشبیہات استعمال کی ہیں،تشبیہ کے حوالے سے فیض احمد فیض اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

> ''تشبیہ استعارہ منزل نہیں راستہ ہے اور راستے کی اہمیّت محض منزل کی وجہ سے ہوتی ہے اور اگر ایک منزل ہی اہم نہیں تو اُس کا راستہ بھی نا قابل ہوگا'' (۵۱)۔

عباس تابش کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا تو ''تمہید'' سے لے کر ''رقص درویش'' تک پھیلے ہوئے اس طویل شعری سفر میں تشبیہات کا استعمال دیکھنے میں آیا ہے۔ان تشبیہات سے اُن کے کلام کی خوبصورتی دوبالا ہوگئی ہے۔اشعار ملاحظہ کریں:

وقت لفظوں سے بنائی ہوئی چادر جیسا
اوڑھ لیتا ہوں تو سب خوابِ ہنر لگتا ہے
(آسمان)

میں برگِ خشک ہوں،ٹہنی سے جڑ نہیں سکتا
درخت کیوں مجھے اپنی طرف بُلانے لگے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

پھولوں میں صرف ہونٹ ہیں تاروں میں صرف آنکھ
مشکل یہ ہے کہ اُس کو مکمل کہاں سے لائیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے کئی طرح کی تشبیہات استعمال کی ہیں،اُنھوں نے پیڑ،پرندے،در،شمشیر،جنگل،چاند،دشت،حسرت،بام،ستارہ،فلک،گھر اور آسمان جیسی تشبیہات و استعارے استعمال کیے ہیں۔شہزاد نیئر،عباس تابش کی تشبیہات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''وہ تراکیب،تشبیہ اور استعارے کے باب میں ندرت وجدت کا اظہار کرتے ہیں تاہم تجربہ کرتے ہوئے خیال کی قربانی انھیں منظور نہیں ...... یہ اندازِ تخاطب شعر کی تاثیر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے'' (۵۲)۔

تابش کے یہ اشعار دیکھیں کتنی خوبصورت تشبیہات استعمال کی ہیں:

ہم کہ سوکھے ہوئے پتوں کی طرح ہیں تابش
جانے کس وقت نکل جائیں چمن سے اپنے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ٹوٹ جانے میں کھلونوں کی طرح ہوتا ہے
آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہوتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

پتھر زمیں پہ پھینک کے چھینٹے اُڑاؤں میں
گر مجھ کو تیری جھیل سی آنکھوں کا ڈر نہ ہو
(رقص درویش)

چاہیے پرورش مجھے نخلِ بزرگ کی طرح
دشت کے سب پرندگاں میرے لیے دعا کرو

استعارے کا استعمال

عباس تابشؔ نے اپنے کلام میں جابجا تشبیہات و استعارات برتتے ہیں۔ جس طرح انھوں نے ایک چیز کی صفات کی مانند دوسری چیز کا استعمال کر کے تشبیہ دی ہے اسی طرح معانی و مفہوم بیان کرنے کے لیے اُنھوں نے الفاظ اُدھار لے کر ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کا سہارہ لیا ہے۔ شعری اصطلاح یا علمِ بیان میں جب کوئی لفظ کسی صفت یا خوبی کی بنا پر اُدھار لیا جائے اور وہ لفظ اپنے مجازی معنی ظاہر کرے، استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ استعارے کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلّق ہوتا ہے۔ اصطلاح میں استعارے کی تعریف کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز سے منسوب کرنا ہوتی ہے۔ سید عابد علی عابد اپنی کتاب ''البیان'' میں استعارے کے متعلّق یوں لکھتے ہیں:

> ''شاعر پرانے تلازمات کے بندھن توڑ دیتا ہے اور نئے تعلقات دکھا کر ہمارے تجربے کو تازگی، صورت پذیری اور تیز بینی عطا کرتا ہے دراصل استعارے کا تعلّق اشیا کو پرانی جیسی خوبصورتی ہی عطا نہیں کرتا بلکہ انہیں ہماری امیدوں، رشتوں اور روایتوں کو مضبوط کر کے زندگی عطا کرتا ہے''(۵۳)۔

تابشؔ نے اپنے اشعار میں خوبصورت لفظ بطور استعارے استعمال کیے ہیں۔ پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو عباس تابشؔ کی شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے۔ شکیل جاذب، عشق آباد (کلیات) کے دیباچے میں عباس تابشؔ کی شاعری میں استعاروں کے استعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تمہاری غزل روایت کے رچاؤ اور جدیدیت کی تازگی سے عبارت ہے تمہاری غزل کا آہنگ ہی نہیں اس کی فضا بھی جداگانہ ہے۔ پرندوں، درختوں، چاند، دشت اور ہجرت کو تمہاری شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے کبھی کبھی تو مجھے تمہارا شاعری سے رشتہ بھی ایک درخت اور پرندے کا سا لگتا ہے''(۵۴)۔

عباس تابشؔ کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

شجر سمجھ کر مرا احترام کرتے ہیں
پرندے رات کو مجھ میں قیام کرتے ہیں
(رقصِ درویش)

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مرجاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مرجاتے ہیں

اُن کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں وُہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابشؔ
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)
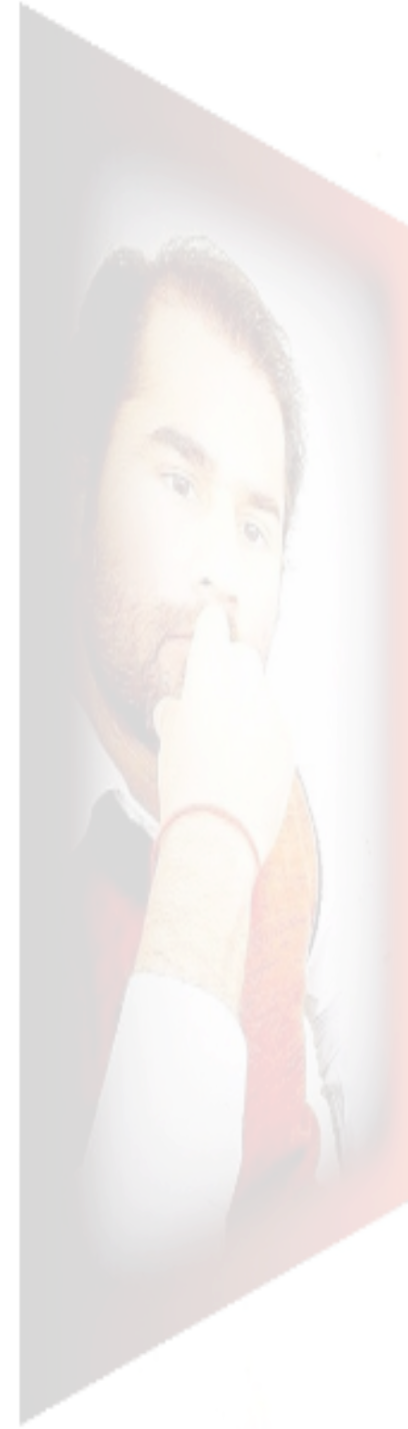
ایسے تو کوئی ترکِ سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا
(رقصِ درویش)

اندر کو بہتی آنکھ سے کٹتا تو میں بھی ہوں
دریا کو کیا بتاؤں کہ دریا تو میں بھی ہوں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش کے ان اشعار میں استعاروں کا خوب صورت استعمال ہوا ہے۔ وہ کوئی بات اشعاروں کنایوں میں بھی کریں تو اس میں بھی ایک ابلاغ کی صورت نکل آتی ہے۔ عباس تابش بڑے باکمال شاعر ہیں اُنھوں نے شجر اور پرندوں کے استعارے جابجا استعمال کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان دکھ دیتے ہیں، لالچ اور حرص وہوس میں مبتلا ہو گئے ہیں جب کہ پرندے ان باتوں سے دور رہتے ہیں اس لیے مجھے پرندے پسند ہیں۔ وہ پرندوں سے ایک خاص استعارے کا کام لیتے ہیں۔ ایک اور شعر میں وہ کہتے ہیں کہ بے وجہ کوئی آدمی نقل مکانی نہیں کرتا اگر حاکمِ وقت کی بات ماننے سے انکار کر دیں تو پھر ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ شاعر کو پیڑ بے حد پسند ہیں، وہ کہتے ہیں پیڑ بے وفائی نہیں کرتے ہمیشہ سایہ فراہم کرتے ہیں جب کہ آدمی بے وفا ہوتے ہیں۔ تابش کے مزید اشعار ملاحظہ کیجیے، ان میں استعارات کا استعمال عام ملتا ہے:

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مسئلۂ عشق کے طے کرتا ہے شمشیر کے ساتھ
اور نسبت وہ بتاتا ہے غمِ میر کے ساتھ
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اک قدم تیغ پہ اور ایک شرر پر رکھا
میری وحشت نے مجھے رقصِ دگر پر رکھا
(رقصِ درویش)

عباس تابش نے اپنی غزلوں میں جابجا خوبصورت و دلکش استعارے استعمال کیے ہیں۔ اُنھوں نے ان استعاروں کے ذریعے اپنے کلام میں کمال مہارت سے حسن پیدا کر دیا ہے۔ انھوں نے استعارات کے لیے اچھے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ تتلیوں جیسی دوپہر ہے نہ اب وہ سورج گلاب جیسا
جسے محبت کہا گیا وہ مغالطہ ختم ہو گیا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

ان کے بچوں کو خدا سانپ سے محفوظ رکھے
دن میں ہوتے ہیں پرندوں کے ٹھکانے خالی
(رقصِ درویش)

گھر میں اک تصویر جنگل کی بھی ہے
رابطہ رہتا ہے ویرانی کے ساتھ
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کا استعارتی نظام بھی اُن کے تشبیہاتی نظام کی طرح کافی مضبوط اور

توانا ہے۔ انھوں نے کئی الفاظ سے استعاروں کا فائدہ اٹھایا ہے۔ عباس تابش نے سایہ، دھوپ، گلاب، چاند، قفس، ہنس، پرندے، درخت، کاجل، بادل اور پھول کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ اُن کے دوسرے شعری مجموعہ کا نام ''آسمان'' ہے اور آسمان نارسائی کا استعارہ ہے۔ اس سے عمدہ مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ اس بات کی وضاحت عباس تابش اپنے شعری مجموعے ''آسمان'' کے پیشِ لفظ میں ''سخن سرائے سے ایک خط'' کے نام سے لکھے ایک مضمون میں یوں کرتے ہیں:

''تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے جب اپنی نئی کتاب کا نام ''آسمان'' تجویز کیا تو تم نے کہا ''تمہید'' کے بعد ''آسمان'' کیوں؟ آسمان تمہارا نام تھا جو میں نے کتاب کو دے دیا۔ آسمان کی طرف دیکھنا یعنی تمہاری طرف دیکھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں تمہارے لیے بہت سا سفر طے کر چکا ہوں لیکن تم ابھی تک تغافل کی بلندی پر ہو چلے آؤ کہ میں نے نئے مکان میں در انتظار رکھ دیا ہے''(۵۵)۔

جس شاعر کے شعری مجموعے کے نام ہی میں استعارے کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہو۔ اُس کا استعاراتی نظام بلاشبہ خوبصورت ہوگا۔ عباس تابش نے متعدد استعارے استعمال کیے ہیں، یہی استعارے اُن کو صاحبِ اسلوب اور منفرد شاعر بناتے ہیں۔ اُنھوں نے استعاروں کے ذریعے اپنی زندگی، اپنی ذات اور معاشرے کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ عباس تابش کے کلام میں تشبیہ واستعارے کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔

تلمیحات کا استعمال

عباس تابش نے تشبیہات و استعارات کی طرح تلمیحات کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے اسلامی و تاریخی واقعات کو اپنے اشعار میں پیش کر کے شاعری کو بامقصد بنا دیا ہے۔ اُن کے اشعار پڑھ کر اُن کے مشاہدات و تجربات کا اندازہ ہوتا ہے۔ عباس تابش کی غزلوں میں شامل تلمیحات کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

آتشِ نمرود میں بھی کِھل رہے تھے تازہ پھول
اور میں بھی رقص کی حالت میں تھا مشکل کے وقت

(رقصِ درویش)

اُس کو مدت سے کوئی قیس نہیں ملتا تھا
میری دہلیز پہ صحرا کو ضرورت لائی

(رقصِ درویش)

تیرا اُس کے ماننے والوں سے پالا پڑ گیا
جو پرندے بھیج کر لشکر کے لشکر مار دے

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

گزر رہے ہیں مرے دن اِسی تفاخر میں
کہ اگلا قیس مرے خاندان سے ہو گا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے ان اشعار میں اسلامی و تاریخی واقعات نہایت اچھوتے اور نئے انداز میں پیش کیے ہیں یوں لگتا ہے کہ یہ واقعات صرف انھی نے محسوس کیے ہیں۔ اُنھوں نے خدائی کا دعویٰ کرنے والے نمرود کا حضرت ابراہیم کو آگ میں پھینکنے کے واقعے

کی کس طرح ترجمانی کی ہے۔ دوسرے اشعار میں اُنھوں نے مجنوں اور فرہاد کا ذکر کیا ہے، مجنوں جس کا اصل نام قیس تھا لیلیٰ کے عشق میں جنون کی حد تک پہنچ گیا تو اسے مجنوں کا نام مل گیا۔ تابش نے عشق کے سردار کو اپنے قبیلے کا فرد کہتے ہیں اور اس لیے خود پر فخر کرتے ہیں۔ اس طرح کے مزید اشعار دیکھیے جن میں تلمیحات کا استعمال کیا گیا ہے:

کیا طرفہ لوگ ہیں یہ ترے قیس و کوہکن
حالت کوئی نہیں ہے مگر خیریت سے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

قیس و فرہاد کو لے بیٹھی ہے دنیا تابشؔ
یہ نہیں سوچتی ہم نے بھی محبت کی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مجھ ایسے کوہ کن کو رفتگاں کا رنج ہے تابشؔ
میں پتھر کاٹ کر نہریں نہیں کتبے بناتا ہوں
(رقصِ درویش)

عباس تابش نے خیالات و واقعات سے غزل کے دامن کو کافی حد تک وسیع کر دیا ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے تمام مسائل کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ درج بالا اشعار میں اُنھوں نے تاریخی واقعات کو کیسے حوالۂ شعر کیا ہے اور آتش نمرود، قیس و فرہاد اور کوہ کن جیسے الفاظ کو اپنے اشعار میں استعمال کر کے شعر کو با معنی بنا دیا ہے۔ کلاسیکی شعرا کی طرح عباس تابشؔ نے بھی صنائع بدائع کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے جدید اُردو غزل کا دامن ان شعری محاسن سے عمدہ و دلآویز بنا دیا ہے۔ لگتا ہے کہ تابشؔ نے حیات و کائنات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے اُن کی تلمیحات زندگی اور تاریخی واقعات سے لبریز ہیں۔

تغزل اور موسیقیت

عباس تابش نے شعوری اور غیر شعوری طور پر شاعری کی کئی صنعتوں کو اپنے اشعار میں استعمال کر کے ایک خوبصورت تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے کلام میں فصاحت و بلاغت پیدا کر دی ہے۔ عباس تابش نے کئی غزلیں بڑی مترنم کہی ہیں کیوں کہ تابشؔ اچھا 'گا' بھی لیتے ہیں شاید وہ گنگناتے ہوئے شعر کہتے ہیں۔ اِسی لیے اُن کی غزلوں میں موسیقیت رچی ہوئی ہے۔ عباس تابش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تکرار لفظی کا استعمال بڑا عمدہ طریقے سے کرتے ہیں جس سے شعر میں موسیقی و غنائی بڑھ جاتی ہے۔ اس حوالے سے شہزاد نیئر ''بیاض'' میں لکھتے ہیں:

''تابشؔ کی شاعری موسیقیت سے لبریز ہے۔ الفاظ کے صوتی آہنگ کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے وہ کچھ ایسے ڈھنگ سے مصرع تراشتے ہیں کہ مصرع خود لبوں پر گنگنانے لگتا ہے وہ رواں بحور اور سہل زمینوں کے استعمال سے شعر کو گداز اور دلنشیں بناتے ہیں'' (۵۶)۔

عباس تابش کے چند مترنم اشعار کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

زمانے ہو گئے ہیں جمع کرتے
اب اتنی رائیگانی کیا کروں میں
(رقصِ درویش)

ہر چند تری یاد جنوں خیز بہت ہے
میں جاگ رہا ہوں کہ ہوا تیز بہت ہے

پلکوں پہ کوئی پھول نہیں ہے تو عجب کیا
کہنے کو تو مٹی مری زرخیز بہت ہے
(تمہید)

چمکے گا شجر پر نہ مرے گھر میں رہے گا
وہ چاند ہے اور چاند سمندر میں رہے گا

آئے ہیں تو ستا کے چلے جائیں گے پنچھی
وُہ پیڑ اسی طرح اسی گھر میں رہے گا
(آسمان)

تغزل اور موسیقیت غزل کی جان ہوتی ہے۔اس کو شاعری میں بنیادی اور خاص اہمیّت حاصل ہے۔اگر خیال گہرا اور فنی پختگی سے لبریز ہو تو غزل ایک اچھی غزل کہلاتی ہے لیکن اگر اس میں موسیقیت اور غنائیت شامل ہو جائے تو غزل کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔تغزل عاشق و معشوق کے درمیان پائے جانے والے خوب صورت معاملات کا نام ہے۔تغزل میں اُلفت کے خاص عناصر شامل ہوتے ہیں۔تغزل سے غزل میں چاشنی اور مٹھاس ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ رومانیت کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔تغزل، غزل کو دلفریب اور دلکش بناتا ہے۔

عباس تابش کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ تغزل، موسیقیت اور غنائیت اُن کی شاعری کا خاص عضو ہے۔اُن کی چھوٹی بحر کی غزلیں ہوں یا بڑی بحر کی، تمام غزلوں میں ایک خاص رنگِ تغزل، ردھم اور لے نظر آتی ہے۔عباس تابش کی غزل با آسانی گنگنائی جاسکتی ہے۔ان اشعار میں تغزل و موسیقی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔یہ

اشعار ملاحظہ کیجیے:

عجیب حسرتِ پرواز مجھ میں ہوتی تھی
میں کاپیوں میں پرندے بنایا کرتا تھا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

محبتوں میں تو شجر کا بھی نہیں مذکور
تو چاہتا ہے کہ مسلک پہ گفتگو کی جائے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

تیز رفتاریٔ دنیا کہاں مہلت دے گی
ہم سرِ گرمیِ بازار ملے ہیں تجھ سے

تیرے ملنے سے انہیں روک سکا ہے کوئی
ملنے والے تو سرِ دار ملے ہیں تجھ سے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

تکرارِ لفظی سے صوتی حُسن کا اہتمام

صنعتِ تکرار علمِ بدیع کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی ایک لفظ کو زیادہ بار دہرایا جاتا ہے اس سے شعر میں موسیقی، غنائیت، روانی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ثوبیہ جمال کی کتاب ''سلیم احمد صدیقی (حیات اور ادبی خدمات)'' میں اس صنعت کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

''صنعتِ تکرار سے مراد ہے کہ ایک ہی شعر میں ایک

لفظ دو یا دو سے زائد مرتبہ آئے۔ اسے صنعتِ تکرار کہتے
ہیں اس سے شعر میں ترنم اور غنائیت میں اضافہ ہوتا ہے
اور شعر میں ایک بہاؤ اور روانی کا احساس ہوتا
ہے''(۵۷)۔

عباس تابش نے مختلف تجربات کر کے شاعری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا ہے وہ تکرار لفظی بڑی فنی مہارت کے ساتھ کرتے ہیں ان کے اشعار میں جابجا تکرار لفظی کی عمدہ مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں:

یہ ہم کو عشق غلط فہمیوں میں ڈال گیا
وگرنہ میں ہوں ضروری نہ تو ضروری ہے
(رقص درویش)

سنو تم آخرِ شب گفتگو درختوں کی
یہ کم کلام بھی کیا کیا کلام کرتے ہیں
(رقص درویش)

وہ آئے اور کوئی دل کی بات ہو اُس سے
اک انتظار پسِ انتظار کھینچتے ہیں
(تمہید)

عباس تابش نے ان اشعار میں تکرار لفظی کا کس قدر دلنشیں استعمال کیا ہے۔ اُن کے اس تکرار لفظی سے اشعار کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ وہ آبلہ پائی کو کیسے مکرر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ان اشعار میں گھر، انتظار اور کبھی کبھی کو کتنے خوب صورت انداز میں اشعار میں برتا ہے۔ اس لیے اُن کے کلام میں مترنم پہلو موجود ہیں کیوں کہ اُنھوں نے تکرارِ لفظی کا

استعمال کیا ہے۔ عباس تابش کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوفہ و شام مراحل ہیں گزر جائیں گے
یہ مدینے سے مدینے کا سفر لگتا ہے

کوئی گٹھڑی تو نہیں ہے کہ اُٹھا کر چل دوں
شہر کا شہر مجھے رختِ سفر لگتا ہے
(رقص درویش)

اب پرندوں کی یہاں نقل مکانی کم ہے
ہم ہیں جس جھیل میں اُس جھیل میں پانی کم ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

میں تخت نہیں چھوڑا میاں اپنی خوشی سے
دربار جو رہتا تو میں دربار میں رہتا
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

وہ چاند ہو کہ چاند سا چہرہ، کوئی تو ہو
ان کھڑکیوں کے پار تماشا کوئی تو ہو
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

آنکھ پہ پٹی باندھ کے مجھ کو تنہا چھوڑ دیا ہے
یہ کس نے صحرا میں لا کے صحرا چھوڑ دیا ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں متعدد صنعتوں اور موضوعات کا

استعمال دیکھنے میں ملتا ہے۔ان اشعار میں اُنھوں نے پرندے، گھر، جھیل، دربار، چانداور صحرا جیسے لفظوں کو شعر میں دہرایا ہے۔اس سے اُن کے کلام میں موسیقیت اور غنائیت بڑھ گئی ہے۔اُن کے کلام میں مترنم پہلو اس لیے بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں کیوں کہ وہ گنگناتے رہتے ہیں۔عباس تابش کے ان اشعار میں صنعتِ تکرار کا استعمال ملاحظہ کریں:

شک سا ہوتا ہے ہر اک پہ کہ کہیں تو ہی نہ ہو
اب ترے نام سے کس کس کو پکارا جائے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

تجھ جیسا ہر طرف نظر آنا تو ہے نہیں
دل آئینہ ہے آئینہ خانہ تو ہے نہیں
(رقصِ درویش)

کہیں لالی بھری تھالی نہ گر جائے سمندر میں
چلا ہے شام کا سورج کہاں آہستہ آہستہ
(تمہید)

عباس تابش نے کمال مہارت سے شعروں میں تکرار لفظی کا استعمال کیا ہے۔ کہیں وہ مصرعے کے شروع میں تو کہیں درمیان و آخر میں لفظوں کی تکرار کرتے ہیں۔ اُنھوں نے قافیے، ردیف میں بھی بکثرت تکرار لفظی برتی ہے، یہ اُن کی فنی پختگی کی علامت ہے۔اُنھوں نے شاعری میں کئی کامیاب تجربے کیے ہیں۔

صنعتِ تضاد کا استعمال

عباس تابش نے کلام میں صنعتِ تضاد کا بھی بھر پور استعمال کیا ہے۔شاعری میں جہاں دو الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہوں اسے صنعتِ تضاد کہتے ہیں۔دوسری صورت

میں یوں کہہ لیں کہ اشعار کے مصرعوں میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں ایسی کرشمہ سازی علم بدیع میں صنعتِ تضاد کہلاتی ہے۔عباس تابش کے ہاں اس صنعت کا کثرت سے استعمال ملتا ہے۔اُنھوں نے کمال مہارت اور فنی پختگی سے اپنے اشعار میں متضاد الفاظ کا استعمال کیا ہے، دوسرے جدید غزل گو شعرا میں اس صنعت کا رنگ کم نظر آتا ہے۔عباس تابش کی شاعری میں صنعتِ تضاد کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

اگر کبھی مجھے موجودگاں سے فرصت ہو
تو رفتگاں مری نیندیں حرام کرتے ہیں
(رقصِ درویش)

میں اُجڑتا ہوں تمھیں آباد رکھنے کے لیے
تم سمجھتے ہو کہ اس میں فائدہ میرا بھی ہے
(رقصِ درویش)

مری طرح سے اُجڑ کے بسائیں شہرِ سخن
جو نقل کرنی ہے میری تو ہو بہو کی جائے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عشق کی جوت جگانے میں بڑی دیر لگی
سائے سے دھوپ بنانے میں بڑی دیر لگی
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر طرح کا شعر کہہ لیتے ہیں، اُنھوں نے کم وبیش تمام صنعتوں کا استعمال کیا ہے، کہیں یہ استعمال شعوری طور پر تو کہیں غیر شعوری طور پر نظر آتا ہے۔اس سے اُن کے کلام میں خاص طرز کی انفرادیت پیدا ہوگئی ہے۔ایک لفظ کے مقابل

دوسرے لفظ کے استعمال سے شعر کی بنت اور شعریت میں اضافہ ہوا ہے۔ صنعتِ تضاد کے کچھ اور نمونے ملاحظہ کیجیے:

سچ مچ ہمارے دل کو کوئی رنج کھا گیا
جھوٹے سخن بنائے نہیں میرؔ کی قسم
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

پیچھے ہٹتا ہوں تو دنیا نہیں جینے دیتی
آگے بڑھتا ہوں تو بنتی نہیں تقدیر کے ساتھ
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

یہی بات عباس تابش کی مقبولیت میں اضافہ کرتی ہے کہ اُنھوں نے صنعتِ تضاد کا خوبصورت استعمال اپنے اشعار میں کر دیا ہے۔ اس صنعت سے اُن کے کلام کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔ اس طرح کا استعمال اُن کے معاصرین میں خال خال دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے وہ معاصرین میں ممتاز حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ تابشؔ بڑے باکمال شاعر ہیں، اُنھوں نے غزل میں نئے نئے تجربات کیے ہیں۔ اُنھوں نے موجودگاں و رفتگاں، سکوت و ہجرت، ہار و جیت، اندر و باہر، ملنا و بچھڑنا، اجڑنا و بسنا، سچ و جھوٹ، گمنام و نام، دھوپ و سایہ، پیچھے و آگے، کم و بیش، سونا و جاگنا، زیست و موت، سمیت کئی متضاد الفاظ اپنے اشعار میں استعمال کیے ہیں، یہ اُن کی فنی مہارت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ مصرع میں متضاد الفاظ استعمال کرنا اُن کا اسلوب ہے۔ یہی بات ان کو عہدِ رواں کا ایک اہم شاعر بناتی ہے۔

سہلِ ممتنع

تابش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو دیکھنے میں آتا ہے کہ اُنھوں نے سادہ زبان بھی استعمال کی ہے۔ اُن کی شاعری سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ اُن کا کلام پڑھ کر قاری کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا بلکہ آسانی کے ساتھ شعر فہمی حاصل کر لیتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی کتاب ''تفہیم وتحسین شعر'' میں سہلِ ممتنع کی تعریف یوں ملتی ہے:

''لغت میں سہل آسان کے معنی میں اور ممتنع دشوار کے معنی میں اصطلاح میں ایسے شعر کو کہتے ہیں جس کی مثال بنانا دشوار ہو، اگر چہ بظاہر سہل معلوم ہوتا ہو'' (۵۸)۔

بے ساختگی سے نکلنے والے اشعار بھی سہلِ ممتنع کی ایک بہترین مثال ہیں۔ عباس تابش کے کلام میں گہرائی موجود ہے لیکن اشعار سیدھے سادے انداز میں کہے گئے ہیں۔ اُن کی شاعری پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے اور قاری ایک عرصہ اس سحر کے حصار سے نکل نہیں پاتا۔ اُنھوں نے جھوٹ، بناوٹ اور بے جا تصنع و نمائش کا استعمال نہیں کیا ہے۔ اُن کی زبان و بیان میں سلاست روی کا جوہر کارفرما ہے، اُن کے انداز میں شائستگی و سادگی ہے۔ اُن کے اس انداز سے کلام میں روانی و ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ عباس تابش کے اشعار کی ایک جھلک دیکھیے جس میں سہلِ ممتنع کا استعمال عام ہوا ہے۔

عباس تابش کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ابھی سے ترکِ تعلّق کی بات کرتے ہو
یہ فیصلے تو میاں ایک دم نہیں ہوتے
(رقصِ درویش)

آپ کو کون تماشائی سمجھتا ہے یہاں
آپ تو آگ لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں
(رقصِ درویش)

اسی لیے مرا سایہ مجھے گوارا نہیں
یہ میرا دوست ہے لیکن مرا سہارا نہیں
(آسمان)

عباس تابش کے شعری اسلوب کا یہ وصفِ خاص ہے کہ وہ آسان فہم ہے۔ انھوں نے ان اشعار میں بڑی گہری گہری باتیں کی ہیں لیکن اندازِ تکلم بالکل سادہ و سہل معلوم ہوتا ہے۔ عباس تابش کے کلام سے عام قاری بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ وہ درج بالا شعر میں کہتے ہیں کہ میرا سایہ تنہائی میں مجھے ساتھ تو فراہم کرتا ہے لیکن مجھے کوئی سہارا نہیں دیتا۔ مجھے اس کی دوستی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ عباس تابش کے مزید اشعار ملاحظہ کیجیے:

بیٹھتا اٹھتا تھا میں یاروں کے بیچ
ہو گیا دیوار ، دیواروں کے بیچ

وہ جو میرے گھر میں ہوتا تھا کبھی
اب وہ سناٹا ہے بازاروں کے بیچ
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

کیسے کہوں کہ اپنی زباں بولتے ہیں ہم
الفاظ لاکھ اپنے ہوں لہجہ کسی کا ہے
(آسمان)

میرے آنسو میرے اندر ہی گرے
رونے سے جی اور بوجھل ہو گیا
(آسمان)

پرندے بھی اگر مل بیٹھتے ہیں
یہی لگتا ہے کہ سازش ہو رہی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اِن اشعار کو پڑھ کر لگتا ہے کہ عباس تابش ایسے فنکار ہیں جو پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو بھی بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اسی خوبی کی بنا پر وہ دوسرے معاصرین میں اہم شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ عباس تابش کے درج بالا اشعار بظاہر تو سادہ اور آسان دکھائی دیتے ہیں لیکن ان میں جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ قطعی طور پر سطحی نہیں ہیں۔ ان میں مقصدیت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے کمال فنی مہارت سے اپنی شاعری میں سہل ممتنع کی صنعت کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔

مفرس شاعری وتراکیب سازی

عباس تابش مشکل پسندی اور بے جالفظی بازی گری میں نہیں پڑنا چاہتے وہ اپنا مدعا سیدھے سادے روزمرہ کے الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔ جس سے عام قاری بھی اُن کا کلام پڑھ کر لطف اندوز ہو جاتا ہے۔ مگر عباس تابش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اُن کی بعض غزلوں میں مشکل پسندی بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اُنھوں نے کثرت کے ساتھ فارسی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اردو غزل گو شاعر شروع ہی سے غزل میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کرتے آئے ہیں کیوں کہ غزل پہلے پہل فارسی میں کہی جاتی رہی، غالب و اقبال سمیت تمام شعرا نے فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ غالب و اقبال کا فارسی کلام

بہترین شاعری کی مثال ہے۔مفرس شاعری کا سلسلہ تو غالب سے بھی پہلے کا ہے۔اسی سلسلے کوعباس تابش نے بھی قائم رکھا ہے۔عباس تابش کی غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

پسِ گریہ کوئی دیتا ہے تسلی مجھ کو
یہ جوائے دل تجھے بے وجہ سکوں ہے یوں ہے
(رقص درویش)

اس عہدِ بے خمار میں بادل کہاں سے لائیں
بازارِ چشم بند ہے کاجل کہاں سے لائیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

کنجِ غزل نہ قیس کا ویرانہ چاہیے
جو غم مجھے ہے اس کو عزاخانہ چاہیے
(رقص،درویش)

عباس تابشؔ چوں کہ روایت سے جڑے ہوئے جدید لہجے کے شاعر ہیں اس لیے اُن کے کلام میں بھی فارسی الفاظ کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔اُنھوں نے فارسی وعربی کی خوبصورت تراکیب استعمال کی ہیں جس کی بدولت اُن کی غزل میں پختگی اور ایک معیار پیدا ہوا ہے۔ہر شاعر کلام میں حسن اور ایجاز واختصار پیدا کرنے کے لیے تراکیب کا استعمال کرتا ہے۔عباس تابش کا حسنِ تراکیب دلکش ومنفرد ہے۔شعر میں حسن تراکیب اور ترکیب تراشی کے حوالے سے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اپنی کتاب ''تفہیم وتحسین شعر'' میں رقمطراز ہیں:

''کوئی بھی زبان اپنے مفرد لغات کے اعتبار سے اتنی ثروت مند نہیں ہوتی کہ حسن اظہار کے نت نئے جلوے دکھا سکے۔فنکارانہ اظہار و بیان کے لیے مرکبات سے

کام لیا جاتا ہے اور ترکیب سازی کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔چنانچہ کسی شاعر کی عظمت کا انحصار دیگر اوصاف کے علاوہ اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ اس نے کتنی اور کیسی تراکیب تراشیں'' (۵۹)۔

حافظ،نظیری، غالب اور اقبال کی طرح عباس تابش نے بھی عربی و فارسی میں خوبصورت تراکیب تراشی کی ہے۔جدید اردو شاعری میں تابشؔ نے روایت کو برقرار رکھا ہوا ہے مگر ان کا اندازِ تکلم نیا ہے۔اس تراکیب تراشی سے تابشؔ کے کلام میں وسعت وعلمیت پیدا ہوئی ہے اور زبان اردو کا دامن حسنِ تراکیب سے مزید بھر گیا ہے۔عباس تابش کے اشعار میں فارسی وعربی کا حسن اور ندرت ملاحظہ کیجیے:

قریۂ چشم میں گونجا پانی
لوگ سمجھے کوئی دریا آیا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اک آدھ بار تو نے کرم کر دیا اے دوست
اب ہم یہ رزقِ رنج کہاں سے لائیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

تھکن سے مے کشیدنے کا اہتمام کر لیا
گدا نے اپنے کاسۂ تہی کو جام کر لیا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

لفظوں سے چھاؤں وضع کی،سطروں کو سائباں کیا
جیسے بھی ہو سکا بسر وقتِ زوالِ جاں کیا

دشتِ جنوں و کوہ ارادہ اُٹھا لیا
سنبھلے گا کیسے بوجھ تو اتنا اٹھا لیا
(آسمان)

عباس تابش کے شعری مجموعے کا نام ''رقصِ درویش'' بھی ایک خوبصورت ترکیب ہے۔اس شعری مجموعہ میں سے ایک غزل ملاحظہ کیجیے جس کے زیادہ تر اشعار میں عمدہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں:

تو اشک دل پہ گراتے جگر لہو لہو کرتے
درونِ جسم سہی کوششِ نمو کرتے

تمہارے مصرعۂ لب کو تو کیا پہنچتے ہم
کچھ اپنے ڈھب سے ہی کہنے کی جستجو کرتے

مگر یہ کاغذِ خالی تو ہم کو صحرا تھا
لکیر کھینچتے اور اُس کو آبجو کرتے
(رقصِ درویش)

عباس تابش کی ترکیب سازی کے حوالے سے ڈاکٹر طاہر تونسوی ''بیاض'' میں لکھتے ہیں:

''عباس تابش کے تخلیقی اظہار کا ایک وصفِ خاص ترکیب سازی ہے۔اُردو شاعری میں غالب اور اقبال کمال ترکیب ساز شاعر ہیں فیض نے بھی ان دونوں کی

روایت کو گہرا کیا ہے نوجوان شعرا کے ہاں اس خوبی کا کمال بڑے فنکارانہ انداز میں موجود ہے اور اسی میں عباس تابش نے اپنا کام دکھایا ہے اس کی خصوصیّت ہے کہ اس نے محض جدت کے شوق میں تراکیب نہیں بنائیں بلکہ انہیں معنی و مفاہیم کی ترسیل کا ایک ذریعہ بھی بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں اور آئی ہوئی ترکیبیں نہ صرف حسنِ بیان میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ غزل کی جگمگاہٹوں کو رنگ و نور کے جگنو عطا کرتی ہیں''(۶۰)۔

عباس تابش ایک باکمال شاعر ہیں۔اُن کی اس ترکیب سازی نے بڑے بڑوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔اُنھوں نے غالب، اقبال اور فیض کی روایت کو گہرا کرنے کی خوب کوشش کی ہے۔اُنھوں نے اپنے اولین شعری مجموعۂ کلام ''تمہید'' ہی میں خوبصورت تراکیب باندھی ہیں۔''تمہید'' کی ایک غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

کون سی منزل پہ آ کر رک گئے اپنے قدم
کارواں پیچھے ہے گردِ کارواں ہے سامنے

بادبانوں کی طرح کھلنے لگے ہیں پیرہن
آئینۂ خانہ ہے یا آبِ رواں ہے سامنے

ویسے تو اس بت کے گھر کا فاصلہ اتنا نہیں
دو قدم چلیے تو مرگِ ناگہاں ہے سامنے

دیکھیے کب تیشہ زن ہوتے ہیں اپنے آپ پر
تابشؔ اپنی ذات کا کوہِ گراں ہے سامنے
(تمہید)

بلاشبہ عباس تابش کی اس غزل کے تمام اشعار ہی عمدہ ہیں اور ان کے لیے منتخب کی گئی تراکیب بھی خوبصورت پیرائے میں ہیں۔ انھوں نے عربی و فارسی کی تراکیب دے کر غزل کو خوبصورت بنایا ہے۔ انھوں نے آتشِ نمو، نخلِ بزرگ، زخمِ دروں، شاخِ صنوبر، خواہشِ نمو، دمِ سخن، عہدِ بےخمار، بازارِ چشم، تلاشِ رزق، حسنِ فراواں، صاحبِ دشت، آدابِ جنوں، برگِ خشک، درونِ جسم، کوششِ نمو، مصرعۂ لب، کاغذِ خالی، ظلِ الٰہی، بادِ خزاں، بہارِ شوق، شگفتِ گل، موسمِ گل، آبِ رواں، کوہِ گراں، منزلِ جاں جیسی خوبصورت تراکیب استعمال کی ہیں۔ عباس تابش کی یہی خصوصیّت انھیں ایک اہم شاعر کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ اُنھوں نے پوری کی پوری غزلوں میں بھی تراکیب استعمال کی ہیں۔ اُن کی شاعری میں جا بجا فارسی و عربی کی تراکیب دیکھنے میں آئی ہیں، اسی تراکیب تراشی نے اُن کے اشعار کا حسن دوبالا کر دیا ہے۔ اُنھوں نے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے اور مصرعوں میں جامع الفاظ برتتے ہیں۔

استفہامیہ انداز

اُردو شاعری پر طائرانہ نظر ڈالیں تو تقریباً تمام شعرا کے ہاں استفہامیہ لہجے کا استعمال ملتا ہے کسی نے کم تو کسی نے زیادہ کلماتِ استفہام استعمال کیے ہیں۔ استعارات و تشبیہات کی طرح استفہامیہ لہجہ بھی شعرا نے خوب برتا ہے۔ کلام میں مختلف کلمات مثلاً کیا، کب، کیوں، کس، کیونکر، کون، کہاں اور کیسے استفہام کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کلمات الگ الگ کوئی خاص اہمیّت نہیں رکھتے مگر جب اشعار میں الفاظ کے ساتھ ملتے ہیں

تو بھرپور معانی دیتے ہیں۔ یہ کلمات روزمرہ میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ عباس تابش نے ان کلمات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلام میں اظہارِ استفسار کا کام لیا ہے۔ اس سے اُن کے کلام میں حسن پیدا ہو گیا ہے، استفہامیہ لہجہ بھی تابشؔ کے اسلوب کی پہچان ہے:

کیونکر سخن آغاز کیا جائے کہ وہ آنکھ
لا رکھتی ہے اجداد کا لکھا مرے آگے
(رقصِ درویش)

کیسے وہ کوہسار کے دکھ کو سمجھ سکے
چشمے پہ جس کو شائبۂ چشمِ تر نہ ہو
(رقصِ درویش)

کب چاند سرِ فلک رہا ہے
آہو سا کوئی بھٹک رہا ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

کب تمھیں عشق پہ مجبُور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں
(رقصِ درویش)

عباس تابش ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں ہر طرح کے پہلو اور عناصر پائے جاتے ہیں یہ اُن کی فنی پختگی، اساتذہ کے مطالعہ اور شاعری کی بے حد ریاضت کی وجہ سے ہے۔ اُنھوں نے شاعری میں کئی طرح کے تجربے کر کے دکھا دیے ہیں۔ عباس تابش نے کلماتِ استفہام کا استعمال بکثرت اپنے اشعار میں کیا ہے اُن کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شعر ہوتے ہیں نہ روتے ہیں نہ مل بیٹھتے ہیں
کس طرح ختم طبیعت کی گرانی ہو جائے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

نہیں ہے شہر میں کوئی بھی جاگنے والا
کسے کہیں کہ چلو سیرِ مہتاب کریں
(تمہید)

کون کہتا ہے کہ وہ بھولتا جاتا ہے مجھے
اپنا چہرہ نہ سہی رہ تو دیکھاتا ہے مجھے
(آسمان)

صنعتِ ترصیع کا استعمال

جس طرح عباس تابش نے علم بدیع کی دیگر صنعتیں استعمال کی ہیں، اسی طرح اُنھوں نے صنعتِ ترصیع کا بھی کمال مہارت کے ساتھ خوبصورت استعمال کیا ہے۔ شعری اصطلاحات میں صنعتِ ترصیع سے مراد وہ صنعت ہے جس میں شعر کے دونوں مصرعوں میں الفاظ کی تعداد برابر ہو، اسے صنعتِ ترصیع کہتے ہیں۔ صنعتِ ترصیع میں مصرعے میں ہر لفظ کے مقابل لفظ آتا ہے۔ صنعتِ ترصیع کی تعریف پروفیسر تنویر حسین یوں کرتے ہیں:

''ترصیع میں شعر کے دونوں مصرعوں میں الفاظ باہم متوازن اور حروف و قافیہ کے اعتبار سے مساوی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل آتے ہیں'' (۶۱)۔

عباس تابش کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ اُنھوں

نے اپنی غزلوں میں صنعتِ ترصیع کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔ صنعتِ ترصیع کی چند مثالیں ملاحظہ کریں:

یہ اچانک جو سکوں سا آیا
جاں نکلی ہے کہ مصرعہ آیا

قریۂ چشم میں گونجا پانی
لوگ سمجھے کوئی دریا آیا

اے مجھے جیب میں بھرنے والے
میں ترے ہاتھ بھی کتنا آیا

گھر کے ملبے پہ کھڑا سوچتا ہوں
مجھ کو کس بات پہ غصہ آیا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کے صنعتِ ترصیع کے استعمال کی بڑی وجہ اُن کی چھوٹی بحر کی غزلیں ہیں، وہ بکثرت چھوٹی چھوٹی بحور میں شعر کہتے ہیں اس لیے اُن کے ہاں اس صنعت کا استعمال عام ہے۔ ان چھوٹی بحروں میں اشعار میں لفظوں کی تعداد ایک مصرعے میں دوسرے مصرعے کے الفاظ کی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر بھی اُنھوں نے صنعتِ ترصیع کا استعمال کر دیا ہے۔ عباس تابش عہدِ حاضر کے غزل نگاروں کے قافلے کے سپہ سالار ہیں، غزل میں اب اُن کی حیثیت ایک رہنما کی ہے۔

عباس تابش کے اشعار میں سینکڑوں اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں اس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے۔نمونے کے طور پر اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھ پہ تہمت تراشنے والو
یہ مری پہلی کامیابی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

لگتا ہے یہاں موت نہیں آنی کسی کو
اس شہر میں اب کوئی وصیّت نہیں کرتا
(رقصِ درویش)

میں تمھیں چھوڑ تو نہیں بیٹھا
لوگ کیوں ہیں مری حمایت میں

کیا کہوں جو سکون ملتا ہے
ایک صوفی شجر کی صحبت میں
(رقصِ درویش)

چھوٹی بحروں میں کمالِ فن

عباس تابش نے چوں کہ چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں اس لیے اُن کے ہاں صنعتِ ترصیع کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔چھوٹی بحر میں شعر کہنا کمالِ فن کی بات ہے اور پھر اچھا شعر کہنا فن کی پختگی سمجھا جاتا ہے۔ چند لفظوں میں پورا مضمون باندھنا خاصا مشکل کام ہے، تھوڑے لفظوں میں اپنی بات مکمل کرنا مہارت کا کام ہے، عباس تابش کو زبان و بیان پر کمال دسترس حاصل ہے کیوں کہ اُنھوں نے چھوٹی بحروں میں اچھے اشعار کہہ

کر اپنی فنی پختگی کا یقین دلایا ہے۔اُنھوں نے چھوٹی بحر میں اچھی غزلیں کہی ہیں جوان کے مشاہدات و تجربات کی عکاسی کرتی ہیں۔ میر تقی میؔر نے بکثرت چھوٹی بحروں کا استعمال کیا، غالب و مومن نے بھی چھوٹی بحروں میں غزلیں کہی ہیں ۔ ناصر کاظمی کو چھوٹی بحروں میں غزلیں کہنے کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔عباس تابش کی چھوٹی بحر کے اشعار پڑھ کر اُن کی یاد آ جاتی ہے۔چھوٹی بحر کے اشعار دیکھیے :

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
(میر تقی میؔر)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
(غالب)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

تجھ کو ہر پھول میں عریاں سوتے
چاندنی رات نے دیکھا ہو گا
(ناصر کاظمی)

عباس تابش کی شاعری میں ایک بڑی تعداد میں چھوٹی بحر کے اشعار ملتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فنِ شاعری پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔اُنھوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں شعر کہہ کر کمال مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔اُن کے اشعار پڑھ کر میؔر، غالب

،مومن اور ناصر کاظمی کی یاد آ جاتی ہے، جدید اُردو غزل میں عباس تابش کی چھوٹی بحر کی غزلیں ایک اچھا اضافہ ہے۔ چھوٹی بحر کے بارے میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی اپنی کتاب ''تفہیم و تحسین شعر'' میں رقمطراز ہیں:

''چھوٹی زمینیں دریافت کرنا اب ایک بڑی خوبی سمجھا جانے لگا ہے۔ تھوڑے لفظوں میں کوئی کام کی بات کہنا واقعی کمال ہے۔ اس کی داد شاعر کو ملنی چاہیے۔ غزل کے دو مصرعوں کا پیمانہ پہلے ہی کوئی بڑی بات کہنے کے لیے ایک تنگ پیمانہ ہے۔ چھوٹی بحر میں کوئی بڑی اور فکر انگیز بات کہنا مزید مشکل ہو جاتا ہے'' (۶۲)۔

عباس تابش کے چھوٹی بحر کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مرا بھی مسئلہ ہے لفظ جیسا
بظاہر کم ہوں در پردہ بہت ہوں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

غرق شہروں کی کہانی اور ہے
تیری میری رائیگانی اور ہے

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مکاں بھر ہم کو ویرانی بہت ہے
مگر یہ دل کہ سیلانی بہت ہے

ہمارے پاؤں اُلٹے ہیں سو ہم کو
پلٹ جانے میں آسانی بہت ہے

ابھی سوکھی نہیں مٹی کی آنکھیں
ابھی دریاؤں میں پانی بہت ہے

(آسمان)

عباس تابش کے ان اشعار میں چھوٹی بحر کا استعمال خوب صورت انداز میں ہوا ہے۔ اُنھوں نے محض چند لفظوں میں اپنی مکمل بات کہہ دی ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں ہنر آفرینی پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے کمال مہارت سے ان چھوٹی چھوٹی بحور میں اپنا خیال پیش کر دیا ہے۔ عباس تابش کی غزلوں کے اشعار دیکھیے مختصر بحر میں لکھے گئے ہیں:

یہ لب ساحل پہ روشن آگ جیسے
یہ ٹھاٹھیں مارتے رخسار دیکھیں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مجھ کو ورثے میں بھی گردش ہی ملی
میرے حصّے میں پیالہ آیا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کی شاعری میں چھوٹی بحر کی غزلوں کی تعداد زیادہ ہے جو اُن کے فنی اُسلوب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انھوں نے چھوٹی بحر میں شعر کہہ کر اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ عباس تابش چوں کہ روایت سے جڑے ہوئے جدید غزل گو ہیں اس لیے اُنھوں نے بکثرت مختصر بحر کا استعمال کیا ہے۔ چھوٹی بحر میں موسیقی وغنائیت زیادہ ہوتی

ہے۔اُن کا رنگِ تغزل ملاحظہ کیجیے:

اے اسیرانِ خانۂ دل بند
گھر کے اندر ہی گھر کی چابی ہے

میں فلک کو برا نہیں کہتا
میرے نزدیک یہ صحابی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

آدمی اب بھاگ کر جائے کہاں
شہر کے چاروں طرف بھی شہر ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

لوگ عزت سے نام لیتے ہیں
رفتگاں میں شمار ہے اپنا
(رقصِ درویش)

عباس تابش کی شاعری کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اس طرح کے کئی اشعار زیرِ نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹی بحر کے چند لفظوں میں اپنی پوری بات اپنا پورا مضمون باندھنا بخوبی جانتے ہیں۔ یہی بات اُنھیں ایک اہم شاعر بناتی ہے کیوں کہ اُنھوں نے چھوٹی بحروں میں بھی مختلف مضامین شامل کر کے اچھے اشعار تخلیق کیے ہیں۔ بلاشبہ عباس تابش ۸۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک کے بڑے شاعر ہیں۔ دوسرے جدید غزل گو شعرا نے بھی چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے مگر عباس تابش کے کلام میں اُن سے زیادہ تازگی اور ہنر آفرینی دیکھنے کو ملتی ہے۔

طویل بحور کا استعمال

عباس تابش نے جہاں چھوٹی بحر کے اشعار میں مختلف مضامین کے رنگ بھرے ہیں وہاں اُنھوں نے بڑی بحر کا دامن بھی خوبصورت الفاظ وتراکیب سے سجا دیا ہے۔ جس طرح چھوٹی بحر میں بڑی بات سمیٹنا مشکل ہوتا ہے اسی طرح بڑی بحر میں بھی شعر تراشنے کے لیے الفاظ کا چناؤ اتنا سہل نہیں۔ اُنھوں نے بڑی بحر میں بھی خوبصورت اور بے مثال اشعار کہے ہیں۔ انتخاب الفاظ کے متعلّق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، یوں کہتے ہیں:

> ’’یوں تو ہر اچھے شعر کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ کا انتخاب سلیقے سے کیا جائے۔ حالی نے شعرگوئی کے عمل میں اس مرحلے کو ’’تفحص الفاظ‘‘ سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ ہر اچھا شعر انتخاب الفاظ کے اعتبار سے کامیاب ہوتا ہے تو اچھا شعر بنتا ہے، لیکن بعض اشعار میں یہ خصوصیّت اس درجے کی ہوتی ہے کہ شعر کا سارا جادو انھی الفاظ کا مرہونِ منت ہوتا ہے جو شاعر نے استعمال کیے ہیں اور شاعر اپنے مضمون ومفہوم سے زیادہ انتخاب الفاظ کی داد چاہتا ہے‘‘(۶۳)۔

عباس تابش کی شاعری میں سے بڑی بحر کے اشعار میں انتخاب الفاظ کی ایک خوبصورت جھلک دیکھیے، اُنھوں نے بڑی بحروں میں کمال مہارت اور بنت سے شعر تخلیق کیے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں:

پہلے ہڈی کے گودے سے خط لکھتے ہیں یار کو
پھر زنبیل میں رکھ لیتے ہیں کاغذ توڑ مروڑ کے
(تمہید)

چمکتا ہوں ہر اک مہتاب رو کے روئے روشن میں
میں سورج ہوں مجھے شب کا سفر اچھا نہیں لگتا
(تمہید)

میں اُس کی آہٹیں چن لوں میں اُس سے بول کر دیکھوں
گلی میں کون پھرتا ہے دریچہ کھول کر دیکھوں
(تمہید)

لفظوں کے بٹوارے میں اس چیخ بھرے گہوارے میں
بول تو ہم بھی سکتے ہیں پر شامل ہے آداب میں چپ
(تمہید)

ابھی تو خود تم نئے نئے ہو ہمیں سکھاؤ گے عشق کیا
یہ کام ہم نے کیا ہوا ہے یہ پانی ہم نے بھرے ہوئے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے بڑی فنی مہارت سے بڑی اور طویل بحروں کا استعمال کیا ہے۔
اُن کی بڑی بحروں میں تراکیب کا استعمال کم ہوا ہے جب کہ چھوٹی بحروں میں تراکیب کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ بڑی بحر میں شعر کہنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا چھوٹی بحروں میں بڑی بات کو سمیٹنا۔ بڑی بحروں میں ارکان کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اس لیے انھیں پورا کرنے کے لیے الفاظ بھی زیادہ چاہیے ہوتے ہیں۔ عباس تابش اس کام میں کامیاب نظر آتے ہیں

کیوں کہ اُنھوں نے بڑی بحر میں اچھی غزلیں تخلیق کی ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ بات سچ ہے کہ ہم تھے فانی فنا ہماری سرشت میں تھی
مگر کسی کے لیے ہمیں لازوال ہونا تو چاہیے تھا
(آسمان)

ہماری آنکھوں سے خواب و خس کے تمام پشتے ہٹائے جائیں
ہمارا ناراض پانیوں سے معاہدہ ختم ہو گیا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

نہ جانے کوفے کی کیا خبر ہو نہ جانے کس دشت میں بسر ہو
میں پھر مدینے سے جا رہا ہوں مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

میرے الفاظ یوں رات میرے گلے لگ کے روتے رہے
جیسے لمبے سفر کے لیے ہو کوئی قافلہ الوداع
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اور ہی رنگ میں ہو برگ و ثمر کا ہونا
جس کی خواہش ہے مجھے وہ بھی اگر مل جائے
(آسمان)

عباس تابش کی بڑی بحور میں صنعتِ ترصیع، صنعتِ تضاد اور صنعتِ تکرار کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ اُنھوں نے طویل بحر کی غزلوں میں تراکیب اور تشبیہات وغیرہ کا استعمال بھی کم کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی بات اور نفسِ مضمون پورا بیان کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی مشق کی ہے اس لیے دیگر پہلوؤں سے اُن کی توجہ ہٹ گئی ہے۔

اس کے باوجود بھی عباس تابش کی بڑی بحور کی غزلیں خوب صورت انداز لیے ہوئے ہیں، اُن غزلوں کی وجہ سے عباس تابش عہدِ موجود کے ایک اہم شاعر بن گئے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نقش سارے خاک کے ہیں سب ہنر مٹی کا ہے
اس دیارِ رنگ و بو میں بست و در مٹی کا ہے

کچھ تو اپنی گردنیں کج ہیں ہوا کے زور سے
اور کچھ اپنی طبیعت میں اثر مٹی کا
(تمہید)

درج بالا اشعار بڑی بحر کے ہیں۔ عباس تابش نے کمال مہارت سے لمبی بحریں استعمال کی ہیں۔ یہ اُن کی فنی پختگی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ ایک جدید غزل گو شاعر ہیں اُن کی غزلیں جدید لہجہ کی ہیں۔ لمبی بحروں میں الفاظ کی تعداد زیادہ چاہیے ہوتی ہے بعض اوقات شاعر کے پاس الفاظ کم پڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے لمبی بحر میں مصرع باندھنا مشکل ہو جاتا ہے جب کہ عباس تابشؔ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ ایک پختہ فن کے حامل شاعر ہیں، جس طرح چھوٹی بحر میں نفس مضمون بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اُسی طرح لمبی بحر میں بھی شعر کہنا دشوار ہوتا ہے کیوں کہ مصرعوں میں کئی بار الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ عباس تابش نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں اچھی غزلیں تخلیق کی ہیں۔ اُن کے ہاں الفاظ کی کوئی کمی نہیں ہے۔

تخلص کی معنی آفرینی

اُردو غزل کی یہ بڑی پرانی روایت ہے کہ اس کے آخری شعر (مقطع) میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ تقریباً تمام شعرا مقطعے میں اپنا تخلص استعمال کرتے ہیں۔

عباس تابش بھی اپنی غزل کے مقطع میں اپنا تخلص ''تابش'' بڑے خوبصورت انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی روایتی انداز میں جدید غزل کہتے ہیں اس لیے اُنھوں نے تخلص کا استعمال بکثرت کیا ہے۔ عباس تابش کی غزلوں کے چند مقطعے ملاحظہ کریں:

میں نے اس ڈر سے اسے توڑ لیا ہے تابشؔ
سوکھ جائے نہ کہیں شاخِ شجر پر رکھا
(رقصِ درویش)

ہجر کی سالگرہ یاد تھی اُس کو تابشؔ
رکھ گیا میرؔ کا دیوان سرہانے میرے
(رقصِ درویش)

کبھی سر پھوڑنے دیتی نہیں دیوار سے تابشؔ
یہ کیا دیوانگی ہے جو ہمیں ناکارہ رکھتی ہے
(تمہید)

ممکن ہے اُس دل میں پہنچ پانے کا تابشؔ
رستہ ہو کوئی نقل مکانی کے علاوہ
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

مجھے کسی سے بھلائی کی اب کوئی توقع نہیں ہے تابشؔ
میں عادتاً سب سے کہہ رہا ہوں مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اُردو غزل کی یہ روایت رہی ہے کہ شاعر اپنے آپ سے ضرور مخاطب ہوتا ہے، وہ تخاطب کے اس انداز میں غزل کے آخری شعر میں اپنا تخلص لے آتا ہے اور خود کو مخاطب کر

کے بات کرتا ہے۔عباس تابش چوں کہ روایت سے جڑے ہوئے جدید لہجے کے شاعر ہیں
اس لیے اُنھوں نے اساتذہ کی طرح اپنے تخلص کا استعمال بکثرت کیا ہے۔اُن کی غزلوں
کے چند مقطعے ملاحظہ کیجیے:

جو ملا اُس پہ مر مٹے تابشؔ
کتنے اچھے تھے میل جول کے ہم
(آسمان)

پھر وہ سناٹا ہوا تابشؔ
ذہن میں چاپ سی اُتر آئی
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

یہ شعر دیکھیے اس میں شاعر نے عجیب اور منفرد انداز میں اپنا تخلص استعمال کیا
ہے۔وہ کہی ہوئی بات جب دہراتے ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ یہ پہلی بار کسی نے یوں کہا ہے۔
پرانے سے پرانے خیالات بھی اُن کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔اس لیے عباس تابش کو شعر و سخن
پر مکمل دسترس حاصل ہے۔اُن کی غزلوں میں تمام تر فنی خوبیاں موجود ہیں۔اُن کی غزلوں
کے مقطعے بڑے منفرد اور جان دار ہیں۔بلاشبہ عباس تابش ایک صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں
اس لیے اُن کو معاصرین میں اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔یہ اشعار دیکھیے:

زندگی! میں تو جب بھی ترے ہاتھ میں ہاتھ دینے لگا
میرے اندر کوئی مجھ سے کہنے لگا تابشا الوداع
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

تابشؔ کی غزلوں کے چند مقطعے ملاحظہ کیجیے،اُنھوں نے اپنا تخلص استعمال کر کے
مصرعوں کو خوب صورت بنا دیا ہے:

پاس ہی ڈوب رہی ہے کوئی کشتی تابشؔ
خود نہیں بچتے اگر اُس کو بچانے لگ جائیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

کی رسائی میں وہاں دستِ دعا سے تابشؔ
ورنہ تھے لوگ مرے قد کے برابر کیا کیا
(رقصِ درویش)

یہ بھی رہتے نہیں ویران جگہ پر تابشؔ
دکھ پرندوں کی طرح شہر میں آ رہتے ہیں
(رقصِ درویش)

ان اشعار میں عباس تابش کس طرح خود کلامی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں،اُن
کی یہی خود کلامی ان کے اُسلوب کی شناخت بن گئی ہے۔وہ خود کو کہہ رہے ہیں کہ یہ میرے
ہی لہجے میں کون بلا رہا ہے مجھے،یہ میں نہیں ہوں۔اس طرح عباس تابش کے اشعار کا حسن
بڑھ گیا ہے۔درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

یقیناً بھینچ رکھا ہے کسی نے میرا دل تابشؔ
وگرنہ بند مٹھی سے کہاں جگنو نکلتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

میں اک دن میں نہیں پتھر سے پانی ہو گیا تابشؔ
ملا ہے یہ مقامِ چشمِ تر آہستہ آہستہ
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

یہ نہ میں ہوں نہ ہوا ہے نہ فضا ہے تابشؔ
میرے لہجے میں کوئی اور بلاتا ہے مجھے
(آسمان)

عباس تابشؔ نے روایتی شعرا کی طرح اپنی غزلوں میں تخلص کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔عباس تابش روایت سے جڑے ہوئے ضرور ہیں مگر اُن کے کلام میں جدّت کی فضا اپنی جگہ ہے ۔ اُن کے ہاں روایت و جدیدیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔زیر نظر مقالے میں عباس تابش کے شعری اُسلوب پر میں نے سیر حاصل گفتگو کرنے کی مکمل کوشش کی ہے۔اُن کی غزلیات میں موجود تمام پہلوؤں اور ان میں استعمال ہونے والی مختلف شعری صنعتوں کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔اُن کی اُردو غزل کا فنی و اُسلوبیاتی جائزہ لینے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ عباس تابش ایک صاحبِ اُسلوب شاعر کی حیثیت سے اُردو ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔

عباس تابش نے تشبیہ، استعارے، تراکیب و تلمیحات سے لے کر تمام ضروری صنعتوں کا بڑا خوب صورت استعمال کیا ہے اور اس میں بڑے کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں استعارہ محض استعارہ نہیں بلکہ فکر وخیالات کی ترسیل اور فہم وفراست کا نام ہے۔اُن کا استعارتی نظام بہت اچھوتا ہے جہاں اُنھوں نے پرانے اور روایتی استعارے استعمال کیے ہیں وہاں پر اُنھوں نے نئے نئے استعاروں کو بھی متعارف کروایا ہے۔یہی بات عباس تابش کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔اُنھوں نے غزل گوئی میں خوب جوہر دکھائے ہیں۔المختصر عباس تابش جدید دور کے ایک منفرد اُسلوب کے شاعر ہیں۔

(د) عباس تابشؔ کی اُردو غزل کا فکری وموضوعاتی جائزہ

عباس تابش کی شاعری میں حسن وعشق کے علاوہ دیگر سیاسی، سماجی واخلاقی پہلو بھی ملتے ہیں۔اُنھوں نے عام شہری کے ساتھ درپیش تمام مسائل کا ذکر بھی اپنے اشعار میں کیا ہے۔شاعر کے تخلیق کیے گئے موضوعات کو مختلف عنوانات کے لحاظ سے دیکھا گیا ہے۔ مقالے میں عباس تابش کے مشاہدات وتجربات اور تاثرات جو اُنھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر حوالۂ غزل کیے اُن کا جائزہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔مقالے میں عباس تابش کے تاثرات کے علاوہ اُن کی شاعرانہ حیثیت اور ذوقِ سلیم کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔کسی شاعر کے تاثرات کے بارے میں علامہ نیاز فتح پوری اپنی کتاب ''انتقادیات'' میں رقمطراز ہیں:

> ''ایک شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تاثرات اُس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اُن کو وہ الفاظ و انداز سے ظاہر کردے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور اسی کا نام ذوقِ سلیم ہے''(۶۴)۔

عباس تابش نے شاعری میں خوب اپنے جوہر دکھائے ہیں۔اُنھوں نے روایت کا دامن تھام کر جدید غزل کی بنیاد رکھی ہے ۔غزل میں نت نئے تجربات کیے ہیں۔ عباس تابش ایک غزل گو شاعر ہیں لیکن اُنھوں نے نظم نگاری بھی کی ہے۔اُن کی فنی و اسلوبیاتی خصوصیات کو ایک طرف رکھتے ہوئے، اُن کے موضوعات کی طرف آتے ہیں۔ اُنھوں نے حیات وکائنات کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔

غزل کی یہ خوبی ہے کہ یہ کائنات کے تمام موضوعات کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اس میں محض عشق و محبت کے ہی موضوعات نہیں ہوتے، عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں غزل کے موضوعات بنے رہے۔ شروع ہی سے غزل میں زندگی کے مختلف معاملات اشعار میں ڈھالے جاتے رہے ہیں۔ مذہب اور تصوف کے مضامین، معاشرت اور اخلاق سمیت وہ کون سا موضوع ہے جو غزل میں شامل نہ ہوا ہو۔ شاعر اپنے جذبات و احساسات کو اپنے اشعار کے ذریعے عوام تک منتقل کرتا ہے۔ معاشرے کے اس پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

غزل کی روایت کو دیکھیں تو یہ آغاز سے اب تک عشق و محبت کی نمائندہ صنف رہی ہے۔ غزل کے اشعار نے محبت کے جذبات کو ابھارا ہے، عشقیہ شاعری غزل کے ذریعے ہی ممکن ہوئی ہے۔ عشق و محبت غزل کا روایتی موضوع ہے مگر عباس تابش نے اس روایت کو جدت بخشی ہے۔ انھوں نے عشق و محبت کے موضوع میں جدید لہجہ برتا ہے۔ بات وہی ہے، محبت وہی ہے مگر انداز نیا ہے۔ وہ کی ہوئی محبت کرنے کے قائل نہیں ہیں، وہ نئے انداز سے محبت کرتے ہیں۔

عشق و محبت

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو دنیا میں ہر کسی کو حسین، دلکش و دلفریب لگتا ہے، ہر کوئی اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔ اس کے اثرات انسان کی زندگی پر گہرے پڑتے ہیں۔ محبت سچّائی پر مبنی ایک جذبہ و احساس کا نام ہے۔ اُردو شاعری میں غزل جیسی مقبول کوئی صنفِ سخن نہیں ہے، غزل کی بنیاد ہی جذبہ عشق و محبت پر ہے۔ غزل میں عشق و محبت کے مضامین کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ غزل کے معنی ہی عشق و محبت کی باتیں کرنا ہے۔ عشق و محبت کے سوا غزل میں اور کوئی شے خوبصورت نہیں۔ حالؔی اس بات کو یوں کہتے ہیں:

''اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اسے ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے'' (۶۵)۔

غزل، محبت کے جذبات کی عکاس ہے، اس بات کو علامہ نیاز فتح پوری یوں بیان کرتے ہیں:

''محبت کا وہ جذبہ جس پر غزل کی بنیاد قائم ہے اپنے مقصود و مدعا کے لحاظ سے گو غیر فطری نہ ہو لیکن اس کا سنجیدہ ہو جانا یقینی ہے'' (۶۶)۔

پیار میں ہجر و وصال، سوز و گداز، رسوائی و بے وفائی کے مراحل سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے، پیار اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ پیار انسان کی زندگی کو خوشبو سے معطر کر دیتا ہے عباس تابش بھی جذبۂ محبت سے سرشار دکھائی دیتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

اے شخص تیرے ساتھ ہیں سارے معاملات
ایسا نہیں کہ تجھ سے محبت ہے اور بس
(رقصِ درویش)

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبُوب میری زندگی کے سارے معاملات تم سے جڑے ہوئے ہیں، میری ذات تمہارے ہی گرد گھومتی ہے اور تمہارے بغیر میرا گزارا نہیں ہے۔ میں تم سے صرف محبت ہی نہیں کرتا بلکہ میری زندگی کا محور بھی تم ہو۔ یہ بات بالکل درست اور حقیقت پر مبنی بات ہے کہ سچّا عشق کرنا آسان نہیں ہے اور پھر محبت میں ایک معیار بھی برقرار رکھنا مشکل کام ہے۔

عباس تابش بھی اسی عشق کے قائل ہیں وہ عشق میں ایک معیار برقرار رکھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ مسلسل ایک ہی معیار کے ساتھ عشق قائم رکھنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ عشق ومحبت میں بڑے نشیب وفراز آتے ہیں کئی مواقع پر انسان ڈگمگا جاتا ہے، لیکن مستقل مزاجی سے عشق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ عباس تابش کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

تجھ سے بچھڑ کے اس لیے تیرا ہے انتظار
وہ کوئی زندگی ہے جو بارِ دگر نہ ہو
(رقصِ درویش)

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا سب کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر زندہ شے کو موت آنی ہے، ہر شے نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور موت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ملے گی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ اسی بات کو تابش کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب یہ جو تو ہم سے بچھڑ گیا ہے، ہم پھر بھی مسلسل تیرا انتظار کیے جا رہے ہیں کیوں کہ ہمیں یقین ہے کہ تو ہمیں ضرور ملے گا، جب یہ زندگی دوبارہ ملے گی تو تو ہمیں مل جائے گا۔ عباس تابش کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے
(رقصِ درویش)

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عاشقی کا سلسلہ تاعمر یونہی چلتا رہنے دو کیوں کہ یہ سلسلہ کبھی مکمل نہیں ہوتا، یہ کوئی دین یا ضابطۂ حیات نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے گا بس اسے یونہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلتا رہنے دو۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

تم اچانک ہی ملے اور اچانک ہی گئے
اس کو کہتے ہیں مقدر کا لکھا ہو جانا
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش مقدر پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جو اُس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے اگر کوئی شے نصیب میں نہ ہو تو مل کر بھی بندے کو نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں اے محبوب تم اچانک ہی ملے اور اچانک ہی بچھڑ گئے ہو اس لیے تمہارا یوں بچھڑنا اور یوں ملنا مجھ سے بھلایا نہیں جاتا:

اس لیے مجھ کو پسند آتا ہے صحرا کا سکوت
اس کا نشہ تری باتوں کی طرح ہوتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اس شعر میں عشق ومحبت کے قصے بیان کیے گئے ہیں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب میں اس لیے صحرا کو پسند کرتا ہوں کیوں کہ اس کا سناٹا تیری باتوں جیسا ہوتا ہے۔ صحرا کی تنہائی اور خاموشی مجھے تمہاری طرح لگتی ہے، اس لیے میں دشت وصحرا کو پسند کرتا ہوں۔ تابش کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

دکھ ہوا آج دیکھ کر اُس کو
وہ تو ویسا ہی خوبصورت ہے
(آسمان)

شاعر کا محبوب اُس سے بچھڑ کر بھی اُسی طرح خوبصورت ہے۔ اُس کو کوئی رنج وغم نہیں۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ میرا محبوب بھی مجھ سے بچھڑ کر بے حال ہوگا مگر اسے تو مجھ سے بچھڑ کر کوئی فرق نہیں پڑا، اس شعر میں شاعر نے محبوب کی بے حسی اور
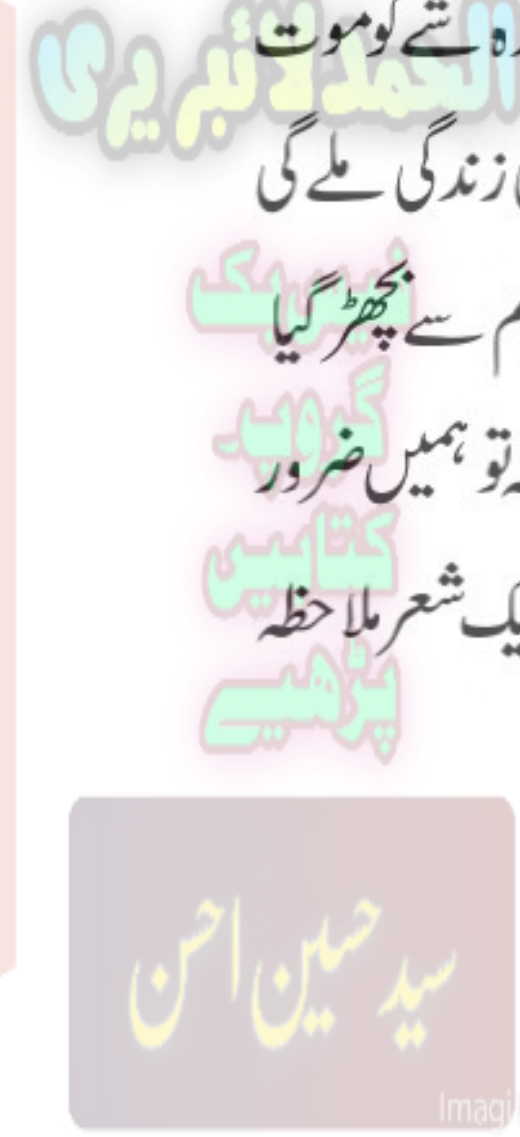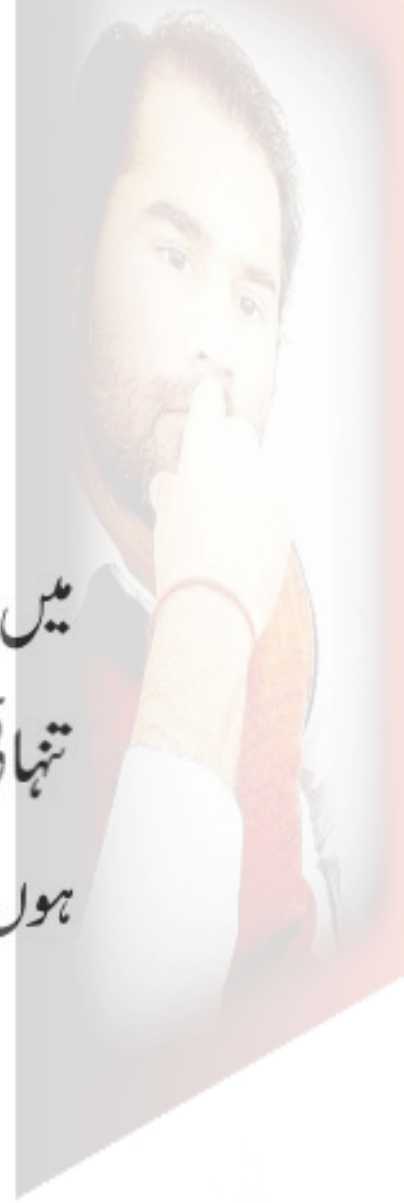
بے مروتی کا ذکر کیا ہے:

ہم سلسلہ داروں کے ہو کیوں جان کے در پے
کافر اُسے کہیے جو محبت نہیں کرتا
(رقصِ درویش)

یہ عشق ہے اور اس کا ہونا نہیں دوبارہ
یہ زیست تو نہیں جو بارِ دگر کریں گے
(رقصِ درویش)

شاعر محبت میں توحید کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عشق زندگی میں صرف ایک بار ہوتا ہے، بار بار نہیں ہوتا۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

خیال آیا مگر کیوں یہی خیال آیا
کہ عمر بیت گئی تیری آرزو کرتے
(رقصِ درویش)

تجھ کو گنتا ہوں میں اپنے آپ میں اس واسطے
تا کہ دنیا کو بتا پاؤں مکمل شخص ہوں
(رقصِ درویش)

عشق میں بام و در بھی نہ پیچھے رہے
ساتھ اپنے مکیں کے مکاں بھی گیا
(تمہید)

عشق انسان کو برباد و نکما کر دیتا ہے۔ اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب میں تیرے بغیر ادھورا ہوں میں تجھ کو خود میں اس لیے گنتا ہوں تا کہ مکمل ہو جاؤں

لوگ مجھے آدھا نہ سمجھیں۔ محبت میں ہجر کے تلخ موسم بھی آتے ہیں اور وصال کے پر کیف و پر سکون لمحات بھی ملتے ہیں۔ محبت ایک پل کی سرشاری دے کر دنوں ملال میں رکھتی ہے۔ محبت ہجر و وصال اور سوز و گداز کا دوسرا نام ہے۔ اسی لیے نوشی گیلانی نے کہا تھا:

کھیل یہ کیسا کھیل رہی ہے دل سے تری محبت
اک پل کی سرشاری دے اور دنوں ملال میں رکھے
(نوشی گیلانی)

عشق و محبت کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں اور عاشق کو حالتِ عشق میں ان تمام احوال سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہجر و وصال، خوشی و غمی اور سوز و گداز کے عناصر کا محبت میں بڑا عمل دخل ہے۔ کبھی عاشق اپنے محبوب کے ہجر میں جلتا ہے تو کبھی اُس کے وصال کے مزے لیتا ہے۔ کبھی محبت اسے خوشی دیتی ہے اور کبھی غم دیتی ہے۔ عاشق کے دل میں سوز و گداز کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کیوں کہ پھول کے ساتھ کانٹے اور خوشبو دونوں ہوتے ہیں۔ اس بارے میں رفیع الدین ہاشمی کی یہ رائے قلمبند کرتے ہیں:

> ''عشق اور عاشقی غزل کا سب سے بڑا موضوع ہے اور عموماً غزل میں حسن و عشق کی مختلف کیفیات (مثلاً درد و غم سوز و گداز، ہجر و وصال، محبُوب کا ظلم و ستم، اس کی بے وفائی اور ناز و ادا وغیرہ) کا بیان ہوتا ہے'' (۶۷)۔

ہجر و وصال میں عاشق پر کئی کیفیات گزرتی ہیں، کبھی ہجر میں بھی وہ وصال کے مزے لے رہا ہوتا ہے اور کبھی پریشان حال دکھائی دیتا ہے۔ عاشق کبھی آنسو بہاتا ہے اور کبھی اس کا دامن خوشیوں سے لبریز ہوتا ہے۔ محبت میں ہجر و فراق کی سختیاں بھی جھیلنا پڑتی

ہیں۔اس لیے عباس تابش کہتے ہیں:

اس لیے اب میں کسی کو نہیں جانے دیتا
جو مجھے چھوڑ کے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں

شادیٔ مرگ کا ماحول بنا رہتا ہے
آپ آتے ہیں رلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

کب تمھیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

(رقصِ درویش)

درج بالا اشعار ''رقصِ درویش'' سے لیے گئے ہیں، اس میں شاعر اپنے محبُوب سے مخاطب ہے وہ کہتا ہے کہ جو بھی مجھے چھوڑ کر گیا لوٹ کر نہیں آیا اس لیے اب میں تمھیں جانے نہیں دوں گا۔ میرے محبُوب تمہارے آنے سے میرا دامن ضبط میرے اختیار میں نہیں رہتا اس لیے میرے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ شاعر کو محبُوب کی جدائی کا بہت غم ہے۔ وہ اپنے محبُوب سے صرف ایک بار ملے ہیں اور یوں کہتے ہیں:

اُس ہاتھ کا لمس بھی عجب تھا
اب تک یہ بدن دہک رہا ہے

(پوروں میں شام ڈھلتی ہے)

شاعر کو اپنے محبُوب کا لمس بھی نصیب ہوا مگر زندگی میں صرف ایک بار ایسا ہوا اور اس کے بعد ہجر اس کا مقدر بن گیا۔ محبُوب کے لمس کا سرور آج بھی اس کی پوروں میں ہے:

رات کو جب یاد آئے تیری خوشبوئے قبا
تیرے قصے چھیڑتے ہیں رات کی رانی سے ہم

(تمہید)

رات کے گہرے سناٹے میں عاشق اپنے محبُوب کی یاد میں مشغول ہوتا ہے تو اسے محبُوب کی چادر کی خوشبو آنے لگتی ہے اور وہ رات کی رانی سے کہتا ہے کہ میرے محبُوب کی ''خوشبوئے قبا'' تیری خوشبو سے زیادہ ہے اس لیے تو اپنی اس مہک پر اس قدر نازاں نہ ہو۔ اگر میرا محبُوب یہاں آجائے تو تجھے شرمسار کر دے۔ عاشق کبھی کبھی فراق کی حالت میں اپنے محبُوب کو شدت سے یاد کرتا ہے۔ وہ محبُوب کو یوں خیال میں لاتا ہے کہ جیسے اسے اپنے محبُوب کا وصال نصیب ہو گیا ہے۔ تابشؔ کا یہ شعر اسی جذبے کی ترجمانی کر رہا ہے:

یہ ہم جو ہجر میں اس کا خیال باندھتے ہیں
ہوا کی شاخ سے بوئے وصال باندھتے ہیں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

ہجر کا موسم بڑا طویل ہوتا ہے، اس کا ایک دن عاشق کو صدیوں جیسا لگتا ہے جب کہ وصل کا ایک دن اسے چند ساعتیں لگتا ہے۔ اسی لیے عشاق کہتے ہیں کہ یہ ہجر کا موسم گزرتا کیوں نہیں ہے، جاتے ہوئے تو لگتا ہے مگر جاتا نہیں ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ ہجر کا موسم بھی گزر کیوں نہیں جاتا
جاتا ہوا لگتا ہے مگر کیوں نہیں جاتا

(آسمان)

بس یہ کہنا تھا مجھے چھوڑ کے جانے والو
ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج نے مر جانا ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

سوز وگداز کو ہجر سے جدا کر کے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہجر وفراق کے عالم میں عاشق کے دل میں پیدا ہونے والی کیفیت کا نام سوز وگداز ہے۔ سوز وگداز ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والے درد ورنج کی اس کیفیت کو شعری اصطلاح میں سوز و گداز کہتے ہیں۔ شاعر جب درد وغم سے دوچار ہوتا ہے تو اُس کے اشعار میں سوز وگداز جھلک پڑتا ہے۔ میر تقی میرؔ سوز وگداز کے اوّلین شاعر ہیں۔ سوز وگداز کے ضمن میں علامہ نیاز فتح پوری رقمطراز ہیں:

''سوز وگداز کا تعلّق تاثرات روحانی کی اس دنیا سے ہے جسے مادیات سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر ہوتا بھی تو صرف اس قدر اس کو ذریعہ اظہار تاثر سمجھا جائے''(۶۸)۔

غزل اُردو شاعری کی ایک مقبول صنفِ سخن ہے، غزل پر شروع ہی سے سوز وگداز کے اثرات ملتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ پروفیسر تنویر حسین کی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے:

''غزل کی ایک اور اہم خصوصیّت درد وسوز اور سوز وگداز ہے، سوز وگداز کی بدولت غزل میں اثر آفرینی اور اثر انگیز جیسی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غزل چوں کہ وارداتِ قلبیہ اور اعلیٰ درجے کے امور ذہنی کا مظہر ہوتی ہے۔ اس

لیے ہجر ووصال، عشق ومحبت، غمِ دوراں اور غمِ جاناں کو جب تک سوز وگداز کی ہلکی آنچ نہ ملے اس وقت غزل نہ تو کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے نہ کسی کے دل پر اثر چھوڑ سکتی ہے۔ نہ کسی کے دل کو تڑپا سکتی ہے اور نہ ہی کسی محفل کو گرما سکتی ہے''(۶۹)۔

عباس تابش ایک دکھے ہوئے دل کے شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں سوز وگداز بدرجہ اتم موجود ہے۔ کبھی وہ اپنے زخم پرندوں کو دکھاتے ہیں اور کبھی درختوں کو دکھاتے ہیں۔ وہ اپنے محبُوب سے کہتے ہیں کہ جو شخص بھی مجھے ملتا ہے میری زندگی کے متعلّق پوچھتا ہے۔ میں اُن کو اپنا حال کیا بتاؤں، کیوں کہ ہر ملاقاتی صرف مجھ سے میرا نہیں تمہارے بارے میں بھی پوچھتا ہے۔ عباس تابش اُداس لہجے کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہ اشعار اسی بات کے عکاس ہیں۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

مری عمرِ گزشتہ کا خسارہ پوچھتے ہیں
ملاقاتی نہ جانے کیوں تمہارا پوچھتے ہیں

بس اتنا سوچ لینا تم کہ اب یہ اہلِ دنیا
فقط میرا نہیں مجھ سے ہمارا پوچھتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اے مرے دشت مزاجو! یہ مری آنکھیں ہیں
ان سے رومال بھی چھو جائے تو بادل ہو جائے
(رقصِ درویش)

اس دل کی تسلی ہوئی دلگیر سے لگ کر
کل رات میں رویا ہوں بہت میرؔ سے لگ کر

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کی شاعری میں سوز وگداز بھی ہے، درج بالا اشعار میں رنج وغم اور سوز وگداز کی کیفیات ملتی ہیں۔ شاعر کے دل میں جب احساس محرومی گزرتا ہے تو وہ اپنے اندر کی اس کیفیت کو اشعار میں بیان کر دیتا ہے۔ محبُوب کے بچھڑنے کا غم زخم تازہ کی طرح ہوتا ہے جو عاشق کو درد دیتا ہے۔ عباس تابش بھی اسی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ وہ اپنے اس درد کی نسبت میر تقی میر سے جوڑتے ہیں، کیوں کہ میرؔ بھی سوز وگداز کے شاعر ہیں اس لیے شاعر کہتا ہے کہ میں میرؔ کے گلے لگ کر رو لیتا ہوں تو مجھے تسلی ہو جاتی ہے۔ انھیں دیکھ کر میں اپنے غم بھول جاتا ہوں۔ میر مجھ سے زیادہ سوز وگداز رکھتے ہیں۔

حسن وجمال کا شاعر

عباس تابش کے کلام کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ایک جمال پرست شاعر ہیں۔ اُن کو کائنات کی خوب صورتی اور فطرت کے مناظر سے خاص محبت ہے۔ اس لیے وہ اپنے اشعار میں قدرت کے خوب صورت مناظر کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں منظر نگاری اور حقیقت نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ عورت حسن کا بہترین مرقع ہے، اس لیے عباس تابش نے ایسے حسن وجمال کا ذکر بکثرت کیا ہے۔ وہ اپنے محبُوب کے پیکر کا نقشہ ہی کھینچ لیتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا کہوں اُس نے تجھے کتنا حسیں پیدا کیا
تجھ کو پیدا کر کے پھر تجھ سا نہیں پیدا کیا

زندگی بھر چاہے جانے کی اذیت سے گزر
پیدا کرنے والے نے تجھ کو حسیں پیدا کیا

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عاشق کو اپنا محبُوب کائنات کی ہر شے سے زیادہ حسین وجمیل لگتا ہے، چاند، تارے، پھول، کلیاں سب اس کے محبُوب کے حسن کے سامنے شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ ان اشعار میں شاعر اپنے محبُوب کے حسن کی تعریف کرتا ہے کیوں کہ اسے اپنے محبُوب سا کوئی نہیں لگتا، شاعر کہتا ہے کہ کوئی ایک چیز میرے محبُوب کے حسن کی عکاسی نہیں کرسکتی۔ تابش کہتے ہیں کہ اے محبُوب مجھے ہر شخص میں تو ہی تو دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے میں ہر کسی سے تمہاری طرح کی محبت کرتا ہوں۔ عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایسا لگتا ہے سبھی عشق کسی ایک سے تھے
ایسا لگتا ہے مجھے ملتا رہا ایک ہی شخص

وہ جو میں اُس کی محبت بھی کسی اور سے کی
ان دنوں شہر کا ہر شخص لگا ایک ہی شخص

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبُوب میں ساری زندگی تیری آرزو میں گزارنا چاہتا ہوں لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تجھ پر میری چاہت کا الزام بھی نہ آئے۔ مگر ایسا نہیں ہوگا کیوں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ عباس تابش کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں یہ بھی چاہتا ہوں عشق کا نہ ہو الزام
میں یہ بھی چاہتا ہوں تیری آرزو کی جائے
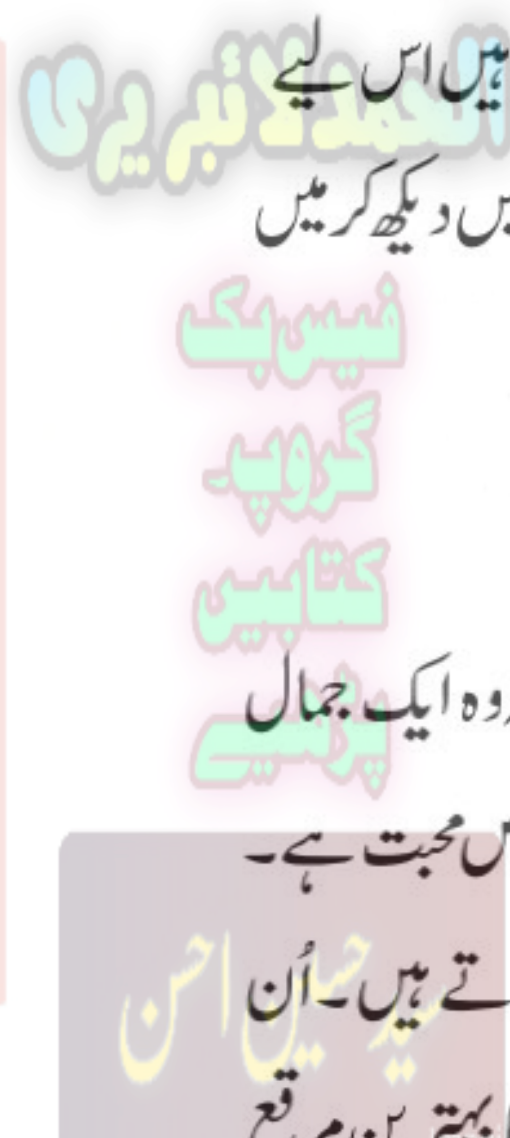
جس سے بنتا ہو تعلّق وہی ظالم پہلے
غیر ہوتا ہے نہ اپنوں کی طرح ہوتا ہے

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

شاعر کہتا ہے کہ عشق ایک ایسا مرض ہے جو لاحق ہو جائے تو اس کا علاج سوائے محبُوب کے کسی کے پاس نہیں ہوتا محبُوب ہی اس مرض کا مسیحا ہوتا ہے۔ پہلے جو انسان اجنبی ہوتا ہے اس کے ساتھ عشق ہو جانے کے بعد آدمی اسے اپنا بنا لیتا ہے جس شخص کو بندہ عام لوگوں کی طرح سمجھتا ہے، عشق ہونے کے بعد وہی شخص خدا کی طرح لگنے لگتا ہے:

بھلانا ، یاد کرنا اور پھر تم کو بھلا دینا
تمہارے بعد بھی کچھ سلسلے اچھے نکل آئے

(آسمان)

عاشق کو اپنے محبُوب سے ملنے اور دیدار کا اشتیاق ہمیشہ رہتا ہے مگر وہ انتظار ہی میں رہتا ہے کہ کب اسے وصالِ یار نصیب ہو۔ محبُوب کے دل میں عاشق کے لیے جو محبت ہے عاشق اس کا بھرم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دل کو یہی خوش فہمی رہے کہ میرا محبُوب بھی مجھ پر جان فدا کر سکتا ہے۔ اس لیے میں اسے ملنا نہیں چاہتا اگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا تو میرے دل کو بے حد صدمہ پہنچے گا۔

تنہائی و نارسائی

محبُوب اپنے حسن کے نشے میں مست ہوتا ہے اور کبھی اپنے عاشق کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ مدتوں اسے ہجر کی آگ میں جلاتا رہتا ہے، اسے کبھی وصال نہیں بخشتا۔ محبُوب اپنے عاشق سے بے وفائی و بے مروتی کرتا ہے کیوں کہ اسے اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے۔ عاشق کے ساتھ اس کے محبُوب کی یہ بے وفائی اسے کائنات میں تنہا کر دیتی ہے اور وہ سب

کچھ ہوتے ہوئے بھی بھری دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہے۔ محبُوب کو اس بات کی قطعی کوئی پروا نہیں کہ اُس کی اس بے مروتی سے عاشق کے دل پر کیا گزرے گی اور اس کا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

عباس تابش کی شاعری پڑھ کر یہی لگتا ہے کہ انھیں بھی کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہے، اسی لیے وہ اُداس دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے حسن کے ہاتھوں دھوکہ کھا کر تنہائی کو گلے لگا لیا ہے۔ اُن کی شاعری میں اس لیے تنہائی و نارسائی کا عنصر زیادہ ہے۔ وہ اکثر اشعار میں ہجر و ہجرت، نقل مکانی اور بے گھری کی بات کرتے ہیں۔ پرندوں کو اپنا محبُوب اور دوست سمجھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُنھیں انسانوں سے دھوکے ہی ملے ہیں، اسی لیے وہ درختوں اور پرندوں سے اپنا دل بہلا لیتے ہیں۔ اس تنہائی کی وجہ سے وہ پریشان بھی ہوئے ہیں، وہ اندر سے گھائل بھی لگتے ہیں۔ اسی لیے تابش کہتے ہیں کہ میں شعر کے ذریعے اپنے زخم زمانے کو دکھانا چاہتا ہوں مگر کوئی ایسا شعر ہوتا ہی نہیں جو اس سے بھی زیادہ میرا زخم دروں عیاں کر سکے۔ شاعر اس قدر تنہائی کا شکار ہے کہ وہ خود کو نامکمل اور ادھورا سمجھتا ہے، اسی لیے اپنے محبُوب کو اپنے پیکر میں شمار کر کے خود کو مکمل سمجھتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

تجھ کو گنتا ہوں میں اپنے آپ میں اس واسطے
تا کہ دنیا کو بتا پاؤں مکمل شخص ہوں

(رقصِ درویش)

عاشق اپنے محبُوب کی آمد کا منتظر ہے اور وہ نہیں آ رہا تو عاشق تنہائی سے دل برداشتہ ہو کر یوں کہہ دیتا ہے یہ شعر اس کیفیت کا خوبصورت عکاس ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ جانے کب تمہیں فرصت ملے گی آنے کی
تمہارے آنے کے دن تو گزرتے جاتے ہیں

(تمہید)

اب تو ہم یوں رہتے ہیں اس ہجر بھرے ویرانے میں
جیسے آنکھ میں آنسو گم ہو جیسے حرف کتاب میں چپ

(تمہید)

عباس تابش اپنی زندگی میں ہجر اور ویرانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ایک ویرانے میں رہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اے محبوب تمہارے بعد یہ گھر یہ شہر مجھے اُجاڑ لگتا ہے۔ عشاق اپنے محبوب کی راہگور میں راتیں گزار کر خود کو محبُوب کے ساتھ محسوس کرتے ہیں گھر سے سارا سامان لے کر اُس کی راہگور کی طرف چل پڑتے ہیں۔ محبُوب کی یاد میں اور اس کی آمد کے انتظار میں اپنی تنہائی کے کرب انگیز لمحات گزارتے ہیں۔ اسی بات کی عکاسی تابش بھی کرتے ہیں:

راتیں گزارنے کو تری رہگور کے ساتھ
گھر سے نکل پڑا ہوں میں دیوار و در کے ساتھ

(تمہید)

عباس تابش کی شاعری میں تنہائی عام ملتی ہے اُن کی شاعری کا مطالعہ کریں تو قاری کی گھنٹوں اداسی نہیں جاتی، وہ کس قدر تنہا زندگی گزار رہے ہیں ان کو ہر لمحہ اندر سے تنہائی ڈستی رہتی ہے۔ تنہائی کا یہ عالم اس شعر سے عیاں ہوتا ہے:

کوئی تو ہو کہ جس سے گلے مل کے روئیں ہم
گر تم نہیں تو گھر کے در و بام ہی سہی

شاعر کو اپنے اندر کی ویرانی و تنہائی کا سناٹا ہر وقت ڈستا رہتا ہے، جس سے وہ نڈھال ہو جاتے ہیں۔ تمام راستے اُسے ویران دکھائی دیتے ہیں:

راستہ اتنا بھی ویراں نہیں دیکھا جاتا
کوئی خوشبو، کوئی جھونکا، کوئی راہی آئے

(آسمان)

شاعر اس قدر تنہائی کا شکار ہے کہ اسے محبُوب نے کبھی وصال نہیں بخشا۔ وہ تنہائی میں اپنے محبُوب کو یاد کر کے اپنے پاس محسوس کر لیتا ہے۔ شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ اے محبُوب میں تمہیں اس حد تک یاد کرتا ہوں اس قدر تنہائی میں میرا تمہیں یاد کرنا مجھے اتنا شفاف کر دے گا کہ زمانے والوں کو مجھ میں تو صاف نظر آنے لگے گا۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اس قدر شفاف کر دے گی یہ تنہائی مجھے
دیکھنے والوں کو تو مجھ میں نظر آ جائے گا

اس لیے ڈھلنے نہیں دیتے تری قربت کا دن
زندگی میں وقفۂ شام و سحر آ جائے گا

(آسمان)

عباس تابشؔ کے پانچویں شعری مجموعہ "رقص درویش" کے کئی اشعار میں تنہائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہنس جب تالاب پر آتے ہیں تو یہ منظر شاعر سے دیکھا نہیں جاتا کیوں کہ اس سے اُن کی تنہائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اس قدر تنہائی سے ڈر گئے ہیں کہ اب جو کوئی ان کے پاس آتا ہے اسے جانے نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے عباس تابش اپنی اُداسی اور تنہائی کا ذکر اپنے اشعار میں بکثرت کرتے ہیں:
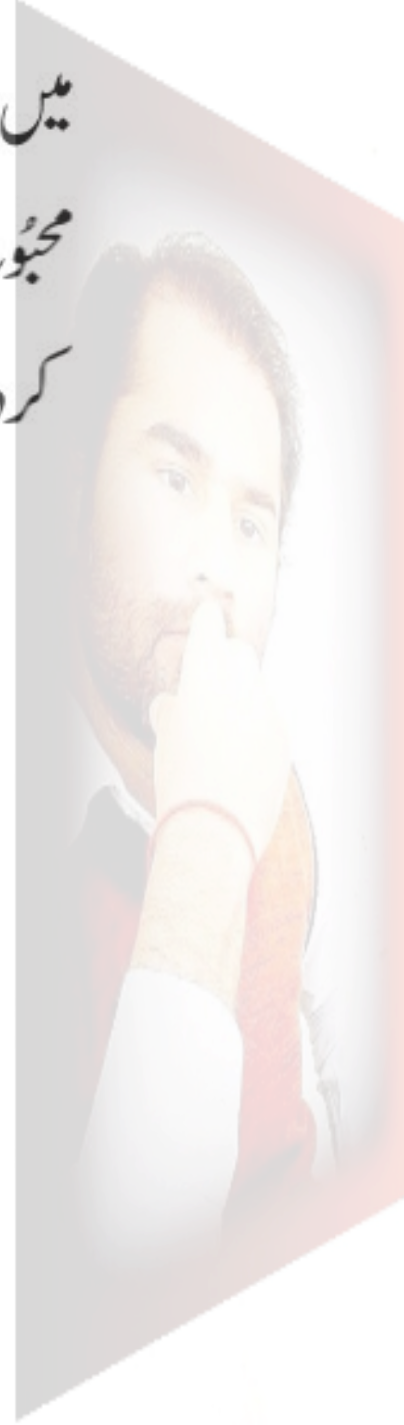
اس لیے اب میں کسی کو نہیں جانے دیتا
جو مجھے چھوڑ کے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں
(رقصِ درویش)

اک مقام ایسا بھی آیا مرے بچھڑے ہوئے دوست
میں نے تجھ کو بھی اُداسی میں خلل جانا تھا
(رقصِ درویش)

نقل مکانی و بے گھری

عباس تابش کی زندگی کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے حقیقی زندگی میں کثرت سے نقل مکانی کی ہے۔ میلسی میں پیدا ہونے والے اس شاعر نے لاہور کو مسکن بنایا اور پھر لاہور میں بھی اُنھوں نے کئی مکان تبدیل کیے۔ چوں کہ اُن کی ملازمت کی نوعیت ایسی ہے کہ تبادلہ ہوتا رہتا ہے مزید براں وہ اکثر ملک سے باہر رہتے ہیں۔ اس لیے نقل مکانی و بے گھری کا ذکر عباس تابشؔ کی غزلوں میں کثرت سے ملتا ہے، اشعار ملاحظہ کیجیے:

عشق نے پھینک دیا وقت سے باہر اُس کو
ہو مکاں میں تو کوئی نقل مکانی مانگے
(رقصِ درویش)

لے چلوں میں ساتھ تجھ کو پر کہاں
اے ہوائے شہر میرا گھر کہاں
(تمہید)

جس پہ چلتے ہوئے سوچا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اب وہ رستہ بھی مجھے شہر بدر لگتا ہے

شاعر کا محبُوب کیا شہر سے رخصت ہوا ہے کہ اُسے سارا شہر ہی رختِ سفر باندھے ہوئے لگتا ہے۔ ان اشعار میں نقل مکانی اور ہجر و ہجرت کا تجربہ موجود ہے۔ عباس تابش نے بے بسی اور بے گھری کا ذکر اپنی شاعری میں خوب کیا ہے۔ وہ دشت و صحرا میں رہتے ہیں اُنھیں گھر جیسی سہولت ہی میسر نہیں آئی۔ بے گھری کے حوالے سے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہمیں تو خاک پہ حکمِ سفر دیا اُس نے
وہ اور ہوں گے جنہیں کوئی گھر دیا اُس نے
(آسمان)

عباس تابش کی شاعری میں دربدری اور بے گھری کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اُن کو اندر سے کوئی غم کھائے جا رہا ہے اس لیے وہ بھری دنیا میں بھی خود کو تنہا سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی خود کو بے گھر سمجھتے ہیں۔ ان اشعار میں نقل مکانی اور بے گھری کا ذکر ملتا ہے:

آنکھوں تک آ سکی نہ کبھی آنسوؤں کی لہر
یہ قافلہ بھی نقل مکانی میں کھو گیا
(تمہید)

اک دربدری ہم کو بھی لاحق ہے مگر ہم
کونجوں کی طرح شور مچایا نہیں کرتے
(آسمان)

پرندے پوچھتے ہیں تم نے کیا قصور کیا
وہ کیا کہیں جنہیں ہجرت نے گھر سے دور کیا
(آسمان)

عباس تابش کہتے ہیں کہ اُس کی بھی زندگی کٹ جاتی ہے جس شخص کا اپنا گھر نہیں ہوتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

یقیں آتا نہیں تو مجھ کو یا مہتاب کو دیکھو

کہ رات اُس کی بھی کٹ جاتی ہے جس کا گھر نہیں ہوتا

(آسمان)

عباس تابش کے اُسلوب کی شناخت اُن کی شاعری میں بے گھری، دربدری اور نقل مکانی بھی ہے۔ اُن کی غزل میں بکثرت ہجر و ہجرت کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہی بات انھیں معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔

فطرت نگاری

فطرت ہر کسی کو خوبصورت لگتی ہے۔ فطرت خدا کی عین قدرت کا نام ہے۔ انگریزی شاعروں میں ولیم ورڈزورتھ کو شاعر فطرت کہا گیا ہے۔ اُردو میں جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور عباس تابش فطرت کے شاعر ہیں، تابش کو فطرت کے مناظر سے خاص الفت ہے۔ اُن کی شاعری فطرت کی عکاس ہے۔ اُنھوں نے کائنات و قدرت کے حسین مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ اُنھوں نے قدرت کے مختلف رنگوں کو اپنے لفظوں میں عکس بند کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں درخت، جھیل، تالاب، سمندر، دریا، پہاڑ، صحرا، دشت، باغات، پرندے، پھول، چاند، تارے اور آسمان سمیت قدرت کے کئی حسین مناظر کا ذکر ملتا ہے۔ وہ کائنات کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں، کائنات کے حسن کا گہرا مشاہدہ ان کی شاعری میں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام بھی فطرت کے مناظر پر مبنی ہیں، ''آسمان'' اور ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' جیسے شعری مجموعوں میں فطرت نگاری کی گئی ہے۔ فطرت کے موضوع پر عباس تابش کی شاعری میں سے منتخب کیے گئے چند

اشعار ملاحظہ کیجیے:

کونجیں نکلی ہیں پہاڑوں کے سفر پر لیکن

رُت بدلنے پہ بھی بدلا نہ ٹھکانہ دل کا

(رقص درویش)

عجیب حسرتِ پرواز مجھ میں ہوتی تھی

میں کاپیوں میں پرندے بنایا کرتا تھا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

یہ شہر سے باہر کا کوئی خواب ہے تابش

یہ جھیل پہ اُڑتے ہوئے دو چار پرندے

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ان اشعار کا تجزیہ کریں تو عباس تابش شاعر فطرت ہیں، اُنھوں نے کونجوں، پہاڑوں، رت، پرندوں، جھیل، چاند اور صنوبر وغیرہ کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے ایک شعر میں شاخِ صنوبر کی خوب صورت انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے اس کے لمبے قد کا نقشہ کھینچا ہے اور چاند کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس طرح کے کئی مناظر اُنھوں نے اپنی غزلوں میں عکس بند کیے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی

اور اس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کو زمین اور آسمان اپنے وجود کا حصّہ لگتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کے مناظر کو خود سے الگ نہیں سمجھتے۔ اُنھوں نے کائنات کو بڑے قریب سے دیکھا ہے، اُنھوں

نے کائنات کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کے مختلف رنگوں کو شاعری میں بھر دیا ہے۔ اُن کی شاعری میں قوس قزح سی بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کل شب بھی یہی چاند تھا افلاک پہ روشن
اس طرح کا ارماں ہمیں کل شب تو نہیں تھا
(تمہید)

کیا کیا خشک زمینیں رستہ دیکھتی ہیں منجدھار کا
کیا کیا دریا رہ جاتے ہیں ساحل سے سر پھوڑ کے
(تمہید)

ہم اوس کے مانند گلابوں میں رچیں کیا
اشکوں کی طرح آنکھ سے جاری بھی نہیں ہم
(تمہید)

درج بالا اشعار میں عباس تابشؔ نے خوبصورت پیرائے بیان میں فطرت خوش نما کی عکاسی کی ہے۔ یہی فطرت نگاری اُن کے کلام میں نزاکت وحسن پیدا کرتی ہے کیوں کہ اصل حسن تو فطرت میں ہے۔ عباس تابش نے ہر موضوع کی طرح فطرت کے موضوع پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ اُنھوں نے ان اشعار میں فلک، دریا، اوس، گلاب، جنگل، آسمان، آبشار، دشت وجبل تھل اور صحرا کا ذکر کیا ہے۔ عباس تابش کے اسی انداز سے اُن کے منفرد اسلوب کو شناخت ملتی ہے۔

سیاسی وسماجی حالات

شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ عوام کے مسائل وضروریات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ عوام کی رہنمائی واصلاح کرتی ہے۔ ملک وقوم کو ظلمت کے اندھیروں سے نکال

کر روشن صبح بھی دکھاتی ہے۔ شاعری غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کو اقبالؔ کی طرح آزادی کی نوید بھی سناتی ہے۔ شاعری ہی لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگاتی ہے اور ان میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرتی ہے۔ شاعری معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ناانصافیوں کی عکاسی کرتی ہے اور ملک کے سیاسی حالات کا تذکرہ بھی شاعری میں ملتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ اور حبیب جالب نے خوب سیاسی ومزاحمتی شاعری کی ہے۔ اسی بات کو جدید اُردو غزل کے اولین علمبردار مولانا الطاف حسین حالیؔ اپنی کتاب ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

> ''یورپ میں پولیٹیکل مشکلات کے وقت قدیم سے پویٹری کو قوم کی ترغیب وتحریص کا زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں...... یورپ میں لوگوں نے شعر سے بہت بڑے کام لیے ہیں خصوصاً ڈریمٹک پوئٹری نے یورپ کو جس قدر فائدہ پہنچایا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے اسی واسطے شیکسپیر کے ڈرامے جن سے پولیٹیکل، سوشل اور مورل طرح کے بے شمار فائدے اہلِ یورپ کو پہنچے ہیں''(۷۰)۔

عباس تابش ایک انسان دوست شاعر ہیں۔ اُن کو اپنے ملک اور عوام سے دلی محبت ہے، وہ ہر وقت ملک وقوم کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ وہ لوگوں میں محبتیں بانٹتے ہیں اور نفرتیں ختم کرتے ہیں۔ آج کے اس نفسانفسی کے دور میں ہر انسان کو اپنے فائدے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ اس دور میں اُنھوں نے اپنی شاعری کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

انسان کہلانے کا حق دار وہ ہے جس سے دوسرے انسان محفوظ رہیں، وہ لوگوں سے محبت کرے اور اسی لیے انسان کو اشرف المخلوق کہا گیا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

(علامہ اقبال)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے، دکھ درد بانٹنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں معاشرتی ناہمواریوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اُن کی شاعری سیاسی حالات، معاشی تنگ دستی اور اس سے متاثر ہونے والے لوگوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ عباس تابشؔ کا یہ خوب صورت شعر ملاحظہ کیجیے، اس میں ملکی اور عہدِ حاضر کی ترجمانی کی گئی ہے:

کارِ دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی مری خیر منانے لگ جائیں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اس شعر میں شاعر نے اپنے ملک کی موجودہ صورت حال اور حالات و واقعات کی ترجمانی کی ہے۔ ایک شخص صبح اپنے گھر سے کام کے لیے نکلتا ہے تو گھر والوں کو اس کے صحیح سلامت لوٹ آنے کی فکر لگی رہتی ہے کیوں کہ ہمارا ملک دہشت گردوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ عباس تابش بڑے حساس دل کے شاعر ہیں، وہ ملک میں اس طرح کے حالات دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ ملک اس وقت دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے کسی کی جان محفوظ نہیں۔ کسی کا مال محفوظ نہیں۔ اُنھوں نے ملک میں ہونے والے دل خراش واقعات کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اُنھوں نے عصر حاضر کے سیاسی و سماجی حالات و مسائل کو اپنا موضوع بنایا

اور اس کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

حالتِ جنگ میں آدابِ خور و نوش کہاں
اب تو لقمہ بھی اُٹھاتا ہوں میں تلوار کے ساتھ

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

اس وقت ملک حالتِ جنگ سے گزر رہا ہے، حالات بڑے ابتر ہو گئے ہیں۔ شاعر نے اس صورت حال کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔ عباس تابش کا یہ شعر اسی بات کی عکاسی کرتا ہے روز درجنوں لوگ بے گناہ مر جاتے ہیں:

اُس کو کیا حق ہے یہاں بارود کی بارش کرے
اُس کو کیا حق ہے مرے رنگلے کبوتر مار دے

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابشؔ بڑے ہی پر امن آدمی ہیں، وہ کبھی کسی کے ساتھ فساد نہیں چاہتے۔ اُن کی شاعری میں امن و محبت کا پیغام ملتا۔ وہ کہتے ہیں:

اس بات پہ دنیا سے مری بنتی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اٹھا اور قلم رکھ

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

ملک میں آئے روز حادثے ہوتے رہتے ہیں، دہشت گردوں نے ملک کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ روزانہ کئی لوگ بے گناہ مار دیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر تابش نے یہ شعر کہا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

کیا ہم جنازہ گاہ میں ہی جمع ہوں گے دوست
کیا اتفاق شہر کسی سانحے میں ہے
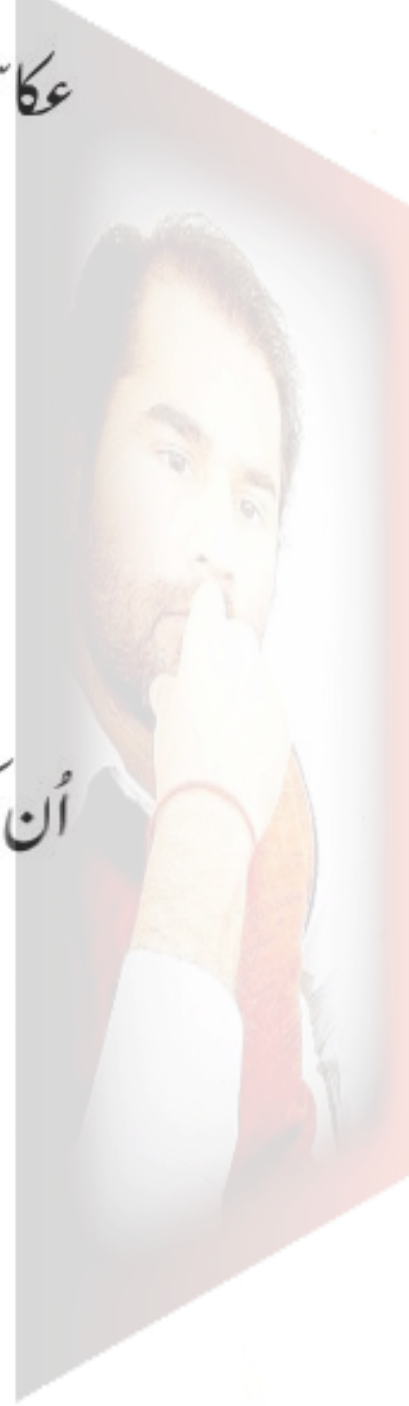
میرے اس کوشش میں بازو کٹ گئے
چاہتا تھا صلح تلواروں کے بیچ

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ہمارے معاشرے میں خودغرضی حد سے بڑھ گئی ہے اور ظلم و بربریت کی فضا ہے۔ عباس تابش اجتماعی شعور رکھتے ہیں، وہ ظلم وستم، جبر، جنگ، خونریزی، جہالت، تنگ نظری اور تعصب سے بیزار ہیں۔ عباس تابش انسان دوست شاعر ہیں، وہ لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں۔

تخیل اور خوابوں کا شاعر

عباس تابش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''خیال وخواب'' کا شاعر ہے، جس طرح ابن انشا ''چاند نگر'' کا شاعر ہے، ''ہجرت'' کے شاعر ناصر کاظمی، پروین شاکر ''خوشبو'' کی شاعرہ ہے اسی طرح عباس تابش ''پرندوں، درختوں اور خوابوں'' کا شاعر ہے۔ خواب ہر انسان دیکھتا ہے، کچھ خواب انسان سوتے ہوئے دیکھتا ہے اور کچھ جاگتے ہوئے دیکھتا ہے۔ عباس تابش نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے خوابوں میں پرویا ہے۔ اُنھوں نے دنیا کے مصائب ومسائل سے علاحدہ ہوکر اپنی دنیا خوابوں میں بسالی ہے۔ شاعری میں خواب سکون وراحت کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ شاعر اپنے خوابوں میں گم ہوکر دنیا کے غموں سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ خوابوں میں وہ نامکمل خواہشوں کی تکمیل پالیتا ہے تخیل کو انگریزی میں ایمجینیشن کہتے ہیں۔ تخیل کی تعریف مولانا الطاف حسین حالی یوں کرتے ہیں:

> ''یہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربہ یا

> مشاہدہ کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیا ہوتا ہے یہ اُس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتا ہے اور پھر اُس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتا ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے ......تخیل کا عمل اور تصرف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے'' (۷۱)۔

عباس تابش بڑے زرخیز تخیل کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی یہی قوت متخیلہ ان کو معاصر شعرا میں ممتاز کرتی ہے کیوں کہ جس قدر یہ قوت اعلیٰ ہوگی اُسی قدر وہ شاعر بڑا ہوگا۔ خواب وخیال کی وسعتیں ہی کسی شاعر کو اہم شاعر بناتی ہیں۔ اسی بات کو الطاف حسین حالیؔ ''مقدمہ شعروشاعری'' میں اس طرح لکھتے ہیں:

> ''یہ قوت جس قدر شاعر میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی، اسی قدر اُس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر یہ ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اُس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوسکتا'' (۷۲)

عباس تابش کی شاعری آمد وآورد کا حسین امتزاج ہے۔ ہر شاعر کو آمد ہوتی ہے یہ ایک خداداد صلاحیت ہے، ہر انسان الگ الگ خوبیوں اور صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ ہر شاعر کو اُس کی استطاعت کے مطابق آمد ہوتی ہے اور ہر شاعر آمد کے ساتھ آورد بھی کرتا ہے اگرچہ آورد کی وجہ سے شعر کا قدرتی حسن اور بے ساختہ پن خراب ہوجاتا ہے مگر اس کے بغیر

اچھا اور بڑا شعر بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آمد و آورد کے بارے میں حالی کہتے ہیں:

''ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ موثر ہوتا ہے جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو'' (۴۳)۔

اس حوالے سے عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کسی میں اُس کے خواب تھے کسی میں اُس خال و خط
اُسے نہ میں بھلا سکا محبتوں کے درمیاں
(رقصِ درویش)

گلہ نہیں ہے مجھے مرگِ نیم خوابی کا
مقدروں میں لکھا ہے یونہی تو یوں ہی سہی
(تمہید)

طلسمِ خواب سے میرا بدن پتھر نہیں ہوتا
مری جب آنکھ کھلتی ہے میں بستر پر نہیں ہوتا
(آسمان)

عباس تابش کی شاعری آمد و آورد سے لبریز ہے۔ اُنھوں نے بڑی غور و فکر کے بعد اشعار تخلیق کیے ہیں۔ اُن کے اندر کا نقاد انھیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ کانٹ چھانٹ کر شعر تخلیق کیا جائے۔ عباس تابش نے جیسے شاعری نہیں کر افٹنگ کی ہے۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ اُن کی شاعری دیکھ کر یہ لگتا ہے کہ وہ ایک مصرعے کو کئی بار لکھتے ہیں۔ اُن کے کسی مصرعے میں کوئی جھول نظر نہیں آتا، تابش بڑے باکمال شاعر ہیں۔ آمد و آورد کے حوالے

سے حالی لکھتے ہیں:

''روما کے مشہور شاعر ورجل کے حال میں لکھا ہے کہ صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور دن بھر اُن پر غور کرتا تھا اور اُن کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہا کرتا تھا کہ ریچھنی بھی اسی طرح اپنے بدصورت بچوں کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت بناتی ہے......آریسٹو شاعر جس کے کلام میں مشہور ہے کہ کمال بے ساختگی اور آمد معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مسودے اب تک فریدا علاقہ، اٹلی میں محفوظ ہیں اُن مسودوں کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو اشعار نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کانٹ چھانٹ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ملٹن بھی اسی بات کو تسلیم کرتا ہے کہ نہایت سخت محنت اور جانفشانی سے نظم لکھی جاتی ہے اور نظم کی ایک ایک بیت میں اُس کے سڈول ہونے سے پہلے کتنی ہی تبدیلیاں پے در پے کرنی پڑتی ہیں'' (۴۴)

ہر انسان کی زندگی میں خوابوں کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، انسان سوتے جاگتے کوئی نہ کوئی خواب دیکھتا رہتا ہے۔ ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے سارے خواب پورے ہو جائیں۔ وہ تمام عمر اسی کوشش میں جُتا رہتا ہے۔ شاعری میں خواب دیکھنا اور خوابوں کا ذکر کرنا ایک نہایت خوبصورت عمل ہے۔ خواب بڑے حسین لگتے ہیں اور اگر خواب ٹوٹ جائیں تو انسان پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ خشک پتوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔

عاشق اپنے محبُوب کے خواب وخیال میں رہتا ہے۔اسے محبُوب کے سراپا کا خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے، وہ خواب وخیال ہی میں وصالِ یار کے مزے لے لیتا ہے۔عباس تابش کی شاعری میں سے تخیل کے بارے میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوئی اندیشہ تہِ محراب بھی میرا نہیں
روشنی کیا روشنی کا خواب بھی میرا نہیں
(تمہید)

خواب میرے یوں ہیں تابشؔ جس طرح پانی پہ ریت
یہ شگون اچھا نہیں ہے دیدۂ نم کے لیے
(آسمان)

عباس تابش کی شاعری میں جابجا خوابوں کا ذکر ملتا ہے انھیں خواب دیکھنا اچھا لگتا ہے،ان کے اعلیٰ تخیل کے چند اورنمونے ملاحظہ کیجیے:

وہی گھڑی تھی سفر میں قیام کرنے کی
ترے خیال نے جب ہم کو گردِ راہ کیا
(آسمان)

پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابشؔ
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

میں تجھ سے کسی اور زمانے میں ملا ہوں
خوابوں سے اُدھر عالمِ فانی کے علاوہ
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

محبُوب کا خیال پیار کو زندہ رکھتا ہے۔اس عالمِ تصور میں عاشق محبُوب کی گلیوں کے چکر بھی کاٹ آتا ہے اور خیال وخواب میں ہی سرشاری محسوس کرتا ہے۔غالب کا یہ مصرع ملاحظہ کیجیے:

''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''

غالب نے بھی خوابوں میں زندگی گزاری تھی،اسی طرح عباس تابش خوابوں کے شاعر ہیں کیوں کہ وہ بھی روایت سے جڑے ہوئے جدید اُردو غزل کے شاعر ہیں،اُنھوں نے روایت سے اکتساب کیا ہے۔عباس تابش کی غزل جدید ہے مگر اس کی شاخیں روایت کے برگد سے پھوٹی ہیں۔اُنھوں نے میرؔ وغالبؔ سمیت دیگر اساتذہ کی روایت کو نئی شکل دے کر قائم رکھا ہوا ہے۔

حب الوطنی سے سرشار شاعری

انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ملک، اپنی دھرتی سے والہانہ محبت و لگاؤ رکھتا ہے۔آدمی کو قدرتی طور پر اپنے آبائی علاقے اپنے دیس سے اُنس ہوتا ہے۔عباس تابش کو بھی اپنے دیس سے بے پناہ محبت ہے۔وہ بڑے محبِّ وطن انسان ہیں،اُن کی شاعری حب الوطنی سے سرشار شاعر کی شاعری ہے۔یہ خطۂ ارضی ہمارے آباؤاجداد نے بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔اس لیے ہمیں اس کی اہمیّت ہے۔آج کل ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں،امن وامان کا مسئلہ خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔بے روزگاری پھیل گئی ہے جرائم اور دہشت گردی نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔عباس تابش نے ان تمام مسائل کا ذکر کیا ہے۔وہ موجودہ ملکی حالات سے سخت پریشان ہیں۔عباس تابش کہتے ہیں کہ مجھے حکمرانوں اور اُن کے مخالفین سے کوئی غرض نہیں میری ساری وفاداریاں اپنی دھرتی کے ساتھ ہیں۔یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اک ٹہنی پر پھولے پھلے ہیں پاکستان اور میں
ہر موسم میں ساتھ رہے ہیں پاکستان اور میں

کالی رات، ہوا طوفانی ، مولا پار اتار
ایک ہی کشتی میں بیٹھے ہیں پاکستان اور میں
(آسمان)

عباس تابش بڑے محبِّ وطن انسان ہیں اُن کو ملک کے حالات دیکھ کر دلی دکھ ہوتا ہے۔ وہ ملکی حالات کا ذکر اپنے اشعار میں کرتے ہیں عباس تابش کی شاعری وطن کی محبت کے جذبوں کو ابھارتی ہے اور اس سے اصلاح قوم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو پرندے مار دے سرو و صنوبر مار دے
تیری مرضی جس کو دہشت گرد کہہ کر مار دے

تو نے جس کے ڈھونڈنے کو بھیج دی اتنی سپاہ
یہ نہ ہو وہ تجھ کو تیرے گھر کے اندر مار دے

اُس کو کیا حق ہے یہاں بارود کی بارش کرے
اُس کو کیا حق ہے مرے رنگلے کبوتر مار دے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

موت وحیات کا فلسفہ

فرمانِ باری تعالیٰ ہے ''ہر جان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے'' موت ایک حقیقت و صداقت ہے، موت برحق ہے جس کا ہر جاندار شے کو سامنا کرنا پڑے گا۔ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس دنیائے فانی سے رحلت کر جاتے ہیں یہ نظامِ کائنات ہے کہ کوئی آ رہا ہے تو کوئی جا رہا ہے۔ کسی کو یہاں کوئی ثبات نہیں ہے۔ اُردو شاعری کی بات کریں تو اس کا دامن موت وحیات کے فلسفوں سے بھرا پڑا ہے۔ بے شمار شعرا نے حیات وموت کے مضامین اپنے اشعار میں باندھے ہیں ۔موت کا موضوع ادیبوں، فلاسفروں، اسکالروں کی فکر کا مرکز رہا ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر پاروں میں بھی موت وحیات کے موضوعات ملتے ہیں، ہر ادیب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں آغا ناصر اپنی کتاب ''گمشدہ لوگ'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''موت اور زندگی ایسے موضوعات ہیں جو صدیوں سے شاعروں ، ادیبوں، ڈرامہ نگاروں فلسفیوں، سائنسدانوں، دینی رہنماؤں اور دانشوروں کی فکر کا محور ہیں ۔ ان موضوعات پر ہر دور، ہر ملک، ہر زبان میں لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ شاعروں نے اپنے لفظوں سے گلوکاروں نے اپنی آواز سے زندگی اور موت کے ان گنت گیت سنائے۔ عظیم ڈرامہ نگاروں اور کہانی نویسوں نے نت نئی داستانیں اور قصے لکھے اور مذہبی پیشواؤں اور فلسفیوں نے موت وحیات کے موضوع پر مختلف نظریات

اور توجیہات پیش کیں'' (۷۵)۔

عباس تابش نے بھی حیات وموت کے مضامین کو اپنی شاعری کے شکنجے میں کسا ہے۔موت کے بغیر زندگی اور زندگی بنا موت کے کوئی معنی و اہمیّت نہیں رکھتی ہے۔موت و حیات کا آپس میں گہرا تعلّق ہے۔موت ایک دائمی زندگی ہے جس کی حقیقت جان کر ہی زندگی کو دوام ملتا ہے۔عباس تابش کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

بس اتنا حصّہ ہے میرا مکانِ ہستی میں
فصیل اور کسی کی ہے کھڑکیاں میری
(تمہید)

میں کیسے اپنے توازن کو برقرار رکھوں
قدم جماؤں تو سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں
(تمہید)

عباس تابش نے ان اشعار میں زندگی اور موت کا گہرا فلسفہ بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے اس میں کوئی پاؤں گاڑ کر نہیں بیٹھا۔وہ کہتے ہیں کہ میری جان بھی کسی کی دی ہوئی ہے۔عباس تابش کہتے ہیں کہ یہ زندگی عارضی ہے میں قدم جماؤں تو میری سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں۔اُنھوں نے شاعری میں فلسفیانہ باتیں کی ہیں۔درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ بات سچ ہے کہ ہم تھے فانی، فنا ہماری سرشت میں تھی
مگر کسی کے لیے ہمیں لازوال ہونا تو چاہیے تھا
(آسمان)

بچپن کا دور عہدِ جوانی میں کھو گیا
یہ امر واقعہ بھی کہانی میں کھو گیا

لہروں میں کوئی نقشہ کہاں پائیدار ہے
سورج کے بعد چاند بھی پانی میں کھو گیا
(تمہید)

بحیثیت مسلمان ہم سب کا موت پر پختہ یقین ہے کہ موت اٹل حقیقت ہے، ہر جاندار شے نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔اسی بات کو عباس تابش نے اپنے اشعار میں پرویا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس جہان میں کوئی شے پائیدار نہیں ہر شے فانی اور ختم ہو جانے والی ہے۔بچپن کے بعد جوانی اور پھر بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔جس طرح پانی کی لہروں میں کوئی نقشہ پائیدار نہیں ہوتا اسی طرح یہ زندگی پائیدار نہیں ہے۔اس لیے ہمیں اگلے جہان کی فکر کرنی چاہیے جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔ان اشعار میں عباس تابش نے کافی مذہبی رنگ اپنایا ہے۔عباس تابش ایک با کمال اور منفرد اسلوب کے شاعر ہیں، جدید اُردو غزل میں اُن کو اہم مقام حاصل ہے۔

منظر نگاری اور پیکر تراشی

شاعری میں منظر نگاری اور تصویر کشی شاعری کا حسن دوبالا کر دیتی ہے۔اس عنصر کو شاعری میں خاص اہمیّت حاصل ہے۔منظر نگاری کے ذریعے قاری آسانی کے ساتھ شعر کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔عباس تابش کمال مہارت کے ساتھ منظر نگاری کرتے ہیں۔اُن کی غزلیں جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔تابش کے اشعار میں الفاظ پیکر بن کر بولنے لگتے ہیں، ہنسنے لگتے ہیں اور سسکنے لگتے ہیں۔اُنھوں نے اپنی شاعری میں فطرت اور حقیقت کے رنگ

بھر دیے ہیں، تابش کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے کہ قاری براہِ راست وہ منظر دیکھ رہا ہے۔
تابش کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ بانہیں ڈالتے ہیں ہم کسی کی گردن میں
نہ اپنے گرد انا کا حصار کھینچتے ہیں
(تمہید)

آ پڑی صحن میں کیوں اس کی ضرورت تابشؔ
وہ تو کہتا تھا کہ گھر بنتے ہیں دیواروں سے
(تمہید)

عباس تابش خوب صورت لہجے کے شاعر ہیں اُنھوں نے شعر نہیں نقشے کھینچے ہیں وہ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور مصور بھی ہیں۔ اُنھوں نے ان اشعار میں کمال فنی مہارت سے تصویر کشی کی ہے۔ دوسرے شعر میں کہتے ہیں دیواروں سے گھر بنتے ہیں لیکن اب اس دیوار نے صحن کو تقسیم کر دیا ہے۔ اُنھوں نے جائیداد کی تقسیم اور دو بھائیوں میں علاحدگی کی خوب منظر نگاری کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عباس تابش شاعر کم منظر نگار زیادہ ہیں۔ منظر نگاری کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

سنہری مچھلیاں، مہتاب اور کشتی کے اندر ہم
یہ منظر گم تھا پھر بھی جھیل پر جاتے تھے ہم دونوں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ہم کنارے پہ سلگتے ہوئے پیڑوں کی طرح
آپ تصویر میں دریا کی جگہ رہتے ہیں
(رقصِ درویش)

درج بالا اشعار میں صحن کی تقسیم، جھیل، مہتاب، دریا کی منظر نگاری کتنے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ عباس تابش اپنے اشعار میں درختوں، پرندوں، آسمان، چاند، تاروں سمیت ملکی مسائل اور معاشرتی و سیاسی حالات کی منظر کشی کمال فنی مہارت سے کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں پیکر تراشی اور منظر نگاری کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

اخلاقی قدروں کا شاعر

عباس تابش کی شاعری میں اخلاقی قدروں پر زور دیا گیا ہے کیوں کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں اخلاقی قدریں خاص اہمیّت رکھتی ہیں۔ ان قدروں کے بغیر مثالی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے۔ اُسے سوچ اور فکر دے کر تمام مخلوقات سے افضل بنا دیا ہے۔ مگر انسان خود پرستی، لالچ اور حرص و ہوس کے باعث اتنا گر گیا ہے کہ انسانیت کے تقاضے بھول گیا ہے اور انسانیت کے لبادے میں حیوانیت کا روپ دھار چکا ہے۔ معاشرے میں منافقت، جھوٹ، لوٹ مار اور قتل و غارت گری عام ہے۔ شاعری کا تعلّق اخلاق کے ساتھ ہے اور یہی بات تابش کے کلام میں دیکھنے میں آئی ہے۔ اس بارے میں حالیؔ ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کا اُس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلّق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں شعر اگرچہ براہِ راست علمِ اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم

اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں‘‘(۶۷)۔

عباس تابش کے سخن میں اخلاقی اقدار اور معاشرتی رویوں کا ذکر ملتا ہے۔اُن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر فطری، غیر مرئی اور خیالی وفرضی کہانیوں اور جہانوں کا ذکر نہیں کرتے۔اُن کی شاعری حقیقت پسندانہ شاعری ہے۔اُنھوں نے معاشرے کے مسائل کو شدت سے محسوس کیا ہے۔عباس تابش انسان سے محبت کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں وہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں یہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا
(اقبال)

خدا نے انسان کو ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے کے لیے پیدا کیا ہے مگر خود پرستی سے آدمی اس قدر اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے کہ وہ ظلم وستم ،خونریزی،تنگ نظری اور تعصب پر اتر آیا ہے۔اب آدمی ہی آدمی کا دشمن ہے۔عباس تابش بڑے حساس دل کے مالک ہیں اور شاعر ویسے بھی حساس ہوتا ہے،اس لیے وہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے نیک جذبات اور ہمدردی رکھتے ہیں۔اُنھوں نے شاعری کے ذریعے محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیا ہے۔

عباس تابش سمجھتے ہیں کہ انسان کی عزت وتکریم ہی انسانیت کی میراث ہے۔ عباس تابش بڑے انسان دوست شاعر ہیں۔انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنا ان کے اشعار سے جھلکتی ہے اور سب احباب ان سے خوش ہیں۔اُنھیں کسی کو مصیبت میں دیکھ کر سخت تکلیف ہوتی ہے۔وہ انسانیت کی تذلیل پر سخت احتجاج کرتے ہیں۔وہ معاشرے کے

رویوں اور اقدار کا ذکر جا بجا اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

دیکھا نہ جائے دھوپ میں جلتا ہوا کوئی
میرا جو بس چلے کروں سایہ درخت پر
(آسمان)

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے اپنے اشعار میں انسانی فلاح ،حقوق العباد،امن وآشتی کا درس دیا ہے۔اُنھوں نے معاشرے کے مسائل پر قلم اُٹھایا ہے۔انسان انسانی اقدار کو بھول گیا ہے۔عباس تابش نے شاعری کے ذریعے ان معاشرتی رویوں کی نشاندہی کی ہے۔

(س) معاصر اُردو غزل میں عباس تابش کا مقام و مرتبہ

کسی ادیب، شاعر یا فنکار کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھنے اور اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لیے اُس کے معاصرین اور عہد کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہوتا ہے کیوں کہ ہم عصروں کے بغیر کسی بھی فنکار کے فن پارے کے معیار کا اندازہ لگانا کسی طور درست نہیں ہوتا ہے۔ عباس تابشؔ نے جب شعری اُفق پر آنکھ کھولی تو اُس وقت پاکستان دو لخت ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے اُن کی غزل پر کوئی رائے قائم کرنے کرنے کے لیے سقوطِ مشرقی پاکستان، بالخصوص ۸۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک کی غزل کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ۸۰ء کی دہائی میں رونما ہونے والے شعرا کی کھیپ بڑی زرخیز تھی اس میں عباس تابش کا نام سرفہرست ہے۔ اس حوالے سے حسن عباسی کہتے ہیں:

> ''۸۰ء کی دہائی کے بعد جو شاعر ادبی منظر نامے پر اُبھر کر سامنے آئے اُن میں سب سے منفرد اور نمایاں نام عباس تابش کا ہے...... بیشتر شعرا نے اپنی غزل کو جدّت کے دائرہ کار تک محدود رکھا...... یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد یکسانیت کا شکار ہو گئے۔ عباس تابش غالباً واحد شاعر ہیں جنھوں نے جدّت کے ساتھ ساتھ روایت کا نہ صرف بھرپور مطالعہ کیا بلکہ اس کو مکمل طور پر اپنے اندر جذب کیا''(۷۷)۔

عباس تابش نے جب غزل گوئی شروع کی تو اُس وقت شکیب جلالی، مجید امجد، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، شہزاد احمد، منیر نیازی، احمد فراز، خورشید رضوی، عطاالحق قاسمی، پروین شاکر اور محسن نقوی جیسے اہم شاعر اپنی پہچان رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان شعرا نے جدید اُردو غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، خصوصاً ساٹھ کی دہائی کے بعد غزل میں انقلابی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی وجہ سے عباس تابش نے شروع میں مجید امجد کے اثرات قبول کیے۔ اُس دور میں غزل کی فضا میں جدّت کا رنگ و آہنگ عام تھا جس کے عباس تابش پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس لیے اُنھوں نے آغازِ شاعری میں ہی جدید لب و لہجہ اختیار کر لیا۔ ڈاکٹر رشید امجد اپنی کتاب ''پاکستانی اُردو ادب (رویے اور رجحانات) میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''غزل کا نیا دور ظفر اقبال، شکیب جلالی اور شہزاد احمد سے شروع ہوتا ہے۔ ان تینوں شاعروں نے (ظفر اقبال کا ابتدائی دور...... آبِ رواں کی اشاعت تک) غزل کو نئے مزاج اور ذائقوں سے آشنا کیا۔ یہ مزاج اور ذائقہ موضوع و اسلوب دونوں سطحوں پر محسوس ہوتا ہے۔ موضوعاتی طور پر ظفر اقبال کے یہاں لاشعور کے تجسیمی اظہار سرمئی دھند میں لپٹے پیکروں، شکیب جلالی کے یہاں لہو رنگ تصویروں اور دیہاتی فضا کے استعاروں اور شہزاد احمد کے یہاں رومانی ضمیر میں نفسیاتی گرہ کشائی اور شہری زندگی کے اظہار کے طور پر ظاہر ہوئے''(۷۸)۔
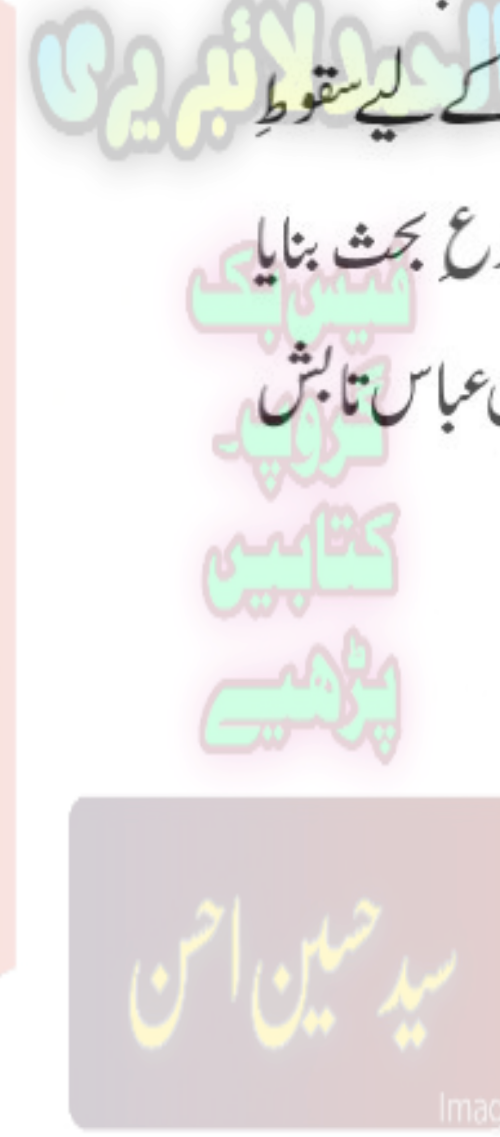
جدید اُردو غزل کی اس روایت نے نئی غزل میں نئی لفظیات کو روشناس کرایا۔ شعرانے معاشی اور سیاسی ابتری کی شاعری کے ذریعے مذمت کی۔ ستر کی دہائی میں مارشل لا اور بھٹو کی پھانسی سے مزاحمتی رویّے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دہائی میں غزل کی ایک توانا روایت ابھر کر سامنے آئی۔ گزشتہ چند برسوں میں کچھ غزل گوؤں نے بعض مخصوص لفظوں، علامتوں اور تلازموں کے استعمال سے عربی عجمی روایت کو نئے سرے سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ غزل میں اس مخصوص الفاظ سازی اور اس مخصوص فضا نے ایک نئی دلکشی پیدا کر دی ہے۔

شعرانے غزلوں میں شہری و دیہی مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اُنھوں نے درخت، ہوا، پتے، دھوپ، پر، جگنو، مچان، بام، مکان، در اور دیواروں جیسے استعارے اور تلازمے غزل میں پیش کیے ہیں۔ غزل کی یہی وسعت، ایمائیت، اشاریت اور رمزیت ہی ہر دور میں اس کی مقبولیت اور پسندیدگی کا سبب بنی رہی ہے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائی میں تخلیق ہونے والی غزل کا تسلسل ہی عباس تابش کی غزل ہے۔ اسی لیے اُن کی غزل معاصر سیاسی منظر نامے کی عکاس اور جذباتی سطح پر ذات کی وجدانی کیفیات کی ترجمان ہے۔ غزل نے اچھی بری تنقید کے باوجود بھی اپنا معیار گرنے نہیں دیا اور آج بھی مقبول ترین صنفِ سخن کی حیثیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ عباس تابش عہدِ موجود میں اپنی تخلیقی توانائیوں اور نئی صلاحیتوں کے جوہر دکھا رہے ہیں۔

عصرِ حاضر میں شعرا کی آوازیں ایک ہجوم کی شکل اختیار کر گئی ہیں، آوازوں کے اس جھمگٹھے میں عمومی طرز کا لہجہ تو گم ہو کر رہ گیا ہے۔ شاعر کے لیے اپنی الگ پہچان برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے مگر منفرد طرز اور تتبع سے پاک لہجہ اپنی پہچان بنا لیتا ہے۔ عباس تابش نے اپنے اس منفرد اسلوب کے باعث معاصرین میں اپنی الگ شناخت بنا لی ہے۔

عباس تابشؔ کی غزل کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لیے اُن کی معاصر غزل کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر اُن کی اہمیّت و مقام کا درست تعیّن ممکن نہیں۔

عباس تابشؔ کے معاصرین کا نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

(احمد ندیم قاسمی)

شور تھا جس کا وہ اب تک انقلاب آیا نہیں
پختگی دیکھو، انہیں پھر بھی حجاب آیا نہیں

(ظفر اقبال)

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

(منیر نیازی)

نکل آیا ہے سورج اور مری آنکھیں نہیں کھلتیں
میں ڈرتا ہوں نہ جانے آج کا اخبار کیا ہو گا

(شہزاد احمد)

دھواں اٹھا مگر آنکھوں تلک نہیں پہنچا
ملا نہ شہرِ حزیں تجھ کو نوحہ گر کوئی

(ادا جعفری)

اقبال و فیض کے بعد جدید اُردو غزل کا ایک نیا دور شروع ہوا اور اس عہد کے ادبی منظر نامے میں احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، منیر نیازی، شہزاد احمد اور ادا جعفری نمایاں شعرا میں
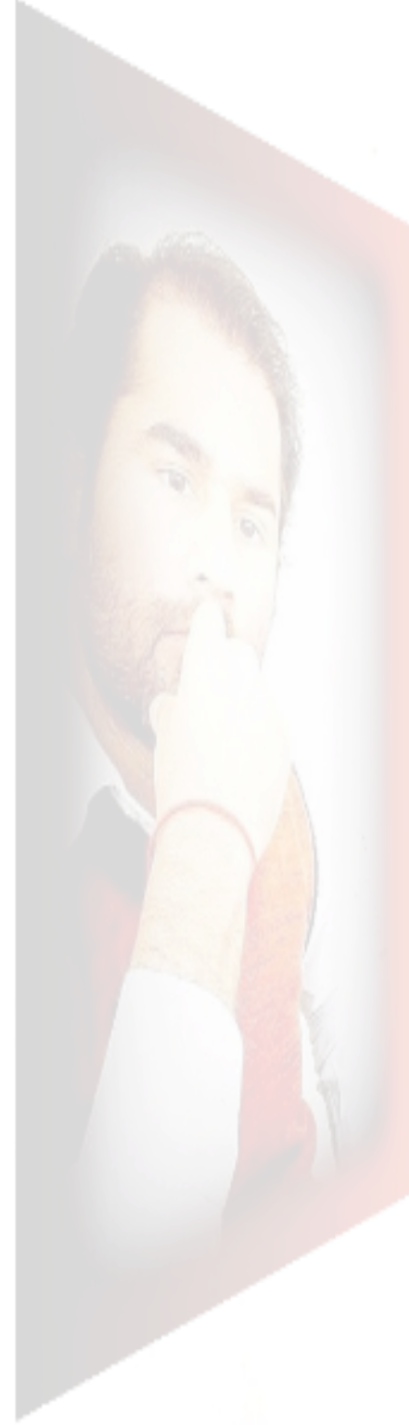
شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے جدید اُردو غزل کی روایت کو فروغ دیا اور ایک عرصہ غزل پر قبضہ جمائے رکھا۔اس دور کی شاعری کا جائزہ لیں تو چند شعرا کے علاوہ غزل یکسانیت کا شکار ہو گئی تھی۔شعرا نے انھی کے رنگ کو اپنا کر مقبولیت حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔ظفر اقبال کے بعد غزل جمود کا شکار ہو گئی تھی اور اس جمود کو توڑنے اور حرکت دینے والے شاعر کا نام عباس تابش ہے۔

عباس تابش نے اپنے سینئرز سے رہنمائی تو حاصل کی لیکن انھوں نے نئے مضامین، نیا رنگ اور نیا اسلوب اختیار کیا۔درج بالا اشعار میں گھر، شہر انقلاب، معاشی اور معاشرتی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔اگر ان اشعار کا تقابلی جائزہ لے کر عباس تابش کی شاعری کا جائزہ لیں تو اُن کی شاعری میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ان اشعار کی زینت بنے ہوئے ہیں۔عباس تابش کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مجھے یہ ڈر ہے کوئی کاٹ کر نہ لے جائے
بہشتِ خواب سے باہر ہیں ٹہنیاں میری

اور اب تو ڈور بنا کر لہو کے مانجھے سے
بسنت رُت نے اُڑا دی ہیں دھجیاں میری
(تمہید)

ثبت کر اور کوئی مہر مرے ہونٹوں پر
قفلِ ابجد سے نہیں بند ہوا باب مرا
(تمہید)

اس شہر کو معلوم ہے پرچم کی روایت
اس شہر میں نیزوں پہ گریبان بندھے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کی غزلوں سے منتخب کیے گئے درج بالا اشعار کا تجزیہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عباس تابش کا اسلوب منفرد ہے۔انھیں معاصرین میں ممتاز مقام حاصل ہے کیوں کہ اُن کی فکر اور خیالات معاصرین سے قدرے بہتر ہیں۔وہ بھی معاشرتی ناہمواریوں کی بات کرتے ہیں لیکن اُن کا اپنا انداز ہے۔اُنھوں نے اپنے اشعار میں ملکی حالات کا تذکرہ کیا ہے کہ میں جب صبح کام کے سلسلے میں گھر سے نکلتا ہوں تو میرے گھر والے میرے واپس آنے تک فکر مند رہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ میں صحیح سلامت گھر لوٹ آؤں۔عباس تابش کے کئی اشعار بڑے شعرا کو بھی حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔
عباس تابش کی معاصر اُردو غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جائیں گے ہم بھی خواب کے اس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مسافر اتار کر
(وزیر آغا)

دل کے معاملوں میں زباں معتبر نہیں
ہے معتبر نظر سے نظر کا کہا ہوا
(خورشید رضوی)

کون سا فخر ہے جس پر کریں گردن اونچی
ہم کو اس دورِ خرابی نے دیا ہی کیا ہے
(ریاض مجید)

میں چپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف
(احمد فراز)

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا براسلوک مری سادگی کے ساتھ
(محسن نقوی)

سمٹ رہے ہیں ستاروں کے فاصلے انوؔر
پڑوسیوں کو مگر کوئی جانتا بھی نہیں
(انور مسعود)

ہم ہی آغازِ محبت میں تھے انجان بہت
ورنہ نکلے تھے ترے وصل کے عنوان بہت
(امجد اسلام امجد)

عباس تابش کے معاصرین کی فہرست بہت طویل ہے ۔ اُن میں وزیر آغا، خورشید رضوی، ریاض مجید، احمد فراز، محسن نقوی، انور مسعود اور امجد اسلام امجد کے اشعار میں نے نمونے کے طور پر درج کیے ہیں تا کہ ان کے تقابلی جائزے سے عباس تابش کا معاصر اُردو غزل میں مقام ومرتبہ متعین کیا جا سکے۔ ان اشعار کا اگر فکری وفنی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو عباس تابش کے کلام سے زیادہ اہمیّت نہیں رکھتے ۔ ان اشعار کو ملاحظہ کر کے اردو اُدب کے قاری کو خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ عباس تابش اپنے معاصرین کی صف میں کہاں کھڑے ہیں۔ احمد فراز نے کہا ہے میں نے حق بات کی تو زمانے والے میرے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح عباس تابش ایک عرصہ متنازع ادبی شخصیت بنے رہے، اُن

کی بھی مخالفت کی گئی۔ محسن نقوی کہتے ہیں کہ سادہ لوح لوگوں کو بھی معاشرے کے دوسرے لوگ جینے نہیں دیتے اور انھیں اُن کے سادہ ہونے کی سزا دیتے ہیں۔ عباس تابش کے اس طرح کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تم بھی موسیٰ کے تعاقب میں چلے تو آئے ہو
دیکھنا تم کو نہ یہ نیلا سمندر مار دے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اہلِ منصب ہیں نہ ہم لوگ ہنر والے ہیں
ہم پہ دستار کی تہمت ہے کہ سر والے ہیں
(رقصِ درویش)

اب وہ صورت ہے نہ وہ عکس گری ہے مجھ میں
خشک دریا کی طرح ریت بھری ہے مجھ میں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

شام کے بعد اندھیرا نہیں رہتا گھر میں
ایک سورج نکل آتا ہے سحر سے پہلے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش اُردو غزل کی توانا روایت کا نام ہے۔ اُنھوں نے معاصر اُردو غزل میں اپنی الگ شناخت بنالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ کوئی منصب و ہنر نہیں رکھتے، صرف ایک عزت دار آدمی ہیں۔ اس لیے ہم پہ تہمت لگ رہی ہے کہ ہم ایک قد آور شخص ہیں۔ اسی طرح عباس تابش اپنے معاصرین میں قد آور ہیں۔ عباس تابش کے معاصرین کا درج ذیل نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
(پروین شاکر)

در و دیوار اتنے اجنبی کیوں لگ رہے ہیں
خود اپنے گھر میں آخر اتنا ڈر کیوں لگ رہا ہے
(افتخار عارف)

اس دھوپ میں سائے کی طلب کس کو نہیں ہے
اے کاش کہ تم ریت کی دیوار نہ ہوتے
(مرتضیٰ برلاس)

بیٹوں نے مل کے صحن بھی تقسیم کر لیا
والد کے ساتھ نکلا جنازہ مکان کا
(جان کاشمیری)

وہ جانتا نہیں تو بتانا فضول ہے
اس کو مرے غموں کی خبر ہونی چاہیے
(عطاالحق قاسمی)

سوچتا ہوں تو ہر انسان پرانی صورت
دیکھتا ہوں تو ہر ایک شخص نیا لگتا ہے
(عدیم ہاشمی)

رچ بس چکا ہوں صورتِ خوشبو فضاؤں میں
کوئی جُدا کرے گل منظر سے کیوں مجھے
(خالد احمد)

اپنی مرضی سے کون قتل ہوا
اپنی مرضی سے کب جیا ہے کوئی
(نجیب احمد)

عباس تابش کے معاصرین میں پروین شاکر، افتخار عارف، مرتضیٰ برلاس، جان کاشمیری، عطاالحق قاسمی، عدیم ہاشمی، خالد احمد اور نجیب احمد ممتاز شعرا ہیں۔ ان کی غزلوں میں معاشی، معاشرتی اور دیگر پہلوؤں کو شاعری کا حصّہ بنایا گیا ہے۔ نجیب احمد کہتے ہیں کہ نہ کوئی اپنی مرضی سے قتل ہوتا ہے اور نہ کوئی اپنی مرضی سے مرتا ہے۔ وہ ملکی حالات کی بات کرتے ہیں۔ جان کاشمیری کہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی یہ روایت ہے کہ والد کی وفات کے بعد بیٹے پرانا گھر بھی تقسیم کر لیتے ہیں۔ ان تمام شعرا کے ہاں دلچسپ مضامین ہیں۔ اسی طرح عباس تابش کی غزلوں میں ہے کہ وہ تمام لوگوں کے احساسات و جذبات کے عکاس ہیں۔ اُنھوں نے منفرد لب ولہجہ اپنایا ہے۔ تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں نے تو جسم کی دیوار ہی ڈھائی ہے فقط
قبر تک کھودتے ہیں لوگ خزانے کے لیے
(رقصِ درویش)

کسی سے کہہ نہیں دینا کہ عشق ہو گیا ہے
کہ لفظ معنی نہیں اعتبار مانگتے ہیں
(رقصِ درویش)

تو اپنے گھر سے نکلی ہوئی شاخ کو نہ دیکھ
مجھ پر یہ پھول بازوئے قاتل سے آئے ہیں

(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش نے ان اشعار میں کمال ہنرمندی سے مضامین بھر دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زبانی دعوے کوئی معنی نہیں رکھتے ہر کام کے لیے اپنا اعتبار دلانا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو صرف خود کو تباہ کیا ہے لوگ تو خزانے حاصل کرنے کے لیے قبروں کو بھی کھود لیتے ہیں۔ مذکور بالا اشعار میں زبردست شعریت پائی جاتی ہے۔ عباس تابش کے معاصر شعرا کے کچھ اور نمونے ملاحظہ کیجیے:

مجھ سے مری وفا کا سبب اس طرح نہ پوچھ
فرصت اگر ملے تو کبھی آئینہ بھی دیکھ

(خالد شریف)

جسے رسوائیوں کے خوف سے لکھا نہیں تھا
وہی کاغذ فصیلِ شہر پر چسپاں ہوا ہے

(سلیم کوثر)

نہ سنگِ میل تھا کوئی ، نہ کوئی نقشِ قدم
تمام عمر ہَوا کی طرح سفر میں رہے

(سحر انصاری)

سکوتِ شام ہے اور میں ہوں گوش بر آواز
کہ ایک وعدے کا افسوس ہے فضاؤں میں

(فہمیدہ ریاض)

یوں تو ہر شخص کو مخلص پایا
ویسے ہر ہاتھ میں پتھر دیکھا

(ثروت حسین)

اب سرِ قریہ بے دست پڑا ہے کشکول
روز کٹ جاتے ہیں اس شہر میں دو چار کے ہاتھ

(ڈاکٹر جواز جعفری)

عباس تابش کے معاصرین کے کلام کا تقابلی جائزہ لیں تو ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ معاصرین میں عباس تابش اہمیّت کے حامل ہیں۔ یہ سب اُن کے اچھے کلام کی بدولت ہے۔ درج بالا اشعار میں ثروت حسین کہتے ہیں کہ زمانے نے ایک چہرے کے پیچھے کئی چہرے چھپا رکھے ہیں۔ بظاہر لوگ مخلص نظر آتے ہیں لیکن ہاتھ میں پتھر بھی اُٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کہتے ہیں کہ روز دو چار لوگوں کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں اور اب یہ کشکول بے دست پڑا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے اس شعر میں ملکی حالات اور معاشرتی ناہمواریوں کا خوب صورت انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

مسائل کو گرہ دیں تو لہو رستا ہے پوروں سے
ہمارے چاک دامن سے یہ کیا دھاگے نکل آئے

(آسمان)

کوئی افواہ بھی آنگن میں اُتر سکتی ہے
یہ ضروری نہیں کھڑکی سے ہوا ہی آئے

(آسمان)

عباس تابش کہتے ہیں کہ ہمیں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اگر ان کو گرہ دیں تو ہماری پوروں سے لہو رسنے لگ پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہنر ہمارے ہاتھ یونہی نہیں آیا اس کام کے لیے ہم نے اپنا خون پسینہ صرف کیا ہے۔ عباس تابش کے معاصرین بھی اُن کی شاعرانہ حیثیت کے مداح ہیں۔ ان کے مزید معاصرین کا کلام ملاحظہ کیجیے:

ہم اپنی صداقت کی سند مانگ رہے تھے
احباب اُٹھائے ہوئے پتھر نکل آئے
(اعتبار ساجد)

کئی آتش فشاں حائل ہیں جس کے راستے میں
ہمارا رزق اس چٹان پر رکھا ہوا ہے
(سرور ارمان)

گل ہائے فصل خواب بھی جب بے ثمر رہے
کشتِ خیالِ یار میں اب کیا اُگائیں ہم
(سعداللہ شاہ)

چند گلے بھلا دیئے چند سے درگزر کیا
قصّۂ غم طویل تھا جان کے مختصر کیا
(ثمینہ راجہ)

عمر کی ساری تھکن لاد کے گھر جاتا ہوں
رات بستر پہ میں سوتا نہیں مر جاتا ہوں
(انجم سلیمی)

اوس کو آب تو پتوں کو نوالہ کیا ہے
پیڑ نے یوں مرے فاقوں کا ازالہ کیا ہے
(شاہد ذکی)

عباس تابش کے معاصرین میں انجم سلیمی اور شاہد ذکی ایسے شاعر ہیں جو وسیع حلقۂ قارئین رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ دوسروں نے بھی غزل میں اپنا کمال دکھایا ہے لیکن ان سب میں عباس تابش کا کلام منفرد دکھائی دیتا ہے۔ عباس تابش بھی درختوں، پرندوں اور چاند کا ذکر بکثرت کرتے ہیں اسی طرح شاہد ذکی بھی اوس، درختوں، پرندوں، گھونسلوں اور فطرت کے مناظر کا تذکرہ کرتے ہیں۔ عباس تابش کے ہم عصر شعرا کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے گھر کی سجاوٹ کے واسطے یارو
اتار لایا ہوں اک گھونسلہ پرندے کا
(فخر زمان)

ہمارا گھر تو پہلے ہی وہاں گروی پڑا تھا
ہمارے ذہن بھی اس کے حوالے ہو گئے ہیں
(اختر عثمان)

حیران ہو رہا ہوں کہ منظر کی بات کی
دیوار و در نے مجھ سے نئے گھر کی بات کی
(فیصل عجمی)

جب بھی چپکے سے نکلنے کا ارادہ باندھا
مجھ کو حالات نے پہلے سے زیادہ باندھا

چلتے پھرتے اسے بندش کا گماں تک نہ رہے
اُس نے انسان کو اس درجہ کشادہ باندھا
(شہزاد نیّرؔ)

اس جزیرے میں زیادہ نہیں رہنا اب تو
آج کل ناؤ بناؤں گا چلا جاؤں گا
(حسن عباسی)

عباس تابش کے معاصرین میں فخر زمان، شہزاد نیّرؔ اور حسن عباسی ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں عباس تابش کی طرح جدید رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ شہزاد نیّرؔ کہتے ہیں کہ انسان کو رسم و رواج اور حالات نے باندھ رکھا ہے اس لیے وہ کوئی کام اپنی خواہش کے مطابق نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر آزاد کر دیا ہے تا کہ اُس کو خدا کی پکڑ کا احساس نہ ہو۔ عباس تابش کے معاصرین کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

بن گئے ہیں اجرتی قاتل کئی افراد اب
کچھ گزارہ کر رہے ہیں ان دنوں تاوان پر
(اعجاز عزائی)

عشق میں بات کہاں بے سرو سامانی کی
قیس نے دشت میں رہتے ہوئے سلطانی کی
(شاہد زمان)

یہ تلخیاں مرے لفظوں میں میری اپنی نہیں
میں دے رہا ہوں زمانے نے جو دیا ہے مجھے

میں جڑ پکڑنے کی کوشش میں سوکھ جاؤں گا
یہ کیسی ریت میں یاروں نے بو دیا ہے مجھے
(ساحل سلہری)

میں نے عصرِ حاضر اور عباس تابش کے معاصر شعرا میں سے اہم شعرا کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں تا کہ اس معاصر شاعری میں عباس تابش کا شعری مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے کہ عباس تابش ان شعرا کی فہرست میں کس جگہ پر فائز ہیں، اُن کا معاصر اُردو غزل میں مقام و مرتبہ کیا ہے۔ معاصرین کے کلام کا مطالعہ، مشاہدہ و تجزیہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ عباس تابش اپنے معاصرین میں کسی طور بھی کم غزل گو شاعر نہیں ہیں۔ ہم بلا شبہ و بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ عباس تابش ۸۰ء کی دہائی سے لے کر اب تک کے بڑے شاعر ہیں۔ ظفر اقبال، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی اور شہزاد احمد کے بعد عباس تابش جدید اُردو غزل کے ایک اہم اور معتبر شاعر ہیں۔

عباس تابش کے معاصرین اچھی خاصی تعداد میں ہیں، ہر کسی نے غزل میں نت نئے تجربات کیے ہیں اور ہر کسی کا اپنا اپنا اندازِ سخن ہے۔ خالد احمد اور مرتضیٰ برلاس نے بھی نئی غزل میں اچھا اضافہ کیا ہے، شاہد ذکی کا اپنا لہجہ ہے جب کہ شہزاد نیّرؔ کا اپنا اُسلوب ہے۔ علاوہ ازیں انجم سلیمی، جواز جعفری، سرور ارمان اور سعد اللہ شاہ معاصر اُردو غزل کے اچھے شاعر ثابت ہوئے ہیں۔

شاعری قدرت کا ودیعت کردہ ایک ایسا تحفہ ہے جو خاص خاص لوگوں کو اس سطح پر عطا ہوتا ہے جہاں عام لوگوں کی رسائی نہیں۔ عباس تابش فطری ظہور کے شاعر ہیں، ان کے کلام کی مرصع کاری نے اُن کو عمومی لہجے کی صف سے دور رکھا ہوا ہے۔ اُن کا خاص وصف یہ ہے اُنھوں نے گھسے پٹے مضامین استعمال نہیں کیے۔ ان کی غزل کا جوہر منفرد اسلوب اور
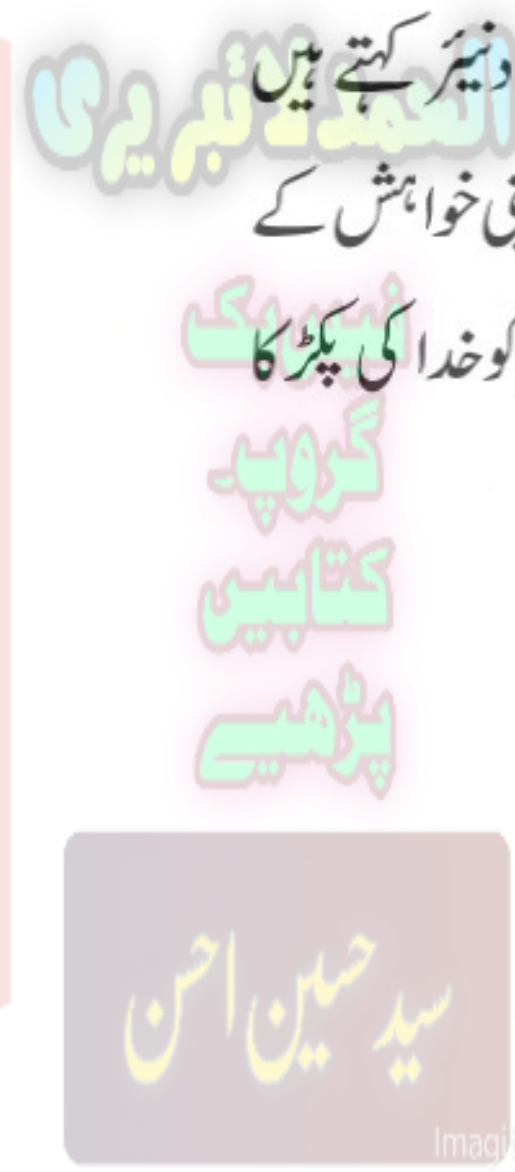
انفرادی فکر کا حامل ہے۔ ظفر اقبال، خالد احمد اور خورشید رضوی جیسے شاعر عباس تابش کی حیثیت و اہمیّت تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے پیش روؤں اور معاصرین سے کسی طور کم شاعر نہیں ہیں۔ عباس تابش ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں، اُن کے کلام میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو یہ ظاہر کرے کہ اُنھوں نے اپنے پیش رو شعرا یا معاصر شعرا کا تتبع کیا ہے۔ اُن کا منفرد رنگ و آہنگ آج کی معاصر غزل پر غالب ہے۔ اُن کے اسلوب پر کسی کی چھاپ دکھائی نہیں دیتی، وہ اپنی فطرت کے شاعر ہیں۔

عباس تابش نے ظفر اقبال کے بعد غزل میں ایک انوکھی جدّت پیدا کر کے اسے نئی ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے شعری مجموعے ''رقصِ درویش'' میں ایسی غزلیں تخلیق کی ہیں جو تاریخی اعتبار سے معیاری ہیں۔ اُنھوں نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں کمال ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ عباس تابش نے اشعار میں اپنے موضوعات و مضامین کو خوب نبھایا ہے اور پیرائے بیان میں انفرادیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ اُنھوں نے عربی و فارسی کے مختلف الفاظ استعمال کر کے زبان و ادب اُردو کو وسعت عطا کی ہے۔ ظفر اقبال، عباس تابش کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش کو اپنی تصدیق کے لیے آپ کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں بلکہ اب تو وہ خود ایسے سرٹیفکیٹ جاری کر سکتا ہے، بلکہ کرتا بھی ہے۔ شاعری تو اپنی تصدیق خود ہوتی ہے اور اگر وہ خود اپنی تصدیق نہیں کرتی تو کوئی بڑے سے بڑا تصدیق کنندہ بھی اسے مطلوبہ اعتبار نہیں دلا سکتا۔ وہ ایک ٹھوس شاعر اس لیے بھی ہے کہ اُس نے اپنی بنیادیں بہت گہری کھودنے کا کام پوری سنجیدگی کے

> ساتھ کیا ہے......عباس تابش کا کمال یہ ہے کہ اس تقاضے سے عہدہ برآ ہوتے وقت مسلسل پیچھے مڑ کر بھی دیکھتا رہتا ہے کیوں کہ روایت وہی نہیں جو اسے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ بھی ہے جو خود تشکیل دیتا چلا آ رہا ہے، چنانچہ صحت مند اور روایت قابلِ فخر کے ہمراہ جدیدیت کا سنگھم اس خوش ادائی کے ساتھ اس کے ہم عصروں میں اور کسی کے ہاں دستیاب نہیں ہے جو اس صبر آزمائی کا جواز خود ہے''(۷۹)۔

عباس تابش کے لفظ لفظ سے جدت کی خوشبو پھوٹتی ہے، ان کی غزلوں کا ایک ایک لفظ ایک ایک ترکیب ان کے اندازِ بیان کی جمالیاتی تفسیر ہے۔ اُن کے خیالات آپس میں گڈمڈ نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک خاص طرز کا ربط اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ اُن کی غزلوں کے اشعار الگ الگ اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں جذبۂ احساس کی شدت بھی ہے اور بھرپور شعریت بھی ہے۔ ان کی غزل مقصدیت اور شعریت سے ہم آہنگ ہو کر ایک منفرد جہان آباد کر دیتی ہے۔ عباس تابش شاعری میں ملمع کاری نہیں کرتے بلکہ اُن کے ہاں روایت کا احترام اور جدت کا احساس پایا جاتا ہے۔ اُن کی شاعری میں ابلاغ کی صفت پائی جاتی ہے، جو ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ کرتی ہے۔ عباس تابش کے کلام کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

میں دم بخود گل نغمہ ہوں شاخِ ہستی کا
ہوا چلے تو بکھرتی ہیں پتیاں میری
(تمہید)
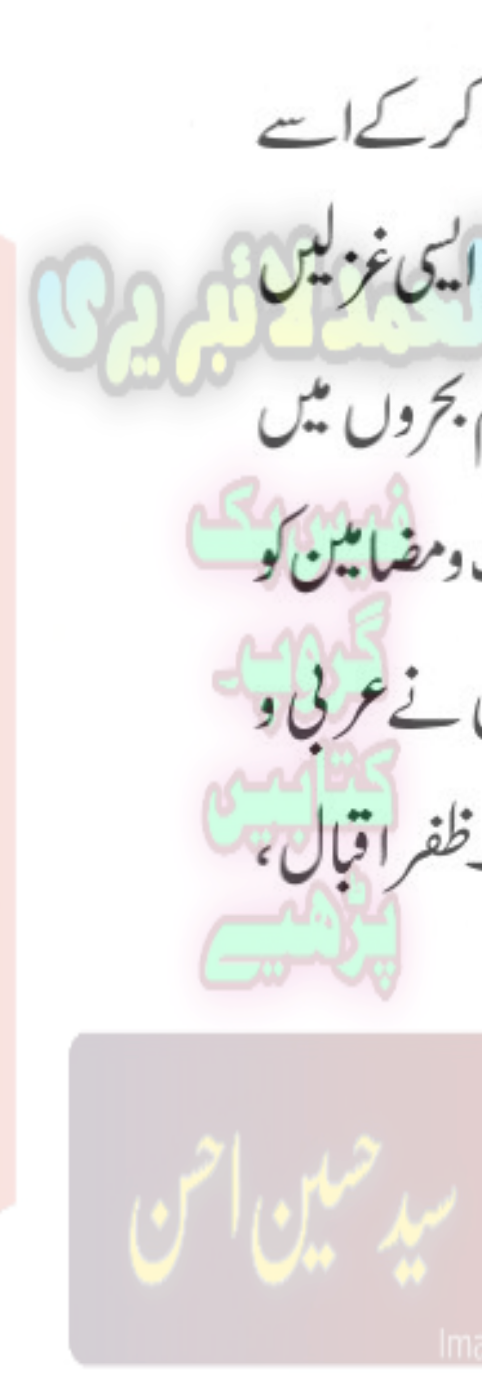
گلِ نشاط کی خوشبو بھی بار تھی مجھ کو
مرے مزاج میں غم کا رچاؤ ایسا تھا
(تمہید)

میں کیسے مان لوں تیری کہ اس دفعہ بھی مجھے
مفاہمت نظر آتی ہے انتباہ کے بیچ
(تمہید)

ممکن نہیں کہ بھیک بھی گھر لے کے جائیں ہم
تابشؔ ہمارے ہاتھ میں کاسہ کسی کا ہے
(آسمان)

عباس تابش کہتے ہیں کہ میں دم بخود ہو گیا ہوں، میں شدتِ غم سے نڈھال ہو گیا ہوں۔ شاعر کہتا ہے کہ ہوا چلی تو میں پتیوں کی صورت بکھر جاؤں گا۔ شاعر غمِ جدائی سے اس قدر حساس ہو چکا ہے کہ اب خوشی بھی اُسے اچھی نہیں لگتی۔ اُس کا مزاج غم کا عادی ہو چکا ہے۔ اب گلِ نشاط کی خوشبو بھی اُسے ایک بار کی طرح لگتی ہے۔ تابشؔ کہتے ہیں کہ ہم بھیک بھی کسی کی خاطر ہی مانگتے ہیں کیوں کہ ہمارے ہاتھ میں جو کشکول ہے وہ بھی کسی کا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے ملکی حالات کا تذکرہ کیا ہے کہ ہمارا ملک قرضوں کی دلدل میں پھنس چکا ہے اور ہم قرضوں کے لیے دوسروں کے سامنے کشکول لیے پھرتے ہیں۔ عباس تابش ایک منفرد لہجے کے معتبر شاعر ہیں، ان کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایک ممنوعہ شجر کے ساتھ کاٹے زندگی
جرم جیسی یہ سزا ہے آلِ آدم کے لیے
(آسمان)

ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں مقیم ہیں
پڑتا نہیں درخت کا سایہ درخت پر
(آسمان)

صبح کے ساتھ میں کھو جاتا ہوں بچے کی طرح
شام ہوتے ہی کوئی ڈھونڈ کے لاتا ہے مجھے
(آسمان)

پا شکستوں کا بھرم رکھیں گی کب تک کشتیاں
پانیوں کے بعد خشکی کا سفر آ جائے گا
(آسمان)

سسک رہی ہے اگر بات لفظ کے نیچے
تو ایسا کرتے ہیں پتھر ہٹا کے دیکھتے ہیں
(آسمان)

عباس تابش نے اشعار میں شاعری کی تمام صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے تلمیحات اور تراکیب کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔ اس شعر میں اُنھوں نے تلمیح کا استعمال کیا ہے۔ حضرت آدمؑ کو ممنوعہ شجر کے پاس جانے کی وجہ سے خلد سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا تھا۔ اس لیے شاعر کہتا ہے ممنوعہ شجر کے ساتھ رہنا آلِ آدم کے لیے ایک سزا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہم اپنے اپنے گھر میں رہتے ہیں کبھی وصال کی صورت نہیں نکلتی۔ عباس تابش کی غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

شہروں سے تنگ اور ہم آہنگ بھی بہت
بالکل یہ کنجِ دل ہے مضافات کی طرح

پھر اُس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

چاند کو تالاب مجھ کو خواب واپس کر دیا
دن ڈھلے سورج نے سب اسباب واپس کر دیا

اس طرح بچھڑا کہ اگلی رونقیں پھر آ گئیں
اس نے میرا حلقۂ احباب واپس کر دیا
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

غزل ایک روایتی صنفِ سخن ہے، اس میں کچھ مخصوص علامتیں اور داخلی کیفیات ہوتی ہیں مگر عباس تابش کی غزل روایت سے جڑی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید رنگ و آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اُنھوں نے جدّت اور ندرت ادا کو اپنے فن میں جگہ دی ہے وہ خود کہتے ہیں کہ ابتدا میں اُن کی شاعری پر مجید امجد کے اثرات ملتے تھے، اس لیے عباس تابشؔ روایت سے جڑے ہونے کے ساتھ ساتھ جدید لہجے کے شاعر ہیں۔ اُن کا فنِ غزل گوئی کلاسیکی اور جدّت کا حسین امتزاج ہے۔ تابشؔ نے غزل میں تجربے، اجتہاد اور جدید فکر و فن کی شمع روشن کی ہے۔ تابشؔ کے رنگِ تغزل میں وہ خصوصیات ہیں جو انھیں چوٹی کے متغزلین میں جگہ دیتی ہیں۔ تابشؔ نے غزل میں نئے رنگ و اسلوب کو روشناس کرایا ہے۔ اُن کی غزلوں میں مضامین کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے، اُنھوں نے روایتی اندازِ سخن میں کئی پہلو استعمال کیے ہیں۔

تابشؔ نے غزل کو ایسا منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا ہے جو اُن کے ساتھ منسوب ہو

کر رہ گیا ہے۔ بلاشبہ عباس تابش جدید اُردو غزل کے ایک صاحبِ اسلوب شاعر ہیں۔ عہدِ حاضر میں معاصر شعرا میں عباس تابش کا نام بڑا نمایاں ہے، اس بات کی وضاحت عطاالحق قاسمی اس طرح کرتے ہیں:

> ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی اکثر شعرا کا قافیہ تنگ کر دیتی ہے اور وہ لگے بندھے دائرے سے باہر نہیں نکل پاتے لیکن جب کسی بڑے شاعر کا ظہور ہوتا ہے تو یہی قافیہ ردیف اُس کے آگے چلنے کے بجائے اُس کے پیچھے چلنا شروع کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے اس کی بہترین مثال اقبالؒ کی ''بالِ جبریل'' کی وہ غزلیں ہیں جن میں ایک جہانِ معنی آباد ہے، اقبال کی یہ روایت فیضؔ اور ندیمؔ سے ہوتی ہوئی آج نوجوان شعرا تک پہنچی ہے جن میں سرِ فہرست عباس تابش کا نام ہے۔ عباس تابش نے غزل کی لفظیات اور مضامین میں ''میرے دل تک سجنا'' قسم کا کوئی ڈرامہ تو نہیں کیا لیکن گزشتہ ایک دہائی کے شعری سفر کے دوران اس نے اپنی غزل کو اس صف میں لا کھڑا کیا ہے جس سے اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے کھڑا نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے بعد میں آنے والے نوجوان شعرا کی قطاریں ہیں''(۸۰)۔
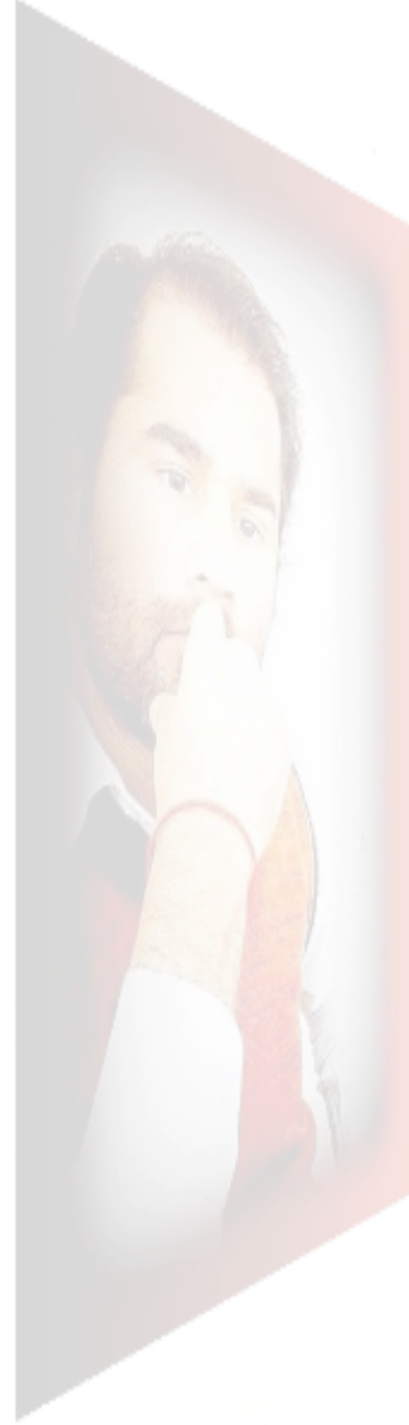
ظفر اقبال کے بعد عباس تابش کو ایک عرصے سے اُردو غزل کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ ان کی غزل کی تروتازگی اور انوکھا پن انھیں معاصرین میں ممتاز و ممیّز کرتا ہے۔ عباس تابش ایک خوبصورت شاعر ہیں اُن کے کلام میں داخلیت اور خارجیت کے دونوں پہلوں نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے غزل میں موضوع اور اسلوب کے حوالے سے روشن امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ اُن کا جذبہ غزل رتوں میں نئے موسموں کی بشارتیں دے رہا ہے۔ اُن کی غزلیں کہیں دھیمے لہجے میں ہیں اور کہیں شوخ اور گہرے رنگوں میں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"عباس تابش کی غزل جواب غزل سے نہ نکلنے کے باوجود افلاک غزل سے نکلنے والا وہ سورج ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے اُس کے ہم عصروں کو خیرہ کر رہا ہے...... میں اسے اُردو غزل کے روشن امکانات کا شاعر قرار دیتے ہوئے کھلی بانہوں سے اس کا خیر مقدم کرتا ہوں" (۸۱)۔

عباس تابش کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

یوں تو ہر شخص عبادت کے عمل سے نکلا
ایک میں تھا کہ نہ محراب غزل سے نکلا

جب بھی وہ چاند مرے ذہن میں ڈوبا تابش
ایک سورج مرے افلاک غزل سے نکلا
(تمہید)

لہو لہو ہیں مگر آخری بیان اپنا
ہم اپنے ہاتھ سے تحریر کرنا چاہتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

یہ میاں اہلِ محبت ہیں انہیں کچھ نہ کہو
یہ بڑے لوگ ہیں بچوں کی طرح سوچتے ہیں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش اس شعر میں کہتے ہیں کہ آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہو جاتا ہے۔ جس طرح بچہ کوئی شے دیکھے تو اسے مانگتا ہے۔ بچہ اپنی پسند کی شے نہ ملنے پر ضد کرتا ہے۔ اسی طرح آدمی عشق میں بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے۔ تابش دشمنی بھی بڑے طریقے سلیقے سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے دشمن سے بھی پیار کرتے ہیں۔ اس لیے سب اُن کے اخلاق سے متاثر ہیں۔ اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تجھے پسند بہت ہے گلاب کا کھلنا
اور اتفاق سے تو آئینے کے پاس بھی ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اس لیے جل کے کبھی راکھ نہیں ہوتا دل
یہ کبھی آگ میں ہوتا ہے کبھی پانی میں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش کی شاعری کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مخصوص طرزِ ادا قائم رکھنے میں بڑے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اُن کا فکر و فن ایک فنی ستون پر قائم ہے۔ وہ فکری سفر میں مسلسل ارتقا کی شمع روشن کرتے دکھائی دیے ہیں "تمہید" سے لے کر

''رقصِ درویش'' تک اُن کی شاعری فکروفن کی آمیزش کا خوبصورت مرقع ہے۔

عباس تابش نے فنِ غزل گوئی میں ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ان کی فنی خصوصیات کو ایک طرف رکھ کر ان کے موضوعات کی طرف آئیں تو اُن کی غزل میں متعدد موضوعات ملتے ہیں۔انھوں نے ان موضوعات کو بڑی فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔عباس تابش نے چھوٹی بڑی تمام بحروں میں اچھی غزلیں تخلیق کر کے اپنی فنی پختگی کا احساس دلایا ہے۔انھوں نے زبان و بیان کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔عباس تابش کے کلام میں مشکل پسندی بھی ہے اور سہلِ ممتنع کے نمونے بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔اُن کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو انھیں معاصر شعرا میں ممتاز کرتی ہیں۔عباس تابش کے آبائی علاقے میلسی کے ایک معروف شاعر و نقاد خورشید بیگ میلسوی، عباس تابش کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش نے اپنے اسلوب اور ندرت کمال سے اپنے فنی اور حسیاتی سفر کو ایک ایسے شاندار مقام پر متعین کیا ہے......جو عصری ادب کی قیام گاہ قرار دی جاسکتی ہے اگر ہم عصر تخلیق کاروں سے تخلیق ہونے والے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو عباس تابش اپنے اندازِ نگارش میں ان کے حسیاتی شعور سے آگہی کے ساتھ ساتھ اپنے مخصوص طرزِ ادا کو قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں''(۸۲)۔

عباس تابش کے یہ خوبصورت اشعار ملاحظہ کریں:

کتنی صدیاں سورج چمکا کتنے دوزخ آگ جلی
مجھے بنانے والے میری مٹی اب تک گیلی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

ہمیں بھی شنوائی کا یقیں ہو چلا ہے تابش
کہ ہم بھی تحریکِ التوا تک پہنچ گئے ہیں
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی ورنہ
ایک مدت تری دہلیز تک آیا گیا میں
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

یہ ترے ساتھ نہ ہونے کی تلافی تو نہیں
بیٹھے بیٹھے یہ مرا آبلہ پا ہو جانا
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

شاعر کہتا ہے کہ مجھ سے اظہار نہیں ہو سکا لیکن میں اپنے محبوب کی چوکھٹ تک کئی بار گیا ہوں۔دل میں کتنی باتیں ہوتی ہیں لیکن میں اُن کے روبرو نہیں کر پاتا۔شاعر کو خدشہ ہے کہ کہیں اُس کا محبوب انکار ہی نہ کر دے۔اس لیے وہ اپنے دل کی تسلی اور خوش فہمی کے لیے اظہار نہیں کر پاتا۔عباس تابش عہدِ حاضر کے ایک اہم شاعر ہیں،اس بات کا اعتراف اُن کے ہم عصر بھی کرتے ہیں۔وحید الرحمٰن خان،عباس تابش کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش، جدید لب و لہجے کے ایک اہم غزل گو ہیں انھوں نے جدید غزل کا فارمولا پا لیا ہے۔ وہ جس فارمولے سے شعر بناتے ہیں اُس کے چار اجزا تو ہمیں

بھی معلوم ہیں اور نوآموز شاعروں کی سہولت کے لیے ہم
انھیں بیان بھی کیے دیتے ہیں یعنی......تازہ لفظیات، نئی
محاکات، جدید احساسات اور کلاسیکی روایت ان عناصر
کے گٹھ جوڑ سے غزل وجود میں آتی ہے'' (۸۳)۔

عباس تابش کے کلام میں ان عناصر کی چند جھلکیاں ذیل میں پیش خدمت ہیں:

کب سے بیٹھا ہے ہمارے صحن کی دیوار پر
یہ پرندہ ہے کہ پتھر بال و پر میں رہ گیا
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

اپنے سوا بھی میں کوئی آواز سن سکوں
وہ برگِ خشک ہو کہ پرندہ کوئی تو ہو
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش کو انسانوں کے بجائے درختوں، پرندوں اور چاند سے ہم کلام ہونا اچھا لگتا ہے، وہ ان تینوں عناصر کو علامتی طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی یہ علامتیں نہایت دلکش، تخلیقی قوت، ہنرمندی اور معنوی حسن لیے ہوئے ہیں۔ سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہوئے ہنس کی وفاداری، دن نکلتے ہی پرندوں کا شور، دھرتی کی محبت، چاند کی تنہائی کا دکھ، سورج کی طرح شام میں ڈھل جانے کی خواہش، چاند کی ہمرہی میں رستہ بھٹک جانا، درختوں کو زخم دکھانا اور کبھی خود کو درخت محسوس کرنا یہ سب معاملات اُنھوں نے اس طرح بیان کیے ہیں جس طرح کوئی آدمی اپنے کسی قریبی دوست سے محوِ گفتگو ہوتا ہے۔ پرندے، درخت اور چاند انسانوں کی طرح دکھ نہیں دیتے اس لیے تابش نے ان سے دوستی کر لی ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

خالی نہیں رہتا دلِ درویش کا ڈیرہ
حجرے میں پڑے رہتے ہیں دو چار پرندے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

ہمارے دکھ نہ کسی طور جب ٹھکانے لگے
ہم اپنے گھر میں پرندوں کے گھر بنانے لگے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش نے دکھوں، غموں، انتظار، کرب، ہجر و وصال، خوابوں، پرندوں اور درختوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور یہ عمل بڑا قابلِ ستائش ہے۔ ہنس تالاب پہ پانی پینے آتے ہیں اور پانی پی کر اپنے وطن کی طرف اُڑ جاتے ہیں۔ سوکھے ہوئے تالاب پہ اگر ہنس بیٹھیں گے تو مر جائیں گے۔ اس لیے شاعر محبت میں سچّے اور وفادار ہیں۔ ایک بار جو تعلّق بن جائے اسے ساری زندگی نبھاتے رہتے ہیں۔ وہ انسانوں سے بڑھ کر پرندوں سے پیار کرتے ہیں، پرندہ اُن کی شاعری کا استعارہ ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، عباس تابش کو آشوبِ خواہش مکان کا شاعر قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عباس تابش کو بات کرنے اور کہنے کا فن، لفظوں کو استعمال کرنے کا گُر اور ترکیب سازی کا ہنر خوب آتا ہے یہ ساری خصوصیات اُس کے پہلے مجموعے ''تمہید'' میں بھی موجود ہیں البتہ وقت، تجربات، مشاہدات اور تخلیقی عمل کے مراحل سے گزرنے کے بعد ان میں وہ نکھار پیدا ہوا ہے، چنانچہ ''آسمان'' میں اس کے شاعرانہ کمالات اور روشن ہوئے ہیں خاص طور پر اُس نے اپنے انفرادی لب

ولہجہ سے سب کو چونکا دیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ظفر
اقبال جیسے کھرے شاعر اور بے باک کالم نگار نے
اپنے انٹرویو میں اپنے پسندیدہ شاعروں کی فہرست میں
عباس تابش کو بھی شامل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نہ
صرف عباس تابش کی شاعری کا اعتراف ہے بلکہ اُس
کے فن کی داد بھی ہے۔ عباس تابش نے جو شاعری کی ہے
اس کے حوالے سے یہ بات سچ ہے اور اس کا برملا
اعتراف بھی ضروری تھا جو ہوا ہے ......عباس تابش کی
تمہید سے آسمان تک کے شعری سفر میں زمین اور آسمان کا
فرق دکھائی دیتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے
اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے میں کافی محنت کی ہے
اور اپنے ہم عمر شعرا میں ایک الگ اور منفرد مقام پایا
ہے''(۸۴)۔

عباس تابش کے نزدیک شاعری انسان کے داخلی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، اُنھوں نے غزل کے روایتی مضامین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور بات و مدعا الگ طرز میں پیش کیا ہے۔ عباس تابش بڑے حساس اور انسان دوست شاعر ہیں، وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور فطرت کے بڑے قریب ہیں اسی لیے ان کی شاعری میں زمانی حالات اور فطرت کی مناظر کشی ملتی ہے۔ جدید اُردو غزل میں ظفر اقبال کے بعد عباس تابش کی شاعری کو اعتبار ملا ہے۔ اُن کے پانچویں شعری مجموعے ''رقصِ درویش'' سے منتخب کیے گئے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جو عباس تابش کے منفرد شعری اسلوب کی پہچان ہیں ۔ اس کتاب پر انھیں

تہذیب فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اس زمانے میں غنیمت ہے غنیمت ہے میاں
کوئی باہر سے بھی درویش اگر لگتا ہے
(رقصِ درویش)

تو جانتا نہیں مرے مالک مکان کو
اے دوست کوئی چیز ادھر کی اُدھر نہ ہو
(رقصِ درویش)

میری تنہائی بڑھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہنس تالاب پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں

میری آنکھوں سے بہا کرتی ہے اُن کی خوشبو
رفتگاں خواب میں آتے ہیں چلے جاتے ہیں
(رقصِ درویش)

عباس تابش نے اپنی زندگی کے سچّے واقعات کو بھی حوالۂ شعر کر دیا ہے۔ عباس تابش شروع میں جب میلسی چھوڑ کر لاہور آئے تو اُنھیں لاہور میں کئی مکان تبدیل کرنا پڑے۔ آج کل کرائے دار کو مالک مکان بہت تنگ کرتے ہیں، وہ دیوار میں ایک کیل تک نہیں ٹھونکنے دیتے۔ اس بات کا ذکر عباس تابش نے اپنے اس شعر میں کر دیا ہے۔ شاعر کو اپنے ماضی کی بہت یاد آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رفتگاں مجھے خواب میں بھی یاد آتے ہیں۔ عباس تابش معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ دور بدل چکا ہے اب اگر کوئی باہر سے بھی درویش لگتا ہے تو غنیمت ہے۔ ان اشعار کے تجزیہ سے یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ عباس تابش معاصر اُردو غزل کے اہم نمائندہ شاعر ہیں۔ تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایک ہو جاتی ہے دنیا مرے اندر باہر
میں سرِ شام اجڑ جاتا ہوں بازار کے ساتھ
(رقصِ درویش)

تجھ کو گنتا ہوں میں اپنے آپ میں اس واسطے
تا کہ دنیا کو بتا پاؤں مکمل شخص ہوں
(رقصِ درویش)

شاعر کو شاید کسی کا انتظار ہے اور جب وہ شام کو نہیں لوٹتا تو شاعر اجڑے ہوئے بازار کی طرح ہوتے ہیں۔ عباس تابش ایک اداس اور دکھے ہوئے دل کے شاعر ہیں۔ وہ خود کو اپنے محبُوب کے بغیر ادھورا سمجھتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ میں تجھ کو اپنے آپ میں اس لیے گنتا ہوں تا کہ دنیا کو بتا سکوں کہ میں مکمل شخص ہوں۔ عباس تابش کے یہ اشعار خوب صورت انداز لیے ہوئے ہیں۔ تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میرے اندر کوئی درویش یہ کرتا ہے سوال
کیا ترا نام فقط قبر کے پتھر تک ہے
(رقصِ درویش)

اس لیے بھی میں محبت پہ اُتر آیا ہوں
میرے کردار سے ہوتے تھے فسانے خالی
(رقصِ درویش)

عباس تابش کا پانچواں شعری مجموعہ ''رقصِ درویش'' جدید اُردو غزل کا ایک معتبر

حوالہ ہے، اس میں شامل تمام غزلیں معاصر غزل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عباس تابش کی شاعری میں موضوعاتی تنوع اور خیال کی رنگا رنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اُن کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ہی خیال کو مختلف انداز میں شعر میں سمونا جانتے ہیں۔ وہ اس طرح سے خیال کو شعر میں سموتے ہیں کہ خیال کے متنوع پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔

عباس تابش عہدِ حاضر کے ان نمائندہ شعرا میں شامل ہیں جو اپنا ایک وسیع حلقۂ احباب اور حلقۂ قارئین رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری پوری دنیا میں مقبول ہے۔ ان کی قوتِ متخیلہ، سوچ کا انداز، کیفیت و اظہار، چبھن، دھوپ اور چھاؤں، گرم و سرد، مٹھاس، ترشی، تلخی، اعتماد، ذوق، استعارے، تشبیہات، تراکیب، مثالیں، بندشیں، مضامین، تجربات و روایات، تمازت، موضوعات، نظریات، وضاحت و بلاغت کی وجہ سے ان کے کلام کو اعلیٰ مقام عطا ہوا ہے۔ عباس تابش ایک ازلی شاعر ہیں ان کا ظہور فطری طور پر ہوا ہے۔

عباس تابش واقع ہی اگر شعر نہ کہتے تو مر چکے ہوتے ان کا نام لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ آج اگر اُن کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے منفرد شعری اسلوب کی وجہ سے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ مجنوں اور فرہاد جو عشاق کے قبیلے کے سردار ہیں مجھ گم نام سے پوچھتے ہیں کہ عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے۔ شاعری کے ساتھ عباس تابش کی وابستگی بڑی دیدنی ہے، اُن کی اس وابستگی اور بلند خیالی کا ایک انداز ملاحظہ کیجیے:

دیکھ اب کتنے خدا میرے مقابل آ گئے
میں نہ کہتا تھا مجھے انکار کی توفیق دے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

جاوید اختر پاشا، عباس تابش کی شاعری پر اپنی رائے دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''پاکستان میں اس وقت مستند نو جوان شعرا میں عباس

تابش کا نام ایک روشن ستارے کی طرح تابندہ ہے،
نت نئے مضامین سے سجیا ورسوچ کی عمیق گہرائیوں سے
اُبھرتی ذہین لہریں عباس تابش کی شاعری کو ہم عصر
شاعروں سے ممتاز بناتی ہے''(۸۵)۔

عباس تابش کی فکری وفنی وسعتوں اور اضافتوں کی بنت کی تمام تر جمالیاتی خصوصیات نے اُنھیں شعرا کی اس فہرست میں شامل کرلیا ہے، جنھیں ہم نامور شمار کرتے ہیں۔ تابشؔ کے اشعار میں ایک خاص غنا کا عنصر ہے، اُن کے اشعار میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے کہ اُنھیں پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور قاری گھنٹوں اس کیفیت کے حصار سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ غزل ایسے تخلیق کرتے ہیں کہ جیسے کوئی اچھوتی اور انوکھی بات کہہ رہے ہیں۔ اُن کے کلام کی زیب وزینت میں ایک بڑا حصّہ تغزل وموسیقیت کا ہے اور اس تغزل نے اُن کی غزل کو مقبول رنگ عطا کیا ہے۔

عباس تابش نے غزل میں سادگی کا خاص خیال رکھا ہے، وہ بے جا لفظی آرائش و زیبائش میں نہیں پڑتے وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے اکثر معنی مفقود ہو جاتے ہیں۔ سادگی کا معیار اُن کے نزدیک یہ ہے کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق کیوں نہ ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہیں ہونا چاہیے۔ عباس تابش نے اشعار میں کئی جگہوں پر روزمرہ کے الفاظ ومحاورات استعمال کیے ہیں۔ ان خصوصیات کی بدولت، تابشؔ ایک وسیع حلقۂ قارئین رکھتے ہیں کیوں کہ اُن کی غزلیں سادہ وآسان فہم ہیں۔ یہی بات انھیں معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔ ظفر اقبال ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''عباس تابش کی حیثیت ایک ایسی درس گاہ کی ہے جہاں

اصیل شاعری کا فن مکمل طور پر سیکھا جا سکتا ہے اس کے
لیے آپ کو سبق لینے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک دفعہ اس
کی شاعری کے چمن زار سے گزر جائیے یہ ہنر آپ پر خود
ہی وا ہوتا چلا جائے گا۔ اپنے تازہ کار ہم عصروں کو متاثر
کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے، جس میں اسے مرکزی
حیثیت حاصل ہوگئی ہے، میں اُس کی شاعری کا شروع
ہی سے قائل ہوں''(۸۶)۔

عباس تابش ہم عصر شاعروں میں بہت نمایاں شاعر ہیں، عہدِ حاضر کی اُردو غزل میں وہ اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں، اس بات کو افتخار عارف یوں بیان کرتے ہیں:

''پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی اور اظہار الحق
کے بعد عباس تابش اُردو غزل کی روایت کو ثروت مند
بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر
ہیں۔ ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیکی روایت کے
دائروں میں رہتے ہوئے مضمونِ تازہ کی نئی راہیں نکالتا
ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف
گامزن ہے۔ عباس تابش اپنی نسل کے مقبول ترین
شاعروں میں ہیں''(۸۷)۔

عباس تابش کے سینئر اور معاصر شعرا بھی اُن کے فنِ غزل گوئی کے معترف ہیں، کیوں کہ تابشؔ زبردست تخلیقی صلاحیتوں کے حامل شاعر ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی، تابشؔ
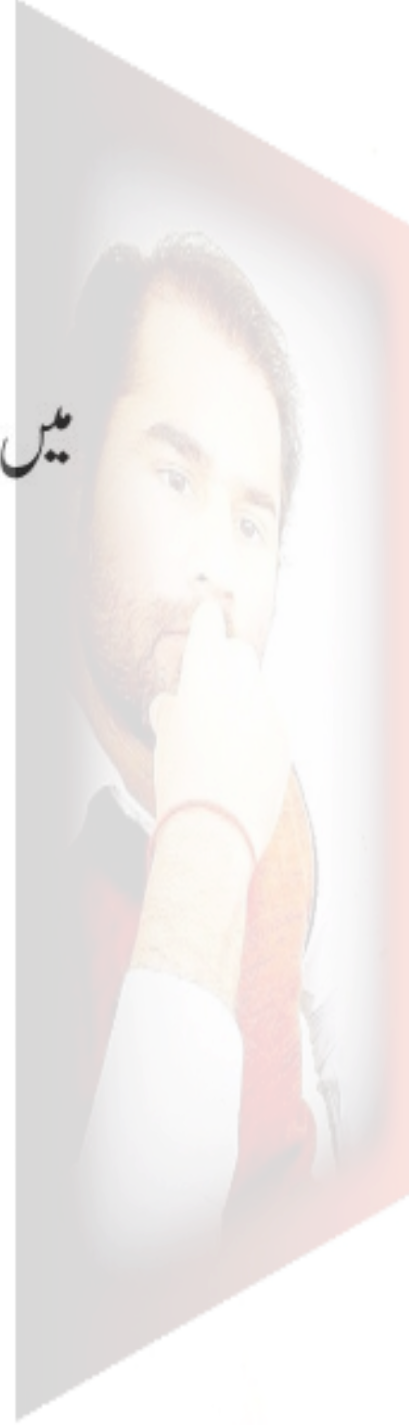
کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں:

> ''عباس تابش نے شاعری کو رقص درویش بنا دیا ہے تو پھر یہ کچھ اور شاعری ہے اور یہ اور شاعری سے آگے کی چیز ہے۔ لفظ وخیال کی حکمرانی اور ہجر ووصال کی درویشی کے امتزاج سے شاعری کا جو مزاج بنا ہے اسے عباس تابش نے ایک ان دیکھی معراج پر پہنچا دیا ہے''(۸۸)۔

معاصر اُردو غزل میں عباس تابش کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے شکیل جاذب ''رقص درویش'' کے فلیپ پر یوں رقمطراز ہیں:

> ''عباس تابش نے بغیر کسی منافقانہ تنقید وتوصیف کے اپنے آپ کو ہر دوست اور دشمن سے منوایا ہے آج اُس کا نام سن کر بہت سی پیشانیوں پر شکنیں تو ضرور پڑ جاتی ہوں گی مگر میرؔ سے نسبت رکھنے والے اس سچّے عاشق کی شاعری پر کوئی انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سچ تو یہ ہے اس نے نہ صرف ہم عصروں، اپنے بعد آنے والوں بلکہ اپنے سینئرز کے لیے بھی شعر کہنا مشکل کر دیا ہے''(۸۹)۔

رحمٰن فارس بھی عباس تابش کی غزل کے معترف ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش دیارِ عشق کی خاک کو آبِ گریہ میں

> ہولے ہولے گوندھتا ہے پھر خط وخالِ یار سے کشید کی گئی ملاحت اور ہجر و وصال کی شیریں تلخی اس کے اجزا بنتے ہیں، رائیگانی کی ہلکی آنچ پر یہ پکوان تیار ہوتا ہے جو اسے چکھ لے اسی کا ہو جاتا ہے''(۹۰)۔

احمد عطاراللہ معاصر اُردو غزل میں عباس تابش کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> ''سب کو غزل پر فخر ہے لیکن غزل کو جن شعرا پر فخر رہے گا اُن میں عباس تابش کا نام بھی شامل ہے فرازؔ کے بعد صرف عباس تابش ہی کو قبولِ خاص و عام کی سند نصیب ہوئی ہے''(۹۱)۔

حسنین سحر، عباس تابش کی غزل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں دورِ حاضر اور مستقبل کے اساتذہ غزل کا یہ دور عباس تابش کے نام کرنے میں فخر محسوس کریں گے''(۹۲)۔

میں نے جب عباس تابش کی شاعری پر تحقیقی وتنقیدی کام کا آغاز کیا تو سب سے پہلے یہ دیکھا اور محسوس کیا کہ اُن کے معاصرین بھی اُن کے فنِ غزل گوئی پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ ظفر اقبال، احمد ندیم قاسمی اور خورشید رضوی سمیت متعدد شعرا نے عباس تابش کی غزل کو سراہا اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ طارق کریم کھوکھر بھی انھی میں سے ایک ہیں وہ لکھتے

ہیں:

''ظفر اقبال کے بعد اُردو غزل نقطۂ انجماد پر ٹھہر گئی تھی۔ عباس تابش کی تخلیقی حدت نے اسے ایک دفعہ پھر نئے راستوں پر رواں کر دیا ہے میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عباس تابش ۸۰ء کی دہائی کے بڑے شاعر ہیں''(۹۳)۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، عباس تابش کے شعری مقام و مرتبے کا تعیّن کرتے ہوئے اُن کو معاصر اُردو غزل کا ایک اہم شاعر قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عباس تابش، خیالات کو ذاتی طور پر محسوس کر کے شعر کا جامہ پہناتے ہیں اس لیے ان کی شاعری میں قدیم یا جدید شعرا کے خیالات کی تکرار کہیں موجود نہیں ان کے ہاں انفرادیت اور تازہ کاری جگہ جگہ موجود ہے چنانچہ ان کا کلام گہرے تاثر کا حامل ہے اور گزشتہ چند دہائیوں سے جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے اس میں عباس تابش کا مقام بہت بلند ہے''(۹۴)۔

عباس تابش کی شاعری کو عصرِ رواں کی بڑی شاعری قرار دیتے ہوئے مرتضٰی برلاس لکھتے ہیں:

''عباس تابش نے اپنے بیشتر معاصرین کی طرح خود کو

لفظی بازی گری میں ضائع نہیں کیا بلکہ روایت سے پیوند کاری کرتے ہوئے ذائقہ دار پھل اور نئے نئے پھول دریافت کیے اور اس تجربہ سے غزل کی ڈکشن کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا۔ اس لسانی اور موضوعاتی تجربہ سے اس کو ایک رجحان ساز شاعر کا منصب عطا ہوا۔ میں پورے اعتماد سے یہ کہتا ہوں کہ عباس تابش کی غزل ہی عصرِ رواں اور اس سے منسلک مستقبل کی غزل کہلائے گی''(۹۵)۔

عباس تابش نے غزل کو نئے اسلوب سے آشنا کر دیا ہے۔ اُنھوں نے غزل میں نئے نئے مضامین سمو دیے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں شاعری کو نئے لہجے اور نئی زبان وبیان کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لیے تابشؔ نے اپنے اشعار میں متعدد نئے استعاروں، تشبیہوں اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ اُنھوں نے جدید اُردو غزل کے ارتقا میں مسلسل اضافہ کرتے ہوئے اسے عوامی و اجتماعی زاویہ نظر عطا کر دیا ہے۔

عباس تابش کی غزل میں خیالات و نظریات کا دامن بہت وسیع ہے اُنھوں نے زندگی کے تمام مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے اجتماعی مسائل کو بھی غزل میں پیش کر دیا ہے۔ اس لیے ان کا کلام نئے موضوعات سے مالا مال ہے، عصر حاضر کی غزل پر طائرانہ نظر ڈالیں تو عباس تابش کی غزل بڑی نمایاں اور بڑی معیاری غزل لگتی ہے۔ وہ چوں کہ روایت سے جڑے ہوئے جدید لہجے کے شاعر ہیں، اس لیے اُن کی شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور یگانہؔ سمیت اساتذہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایت سے خوب اکتساب کیا ہے، اعلیٰ طبقے کے شعرا کے کلام پر ان کی نظر رہتی ہے اس لیے انھوں نے بھی اعلیٰ

شاعری تخلیق کی ہے۔ اس بات کو حالی نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' میں یوں قلمبند کیا ہے:

> ''ابن رشیق کہتے ہیں کہ شاعر کو اعلیٰ طبقے کے شعرا کا کلام یاد ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے شعر کی بنیاد اسی منوال پر رکھے جو شخص اساتذہ کے کلام سے خالی الذہن ہوگا اگر وہ محض طبیعت کی اُپج سے کچھ لکھ بھی لے تو اس کو شعر نہیں بلکہ نظم ساقط از اعتبار یا ٹکسال باہر کہیں گے۔ پس جب اُس کا حافظہ بُلغا کے کلام سے پر ہو جائے اور اُن کی روش ذہن کی لوح پر نقش ہو جائے تب فکر شعر کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اب جس قدر مشق زیادہ ہوگی اُسی قدر ملکۂ شاعری مستحکم ہوگا''(۹۶)۔

عباس تابش کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو دنیا کے تمام مقبول شعرا کے کلام میں ہوتی ہیں۔ حالی ''مقدمہ شعروشاعری'' میں ملٹن کی اس رائے کو یوں قلمبند کرتے ہیں:

> ''شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو''(۹۷)۔

عباس تابش عصر حاضر میں جدید اُردو غزل کے عہد ساز شاعر ہیں۔ آنے والے نئی نسل کے شعرا کے لیے وہ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شہزاد نیئر ''بیاض'' میں عباس تابش کی اُردو غزل کے مزاج کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش کی شاعری ''از دل فیزد، بر دل ریزد'' کی عمدہ تفسیر ہے وہ قلم سے نہیں دل سے شعر لکھتے ہیں جذبے کا وفور، قاری کے شعور کو انگیخت کر کے اسے ایسی شعری دنیا میں لے جاتا ہے جو عباس تابش کی دنیا ہے...... ''تمہید'' سے لے کر تازہ مجموعے تک ان کی فکر اور فن میں معین رفتار سے ارتقا ہوتا ہوا نظر آیا ہے، یہ ارتقا مصرعے کی تراش، فکر کی رفعت، بلاغیت کلام اور شعر در شعر پھیلے ہوئے حسن تغزل میں جلوہ گر ہے۔ محبتوں کی سحر کاریوں میں بیتے ہوئے عہدِ حاضر کے انسان ان کا خصوصی موضوع ہیں موضوعاتی تنوع البتہ جا بجا دکھائی دیتا ہے...... ان کا شعری مزاج روایت سے بھرپور کسبِ فیض کرتے ہوئے غزل کے فن کو آگے بڑھانے سے عبارت ہے، مضمون آفرینی، تاثر پذیری اور حسن تغزل اس مزاج کی جان ہیں، ایمائیت اور رمزیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھرپور ابلاغ اس مزاج کی خصوصیّت ہے یہی وجہ ہے کہ عباس تابش کے اشعار دل میں اترنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں''(۹۸)۔

تابش نے مضامین اس موثر پیرائے میں بیان کیے ہیں کہ جیسے مضمون خود بخود بے ارادہ ان سے ادا ہوا ہے۔ اُن کے خیالات بلند اور دقیق ہیں مگر پیچیدہ اور ناہموار نہیں اُن کے کلام کا رنگ و آہنگ ہی اچھوتا ہے، اس لیے اُن کی اُردو غزل کو معاصر اُردو غزل میں

اہم اور معتبر مقام حاصل ہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب اُردو غزل عباس تابش پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ اس تمام تر بحث کے بعد میں اس زاویے پر پہنچا ہوں کہ عباس تابش کی غزل ہی معاصر اُردو غزل کی نمائندہ اور بہترین غزل ہے۔

حواشی

(۱) محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء ص ۲۳۸

(۲) رشید احمد صدیقی، جدید اردو غزل، کراچی، باسلام پریس، ۱۹۸۲ء، ص ۵۷

(۳) انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷

(۴) انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷

(۵) الطاف حسین، حالی، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۳

(۶) شبلی نعمانی، شعر العجم (جلد پنجم)، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۲ء، ص ۳۲

(۷) ابواللیث صدیقی، غزل اور متغزلین، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۹ء، ص ۸

(۸) ابواللیث صدیقی، تجربے اور روایت، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۸ء، ص ۲۱۳

(۹) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۳

(۱۰) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۷

(۱۱) انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۸، ۱۰۹

(۱۲) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۸

(۱۳) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۰، ۲۴۱

(۱۴)نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ___ ایک مطالعہ، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۹

(۱۵)وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۲

(۱۶)وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۶

(۱۷)وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۵

(۱۸)انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۲۳

(۱۹)نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ___ ایک مطالعہ، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

(۲۰)انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۰

(۲۱)انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۲، ۱۵۳

(۲۲)انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۷

(۲۳)انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعتِ اول، ۱۹۸۵ء، ص ۵۱۳

(۲۴)انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعتِ اول، ۱۹۸۵ء، ص ۵۱۷

(۲۵)انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول، ۱۹۸۵ء، ص ۵۱۷، ۵۷۲

(۲۶)انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول، ۱۹۸۵ء، ص ۵۷۶

(۲۷)انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت اول ۱۹۸۵ء، ص ۴۷۳

(۲۸)وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۸

(۲۹)نظیر صدیقی، جدید اردو غزل ___ ایک مطالعہ، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۹

(۳۰)احمد ندیم قاسمی، فلیپ، برف کی ناؤ از مظفر وارثی، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۴ء

(۳۱)شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۶

(۳۲)شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۳

(۳۳)شکیل جاذب، دیباچہ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴

(۳۴)شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۴

(۳۵)محمد اظہار الحق، دیباچہ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

(۳۶)محمد اظہار الحق، دیباچہ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء، ص ۱۲، ۱۳

(۳۷)طارق کریم کھوکھر، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۳۸)افتخار عارف، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۳۹)خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

(۴۰)مرتضیٰ برلاس، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

(۴۱)خالد احمد، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت دوم ۱۹۹۹ء، ص ۱۲، ۱۳

(۴۲)مظفر عباس، ڈاکٹر، اردو کی زندہ داستانیں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۵۱، ۵۲

(۴۳)عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم، ۱۹۹۶ء، ص ۴۱

(۴۴) سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی دبستان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۲

(۴۵) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۳۲

(۴۶) شکیل جاذب، دیباچہ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵

(۴۷) خالد احمد، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت دوم ۱۹۹۹ء، ص ۱۳

(۴۸) شکیل جاذب، دیباچہ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵

(۴۹) شبلی نعمانی، شعر العجم (جلد پنجم)، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۲ء ص ۴۷

(۵۰) عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۳، ۱۱۴

(۵۱) فیض احمد فیض، میزان، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۷، ۴۸

(۵۲) شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۴۔۹۵

(۵۳) عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول فروری ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۱

(۵۴) شکیل جاذب، دیباچہ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴

(۵۵) عباس تابش، دیباچہ، آسمان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵

(۵۶) شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۴

(۵۷) ثوبیہ جمال، سلیم احمد صدیقی (حیات و ادبی خدمات)، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۹ء، ص ۴۹

(۵۸) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم وتحسین شعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

(۵۹) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم وتحسین شعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۹

(۶۰) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۰

(۶۱) تنویر حسین، پروفیسر، اصنافِ ادب اردو، لاہور، مکتبہ فروغِ علم، ۱۹۹۹ء، ص ۱۸۶

(۶۲) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم وتحسین شعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۳

(۶۳) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم وتحسین شعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۴

(۶۴) نیاز فتح پوری، علامہ، انتقادیات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۸۷

(۶۵) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۳

(۶۶) نیاز فتح پوری، علامہ، انتقادیات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۸۷

(۶۷) رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۰

(۶۸) نیاز فتح پوری، علامہ، انتقادیات، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۴۲

(۶۹) تنویر حسین، پروفیسر، اصنافِ ادب اردو، لاہور، مکتبہ فروغِ علم، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲

(۷۰) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱، ۱۴

(۷۱) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۴۱

(۷۲) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۴۰

(۷۳) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۴۸

(۷۴) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۴۹

(۷۵) آغا ناصر، گمشدہ لوگ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۷

(۷۶) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۲۰

(۷۷) حسن عباسی، انٹرویو، راقم، لاہور، ۱۵ مارچ ۲۱۰۴ء (ملاحظہ کیجیے ضمیمہ ب، ص ۳۶۲، ۳۶۳)

(۷۸) رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱

(۷۹) ظفر اقبال، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۵۹

(۸۰) عطاء الحق قاسمی، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۶۷

(۸۱) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۰

(۸۲) خورشید بیگ میلسوی، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۱

(۸۳) وحید الرحمٰن خان، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۸

(۸۴) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، بیاض، لاہور، اپریل، ۲۰۰۴ء، ص ۸۷

(۸۵) جاوید اختر پاشا، بیاض، لاہور، اپریل، ۲۰۰۴ء ص ۹۷

(۸۶) ظفر اقبال، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۸۷) افتخار عارف، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۸۸) اجمل نیازی، ڈاکٹر، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۸۹) شکیل جاذب، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۰) رحمٰن فارس، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۱) احمد عطاراللہ، فلیپ، رقص درویش، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۲) حسنین سحر، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۳) طارق کریم کھوکھر، فلیپ، رقص درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۴) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۵) مرتضیٰ برلاس، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

(۹۶) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۵۲

(۹۷) الطاف حسین حالی، مقدمہ شعروشاعری، لاہور، جدید بک ڈپو، ۱۹۷۶ء، ص ۵۵

(۹۸) شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۳، ۹۴

☆☆☆☆☆

باب سوم

عباس تابش بطور نظم گو

(الف) جدید اُردو نظم کا ارتقا ________ عباس تابش تک

(ب) عباس تابش کی اُردو نظم کا فکری و فنی (موضوعاتی و اسلوبیاتی) جائزہ

(ج) معاصر اُردو نظم میں عباس تابش کا مقام و مرتبہ

باب سوم

عباس تابش بطور نظم گو

(الف) جدید اُردو نظم کا ارتقا ______ عباس تابشؔ تک

نظم کا لفظ نثر کا متضاد ہے اور یہ تمام شاعری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نظم ہی شاعری اور نثر میں امتیاز کرتی ہے اور اس کا عام مطلب ربط وضبط اور اعتدال وتوازن ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غزل بھی نظم ہی کے زمرے میں آتی ہے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی اور قطعہ بھی نظم میں شامل ہیں لیکن شاعری میں غزل کے برعکس نظم کو رکھا جاتا ہے۔ نظم عموماً ایک موضوع اور ایک ہی مرکزی خیال رکھتی ہے جب کہ غزل کا ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت میں ہوتے ہوئے ایک مکمل مضمون و مفہُوم رکھتا ہے۔ جو اشعار مخصوص ہیئتوں میں کسی ایک موضوع پر کہے گئے ہوں نظم کے دائرے میں آتے ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم کی کئی اقسام ہیں یہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ اور رباعی کی صورت میں بھی ہے اور مسمط میں بھی نظر آتی ہے۔ مسمط مختلف بندوں میں ہوتی ہے۔ مثلث کے تین بند ہوتے ہیں، مربع کے چار، مخمس کے پانچ اور مسدس کے چھ بند ہوتے ہیں۔ نظمیں ترکیب بند اور ترجیع بند میں بھی لکھی گئی ہیں۔ بیسویں صدی کے نظم

نگاروں نے انگریزی ادب سے کچھ ہیئتیں لے کر اسے اُردو شاعری کا حصّہ بنالیا ہے، بے قافیہ نظم اور سانیٹ انگریزی ہی سے اُردو میں آئی۔ بیسویں صدی کو اُردو نظم میں بڑی اہمیّت حاصل رہی ہے کیوں کہ اس صدی میں شاعری میں بہت زیادہ تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ عالمی سطح پر جب بھی کوئی تبدیلی ہوئی اس کے اثرات اُردو نے بھی قبول کیے۔ انگریزی کے اُردو ادب پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، معاشرے میں ہونے والی متعدد تبدیلیوں اور رجحانات نے اُردو ادب کو بدل کر رکھ دیا۔ اسی لیے بیسویں صدی کو تبدیلیوں اور مختلف رجحانات کی صدی کہا گیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ دیکھیں تو قدیم شعرا اور نقادوں کے ہاں 'نظم' کوئی صنفِ سخن نہیں تھی۔ انھوں نے شاعری کو ہیئت کے اعتبار سے غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی سے منسوب کیا ہوا تھا۔ 'نظم' کو ایک صنف کا درجہ سب سے پہلے حالؔی نے دیا۔ انھوں نے غزل کے گھسے پٹے مضامین کو نظر انداز کر کے نیچرل نظموں پر توجہ مبذول کروائی۔ سرسید کی اصلاحی تحریک اور انگریزی ادب کے زیر اثر نظم کو فروغ ملا مگر نظم کے آغاز و ترویج میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کا بڑا عمل دخل ہے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی اور مولانا محمد حسین آزاؔد اس انجمن کے بڑے شاعر تھے، اس انجمن میں شعرا کو مختلف موضوعات دیے جاتے تھے جس پر وہ نظمیں لکھ کر مشاعرے میں شرکت کرتے تھے۔ اس طرح اُردو نظم نے ایک الگ صنفِ سخن کی حیثیت اختیار کر لی۔ غزل کے برعکس جس صنف کو فروغ ملا وہ جدید نظم ہے، حالؔی اور ان کے رفقا اور معاصرین نے نظم نگاری کی روایت مستحکم کی۔ شبلی، اکبرالہ آبادی اور اسماعیل میرٹھی نے نظم کی روایت میں اضافہ ضرور کیا مگر اُن کی نظم جدید اُردو نظم کے زمرے میں نہیں آتی کیوں کہ جدید نظم قدیم نظم سے ہیئت کے لحاظ سے ذرا مختلف چیز ہے۔ جدید نظم میں موضوعات اور ہیئتوں کی

مکمل آزادی ہے، اس کے لیے شعرا کسی مخصوص طرزِ بیان کے پابند نہیں ہیں۔

جدید اُردو نظم میں داخلیت کا عنصر زیادہ نمایاں ہے، شعرا اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو نظم میں بیان کر دیتے ہیں۔ جدید نظم کا کینوس بہت وسیع ہے اس میں لاتعداد موضوعات اور متعدد سوچ کے زاویے سما جاتے ہیں۔ جدید اُردو نظم کو ہیئت کے لحاظ سے پابند نظم، معرا نظم، آزاد نظم، سانیٹ اور نثری نظم کے نام دیے گئے ہیں۔

پابند نظم

پابند نظم کہنے کے لیے قافیہ و ردیف، وزن، بحر کا پابند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بغیر ردیف کے بھی پابند نظم کہی جا سکتی ہے پابند نظم کسی بھی ہیئت مثنوی، مسدس، قصیدہ، مربع یا ترکیب بند کی صورت میں تخلیق کی جا سکتی ہے۔ نظم میں عموماً کسی ایک خیال یا مضمون کو موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے۔

معرا نظم

نظم معرا میں قافیہ اور ردیف ضروری نہیں ہوتا، صرف وزن اور بحر کا ہونا لازمی ہے۔ معرا نظم کی ابتدا عبدالحلیم شرر سے ملتی ہے اور بعد میں اسماعیل میرٹھی، آزاد، کاکوروی اور طباطبائی سمیت کئی شعرا نے معرا نظمیں لکھی ہیں۔ نظم معرا کا رواج اُس وقت زور پکڑا جب بیسویں صدی کے شعرا نے قافیہ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انگریزی ادب سے بھی نظم معرا لکھنے کی روایت کو تقویت ملی۔ نظم معرا شعرا نے اس لیے لکھنا شروع کی کیوں کہ قافیے کی پابندی ان کے تخیل میں رکاوٹ بنتی تھی اور وہ محض قافیے کی رکاوٹ کی وجہ سے اپنے اچھے اچھے خیالات ضائع کر دیتے تھے۔

آزاد نظم

آزاد نظم ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہے، اس کا کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا ہوتا ہے کیوں کہ شاعر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے مصرعے میں ارکان کی تعداد کا تعیّن کرے۔ ارکان کی تعداد زیادہ ہو تو مصرع بڑا ہوتا ہے اور اگر ارکان کی تعداد کم ہو تو مصرع چھوٹا ہوتا ہے۔ آزاد نظم میں مصرعے برابر نہیں ہوتے بعض شعرا نظم میں صوتیاتی آہنگ و حسن پیدا کرنے کے لیے مصرعوں میں قافیے بھی لے آتے ہیں۔ انگریزی کی آزاد نظم کی طرز پر ہی اُردو میں آزاد نظم نگاری کی جاتی ہے۔ ن۔م۔ راشد اور تصدق حسین خالد کو آزاد نظم کا بانی قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ میرا جی، مجید امجد اور فیض احمد فیض آزاد نظم کے بڑے شاعر ہیں۔

سانیٹ

انگریزی ادب کی ایک قسم سانیٹ بھی ہے، انگریزی سانیٹ سے متاثر ہو کر اُردو میں بھی کچھ شعرا نے سانیٹ لکھے مگر یہ صنف اُردو میں زیادہ رواج نہ پا سکی۔ اس نظم میں کل چودہ مصرعے ہوتے ہیں اور قافیے ایک خاص ترتیب سے ہوتے ہیں۔ سانیٹ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصّہ آٹھ مصرعوں اور دوسرا حصّہ چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اُردو میں ن۔م۔ راشد اور اختر شیرانی سمیت کئی شعرا نے سانیٹ لکھے مگر یہ صنف اُردو میں مقبول نہ ہو سکی۔ جس طرح غزل کی ابتدا دکن سے ہوئی اسی طرح نظم کا آغاز بھی دکن سے ہوا ہے بلکہ دکنی دور میں نظم پہلے تخلیق کی گئی اور غزل بعد میں وجود میں آئی دکن میں شاعری دینی، مذہبی اور تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی تھی، اس لیے غزل کے بجائے نظم کچھ زیادہ سود مند ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں بادشاہوں کے قصیدے کہنے کا رواج عام تھا، شعرا بادشاہ

کی مداح کے لیے قصیدے کہتے تھے اور بادشاہ اُن کو انعامات سے نوازتے تھے۔ دکنی دور میں داستانیں بھی منظوم کہی جاتی تھیں اور اس مقصد کے لیے صنفِ مثنوی کو استعمال کیا گیا۔ دکنی دور کی نظم قصیدے، گیت، مثنوی اور مرثیے کی صورت میں ملتی ہے۔ سب اصناف ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں لیکن سب نظم کے دائرے میں آتی ہیں۔ اُردو نظم کی روایت کے متعلّق ڈاکٹر رشید امجد اپنی کتاب ''پاکستانی اردو ادب (رویے اور رجحانات) میں رقمطراز ہیں:

> ''دکنی عہد سے بیسویں صدی تک آتے آتے اردو نظم نے کئی رنگ، کئی روپ اختیار کیے، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، مخمس اور قطعہ وغیرہ نظم ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ پرانی نظم اپنی انھی ہیئتوں یعنی مسدس، مخمس، مثنوی اور قطعہ وغیرہ کی وجہ سے جانی جاتی تھی جب کہ جدید نظم ہیئت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی فنی وحدت اور اختصار کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے''(۱)۔

اُردو نظم کا باقاعدہ آغاز سلطان قطب شاہ کی شاعری سے ہوا کیوں کہ قطب شاہ کے کلیات میں نظمیں زیادہ اور غزلیں کم تعداد میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نظم میں شاہ حاتم کی مثنویاں، سودا کی ہجویات، میر تقی میر اور میر حسن کی مثنویاں بھی موجود ہیں۔ قدیم دور میں شعرا نے قصیدہ، مثنوی اور رباعی وغیرہ میں نظمیں لکھیں اور بعد میں ایک عرصہ غزل رائج رہی۔ یہ روایتی غزل بدلتے ہوئے حالات میں زمانے کا ساتھ دینے سے قاصر تھی اور قدیم دور کے گھسے پٹے مضامین دہرا دہرا کر شعرا تنگ آ چکے تھے، اُنھوں نے معاشرے کے

حالات میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ماحول، سماج اور بدلتے ہوئے رویوں، رجحانات کو غزل میں بیان کرنا انھیں موزوں نہیں لگتا تھا، اس لیے شعرا نے اپنا رخ نظم نگاری کی طرف موڑ لیا۔

اُردو نظم کو عروج اُس وقت ملا جب حاؔلی اور آزاؔد نے انجمن پنجاب کے تحت شعوری کوششیں کرتے ہوئے نظم میں نیا لب و لہجہ استعمال کیا۔ الطاف حسین حاؔلی نے تنقیدی کتاب لکھ کر شعرا کو پرانا روایتی طرزِ سخن ترک کرنے کے لیے اکسایا۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں روایتی طرحی مصرع دینے کے بجائے مخصوص مضامین دیے جاتے اور شعرا ان مضامین کے تحت نظمیں تخلیق کر کے مشاعرے میں شرکت کرتے تھے۔ انجمن کے ان مشاعروں کا مقصد فقط شاعری کو عشق و محبت، ہجر و وصال، زلفِ بتاں اور مبالغہ آرائی سے آزاد کرانا تھا۔ آغاز میں نظم نگاری بھی روایتی انداز میں ہوتی رہی مگر ممتاز و منفرد اُس وقت ہوئی جب انجمن پنجاب کے تحت تخلیق ہونے لگی۔ انجمن پنجاب نے جدید اُردو نظم کو بڑا فروغ دیا، اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں رقمطراز ہیں:

> ''جدید اردو نظم کا بیج اُس وقت بارور ہونا شروع ہو گیا تھا جب قدیم دلی کا شیرازہ بکھر گیا اور اسے لاہور منتقل کرنے کے بعد گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ چنانچہ علم و ادب کی وہ شمع جس نے قرونِ اول میں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف سفر کیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف مراجعت شروع کی تھی۔ اب لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھی اور شمع برداروں کے اس

قافلے میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی، الطاف حسین حالؔی، پیارے لال آشوب، درگاہ پرشاد نادر اور محمد حسین آزاد جیسے ادبا شامل تھے''(۲)۔

انجمن پنجاب کے پلیٹ فارم نے نئی نظم کے فروغ کے لیے راہیں ہموار کیں۔ حالؔی اور اس کے رُفقا نے غزل کے بجائے نظم نگاری کو ترجیح دی، بلاشبہ اُردو نظم کے ارتقا و ترویج میں انجمن پنجاب کے شعرا کا بڑا عمل دخل ہے۔ کچھ ناقدین کہتے ہیں کہ جدید نظم کا آغاز حالؔی سے نہیں بلکہ اقبالؔ سے ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''اردو نظم کے بیشتر نقادوں نے موضوع کی تبدیلی کو جدید نظم کی ابتدا کے مترادف قرار دے کر قائم کیا ہے جدید اردو نظم حالؔی کے دور میں بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ موضوع کی تبدیلی تو ہر نئے دور کا ایک امتیازی وصف ہے کیوں کہ نیا دور اپنے ساتھ نئی اشیا، نئے محرکات اور نئے مسائل لے کر آتا ہے......خارجی زندگی سے داخلی زندگی کی طرف داخلی زندگی کی طرف آنے کا وہ انداز جو نظم کا امتیازی وصف ہے حالؔی کے دور کی نظم میں بھی ناپید ہے لہٰذا اصولاً جدید اردو نظم کی ابتدا کو اقبال سے متعلّق کرنا چاہیے نہ کہ حالؔی سے......بایں ہمہ اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ غزل بجائے نظم کو مرکزی حیثیت تفویض

کرنے کی تحریک کا آغاز یقیناً حالؔی کے دور سے ہوا اس کی کئی وجوہ تھیں ......معاشرے کے تحرک نے نظم کے فروغ میں تو مدد دی لیکن فرد کی انفرادیت کے پوری طرح نہ ابھرنے کے باعث نظم کا داخلی پہلو تشنہ ہی رہا۔ اس کام کو بعد ازاں اقبالؔ نے مکمل کیا اور فرد کی آزادی اور انفرادیت کے اظہار کے لیے راہ ہموار کی''(۳)۔

اس دور کے نظم گو شعرا میں حالؔی کے علاوہ محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی، شبلی اور اکبر الہ آبادی قابل ذکر نام ہیں۔ شبلی اور اکبر الگ الگ مکتبۂ فکر کے علم بردار تھے جب کہ حالؔی، آزاد اور اسماعیل میرٹھی الگ تھے۔ سب کا مقصد قوم کی اصلاح تھا۔ حالؔی اور اس کے رفقا تلقین اور وعظ و نصیحت سے قوم کی اصلاح چاہتے تھے جب کہ اکبؔر اور شبلی اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں معاشرتی ناہمواریوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ حالی کا خیال تھا کہ لوگ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں۔ انھوں نے اسلاف کے کارنامے پیش کر کے ترقی پذیر رجحانات اپنانے کی کوشش کی۔ جب کہ اکبؔر سمجھتے تھے کہ یہ ترقی پذیر رجحانات قوم کو تنزل اور انحطاط کی طرف لے جائیں گے۔ حالی اور اکبر اپنے زمانے میں اُردو نظم کے دو بڑے ستون تھے۔ حالی کے معاصر محمد حسین آزاد کے ہاں بھی نظم کے ذریعے قوم کی اصلاح کا کام لینے کی بات کی گئی ہے۔ حالؔی کی نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ
کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ
بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ
کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں وہ

نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ
بہت بڑھ کے اور بڑھ جاتے ہیں وہ

(مسدس حالی)

مولانا محمد حسین آزاد، تحریک انجمن پنجاب کے روحِ رواں تھے انھوں نے نظم نگاری کے ساتھ ساتھ اصلاحی شاعری کی تخلیق کے لیے مختلف مضامین بھی لکھے جو شعرا کے لیے محرک ثابت ہوئے۔ محمد حسین آزاد کی نظم ملاحظہ کیجیے:

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی
مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھراتا ہے
اور قلم ہاتھ سے تھرا کے گرا جاتا ہے
میرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا

(محمد حسین آزاد)

شبلی نعمانی نے عصری تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، عصری موضوعات اور حادثات پر نظمیں لکھیں۔ ان کی نظم نگاری میں سادگی، روانی اور ترنم کی خاصیّت عام ملتی ہے شبلی بھی تحریک اصلاح کے بڑے اہم ادیب ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے بھی نظم کو جدید ہیئتیں دی ہیں، انھوں نے جدید اسلوب کے تحت ایک تحریک کا کام کیا۔ شرر نے آزاد نظم کی بنیاد بھی رکھی۔ اس دور میں اکبرالہ آبادی جدید طرزِ شاعری کے پیش رو ثابت ہوئے، اُنھوں نے قومی وملی موضوعات کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا۔ اکبر نے خارجی پہلوؤں اور اجتمائی مسائل کو اپنی ذات کا حصّہ بنا کر شاعری میں ایک نیا تجربہ کیا۔ نظیرا کبرآبادی بھی اس زمانے کے ایک بڑے نظم نگار ہیں۔ ابتدائی دور کے اُن نظم نگاروں میں نظیرا کبرآبادی کا نام سرفہرست ہے،

انھوں نے بھی موضوعاتی نظمیں تخلیق کیں۔ انھوں نے عوام، خواص، رسم و رواج، میلوں ٹھیلوں وغیرہ کو موضوعِ سخن بنایا، اس سلسلے میں ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

”نظیرا کبرآبادی خود ایک انجمن ہے پھر کوئی میلہ، ٹھیلہ، جلوس، تہوار اور تقریب ایسی نہ تھی جس میں وہ شرکت نہ کرتے تھے اور یہ شرکت محض تماشائی کی حیثیت سے نہیں ہوتی تھی۔ وہ خود ان دلچسپیوں اور تفریحوں میں حصّہ لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں بڑی اصلیت اور حقیقت پائی جاتی ہے“(۴)۔

نظیرا کبرآبادی کی نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

دیکھے کوئی چمن میں تو پڑا ہے اجاڑ سا
غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبز ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا
نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

(نظیرا کبرآبادی)

اس دور کے شعرا میں اکبرالہ آبادی کے بعد عظمت الاﷲ خاں بلدی اور چکبست کا نام بھی اہم ہے یہ علمِ عروض اور تراکیب اور بحروں کی وجہ سے شعرا میں مقبول ہوئے۔ اس دور کے دوسرے شعرا میں سرور خیال آبادی، عزیز لکھنوی، نادر کاکوروی اور نظم طباطبائی کے نام اہم ہیں۔ طباطبائی کے منظوم ترجمے ”گورِ غریباں“ کو اہمیّت حاصل رہی ہے۔

سماعیل میرٹھی نے جدید نظم نگاری کے تحت قافیہ کے بغیر بھی نظمیں لکھیں ان میں ''چڑیا کے بچے'' اور ''تاروں بھری رات'' مشہور ہیں۔ انھوں نے حالیؔ کی تحریک کے تحت نظمیں لکھیں اور پند ونصائح کا انداز اپنایا کیوں کہ انھیں علم تھا کہ پند ونصائح کی اس روش کا بڑوں کی نسبت بچوں پر زیادہ اثر ہوگا۔ اس لیے اسماعیل میرٹھی بچوں کے لیے سیدھی سادی اور سبق آموز نظمیں لکھنے کے لیے مشہور ہیں۔ اُنھوں نے مناظر فطرت پر بھی طبع آزمائی کی اور گرمی، برسات، رات، شفق، ہوا اور قوس قزاح جیسی نظمیں تخلیق کیں۔ اسماعیل میرٹھی نے بے قافیہ نظمیں بھی کہی ہیں اُن کی ایک بے قافیہ نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

دو تین چھوٹے بچے چڑیا کے گھونسلے میں
چپ چاپ لگ رہے ہیں سینے سے اپنی ماں کے
چڑیا نے مامتا سے پھیلا کے دونوں بازو
اپنے پروں کے اندر بچوں کو ڈھک لیا ہے
(اسماعیل میرٹھی)

حالیؔ، اکبرؔ اور ان کے رفقا و معاصرین نے بلاشبہ نظم کے دامن کو پھیلا دیا اور جدید اُردو نظم کے لیے راستہ فراہم کر دیا لیکن جدید نظم کا آغاز اقبالؔ نے کیا، اس بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں:

''حالی، اکبر اور ان کے معاصرین نے نظم کے افق کو وسیع کر کے راہ تو ہموار کر دی لیکن دراصل جدید نظم کی ابتدا اقبالؔ ہی سے ہوئی اقبال نے نظم کو خارجی زندگی کے بیان کے علاوہ داخلی زندگی کی عکاسی کے لیے بھی استعمال کیا اور یوں گویا فرد کی داخلی دنیا کو برانگیختہ کر دیا۔

انفرادیت کی طرف اقبال کا یہی رجحان اسے جدید اردو نظم کا اولین علم بردار قرار دینے کے لیے کافی ہے''(۵)۔

اقبالؔ نے اپنے اسلاف کی عظمت کا تصور حالیؔ اور مغربی تہذیب سے اور نفرت کا رنگ اکبرؔ سے مستعار لیا۔ حالی کا نظریہ اسلامی نظریۂ حیات کی ترویج و تبلیغ تھا جب کہ اکبر الہ آبادی مغربی تہذیب کے سخت خلاف تھے۔ اقبال نے نفرت کی یہ روایت اکبر سے مستعار لی۔ اس لیے اقبال کے ہاں ابتدا میں اکبر کے تتبع میں نظمیں لکھنے کا رجحان صاف طور پر دکھائی دیتا ہے تاہم کچھ دیر بعد اقبال نے اکبر کے اس طنزیہ انداز کو چھوڑ دیا اور علمی و نظریاتی سطحوں پر مغربی تہذیب کی مخالفت میں سرگرم ہو گئے۔ اگرچہ اقبال نے تخاطب کا یہ انداز حالی اور اکبر سے مستعار لیا لیکن انھوں نے انسان اور امتِ مسلمہ کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کی۔ ہمالہ، دردِ عشق، موجِ دریا، انسان اور بزمِ قدرت اقبالؔ کے ابتدائی دور کی نظمیں ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری لاہور کے طرحی مشاعروں اور داغ کی شاگردی میں شروع کی لیکن جلد ہی انھوں نے غزل کی رسمی روایت کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے بیان کی وسعت کو سمیٹنے کے لیے صنفِ نظم کو زیادہ اختیار کیا۔ اقبال نے ابتدا میں فطرت کے مناظر پر نظمیں لکھیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اقبال کی ابتدائی نظم نگاری میں فطرت ان کا دل پسند موضوع ہے اور یہ انجمن پنجاب کی اس تحریک کی توسیع ہے جسے آزاد اور حالی نے چند سال قبل فروغ دیا تھا۔ تاہم اقبال نے حالی اور آزاد کی طرح مظاہر فطرت کے

سپاٹ بیان پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے فطرت کے خارجی زاویے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا اور اس کی داخلی حقیقت سے آگہی حاصل کرنے کی سعی کی‘‘(۶)۔

اقبال کی نظم ’’ہمالہ‘‘ کا ایک بند ملاحظہ کریں:

اے ہمالہ ! اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

(اقبال)

جدید اُردو نظم کے ارتقا میں ’’مخزن‘‘ کی ادبی تحریک نے بھی متعدد تخلیق کاروں کو متعارف کرایا تھا۔ ان میں اقبال اور ابوالکلام آزاد کے نام نمایاں ہیں۔ اس حوالے سے انور سدید لکھتے ہیں:

’’رومانی تحریک میں اقبال کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے مغربی شعرا کے چند خوبصورت تراجم کیے اور اردو کو چند ایسی نظمیں دیں جن کا مایۂ خمیر انگریزی مگر پیکر مشرقی تھا۔ اقبال کی رومانیت نے فرد کے متزلزل یقین کو سنبھالا دیا اور اس میں زندہ رہنے کی سکت پیدا کی‘‘(۷)۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ’’مخزن‘‘ کی ادبی تحریک نے نظم کو جدّت اور نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ شیخ عبدالقادر نے اس رسالے کے ذریعے جدید اُردو نظم کو ترویج و ترقی عطا کی۔ مخزن کی انفرادیت یہ ہے اس نے سرسید کی مادیت اور عقلیت کے بجائے شاعری میں تخیل اور رومانیت کے عناصر شامل کر دیے۔ مخزن سے اُردو نظم میں رومانی تحریک کا آغاز ہوا اور اس میں اختر شیرانی اہم شاعر ہیں۔ مخزن نے اقبال کی شاعری کو تفصیل سے بیان کیا، اُردو نظم کی روایت میں اقبال کو الگ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ اقبال نے نظم کو ایک نیا آہنگ دیا۔ اقبال، ورڈز ورتھ اور ٹینی سن سے گزر کر میکالے، ہیگل، نطشے، برگساں تک پہنچے اور اُردو نظم نگاری میں ہمالہ، مسجد قرطبہ اور خضرِ راہ جیسی نظموں کا اضافہ کیا۔

اقبال کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ قدیم و جدید کے چکر میں نہیں پڑے۔ انھوں نے فطرت کے خارجی مناظر کو انسان کے قلبی جذبات سے ملا کر شاعری کی۔ اقبال مغربی لٹریچر کے مطالعہ کے بعد جدید نظم نگاری کی طرف راغب ہوئے، وزیر آغا اس حوالے سے لکھتے ہیں:

’’اردو نظم میں اقبال کی حیثیت ایک موڑ کی سی ہے، وہ نظم کے کلاسیکی دور اور رومانی دور کے سنگھم پر استعارہ ہے اُس کے ہاں کلاسکیت کا انضباط، رکھ رکھاؤ اور تنظیم بھی ہے اور رومانیت کا تحرک، داخلیت پسندی اور ہیجان بھی، لیکن اس کی عظمت اس بات میں ہے کہ اُس نے خود کو کلاسکیت کے ٹھہراؤ، روایت کی کڑی گرفت اور اسلوب کی سنگ لاخ کیفیت سے بھی بچایا ہے اور رومانیت کے انتشار، یک رنگی اور مریضانہ ہیجان انگیزی سے بھی محفوظ

رکھا ہے اسلوب میں اُس نے پرانی تلمیحات اور استعارات کا استعمال تو کیا لیکن ایک اجتہادی روش اختیار کر کے ان کے مفاہیم میں کشادگی پیدا کر دی''(۸)۔

ڈاکٹر انور سدید، اپنی کتاب ''جدید نظم کے ارباب اربعہ'' میں اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کو جدید اردو نظم کا پیش رو کہا گیا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اقبال نے حالی، آزاد، شبلی، اکبرالہ آبادی اور اسمٰعیل میرٹھی جیسے شعرا کی نظم نگاری کے مقابلے میں اپنی شاخِ نہال فن کی پرورش بالکل مختلف انداز میں کی تھی۔ اقبال نے اردو نظم کو محض خطابیہ اور خارج کا بیانیہ بنانے کے بجائے اسے اپنے فکر و فلسفہ کا نقیب بنایا''(۹)۔

رومانوی اور ترقی پسند دو تحریکوں کے تحت اُردو نظم کو فروغ ملا۔ انور سدید اردو نظم کے تین بڑے شاعروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میراجی اس گروہ کے سب سے زیرک با کمال اور تخلیقی لحاظ سے خلاق شاعر تھے چنانچہ انھوں نے اردو نظم میں داخلیت کا وہ رجحان پیدا کیا جس کی ابتدا تصدق حسین خالد اور ن۔م۔ راشد کر چکے تھے ان تینوں شعرا کی

اساسی عطایہ ہے کہ انھوں نے پابند نظم کی مقبولیت کے دور میں آزاد اور معریٰ نظم کو اہمیّت دی اور یوں شعرا کو نہ صرف نئے اسلوبِ شعر سے روشناس کرایا، بلکہ جذبے کی جزو مد کو چھوٹے بڑے مصرعوں میں سمونے کا سلیقہ بھی سکھا دیا''(۱۰)۔

میراجی ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں حقیقت پسندی زیادہ ہے۔ اس لیے اُن کی شاعری کو ''دھرتی پوجا'' کی مانند کہا گیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں علامت نگاری کا استعمال عام کیا ہے۔ میراجی کی نظم نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حنیف کیفی اپنی کتاب ''اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم'' میں رقمطراز ہیں:

''میراجی کی آزاد نظم میں ایک واضح ارتقا نظر آتا ہے ہیئت کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی اس کے ساتھ ساتھ اس میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے''(۱۱)۔

میراجی کی ایک نظم کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت
آسماں بھی صاف ہے
اور ستارے اور چاند بھی

(میراجی)

ترقی پسند تحریک نے عوام و خاص میں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آشنائی کی ایک لہر پیدا کر دی۔ ایک استحصالی طبقے کی آواز ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں میں سنی گئی۔ اس تحریک کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر کے ساتھ کچھ ہم خیال دوستوں نے رکھی۔ ترقی پسند تحریک کے تحت شعرا نے غزل کے بجائے نظم کی طرف زیادہ توجہ دی۔ ان شعرا میں جوش ملیح آبادی سب سے نمایاں شاعر تھے۔ فیض احمد فیض نے بھی خوب نظم نگاری کی ان کی شاعری میں رومانوی اور ترقی پسند دونوں تحریکوں کے اثرات تھے لیکن اس کے باوجود فیضؔ ایک ترقی پسند شاعر تھے، علی سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز بھی اہم ترقی پسند شاعر تھے۔ علاوہ ازیں دیگر شعرا میں کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی اور عارف عبدالمتین کے نام اہم ہیں۔ جب کہ رضا ہمدانی، جمیل ملک، قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، ظہور نظر، علی حیدر زیدی، مجروع سلطان پوری، سلمان ادیب اور نظر حیدر آبادی کے نام بھی ترقی پسند شعرا میں شامل ہیں ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں فیض احمد فیض کی نظم نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''ترقی پسند شاعری میں فیضؔ کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے نظریے کی ترسیل کو مستقیم اور مستقیم انداز میں پیش کرنے کے تجربے کیے، چنانچہ ان کی بیشتر نظموں میں حقیقت نگاری علامتی روپ میں ڈھل گئی ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری کے گرد ایک دائرۂ نور گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ فیض نے بہت سے ہنگامی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں ......فیض کی منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے لفظ کے گرد نیا اساسی دائرہ مرتب کیا اور اسے سیاست آشنا بنا

> دیا''(۱۲)۔

فیضؔ کی نظم نگاری کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

جب بھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

(یاد)

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

(فیض احمد فیض)

ڈاکٹر حنیف کیفی، فیض کی نظم کے حوالے سے ''اردو نظم معرا اور آزاد نظم'' میں لکھتے ہیں:

> ''فیض کی تکنیک یہ ہے کہ کسی ایک ترتیب قوافی کی پابندی نہیں کرتے اور اس کے استعمال میں تنوع پیدا کرتے رہتے ہیں بیچ بیچ میں دو ایک معرا مصرعے بھی شامل کرتے جاتے ہیں۔ صرف دو ایک مصرعے ہی غیر مقفٰی ہوتے ہیں باقی تمام مصرعے کسی نہ کسی ترتیب قوافی

کے تحت مقفیٰ ہوتے ہیں'' (۱۳)۔

علی سردار جعفری اشتراکیت پسند شاعر تھے انھوں نے مارکسی فلسفے کو نیا شعور عطا کیا۔ جاں نثار اختر نے غربت وامارت کے درمیان پائے جانے والے امتیاز کو اپنی شاعری میں بیان کیا جب کہ ساحر لدھیانوی کی شاعری میں مزدور کا ذکر ملتا ہے۔ظہیر کاشمیری کی شاعری رومان سے ترقی پسندی کی طرف ایک سفر کرتی ہے اور ان کے کلام میں رجائیت کا عنصر نمایاں ہے۔انھوں نے نظم کو تاریخ اور فلسفے کا شعور اور فکری توانائی بخشی ہے، ان کی شاعری میں انقلاب جھلکتا ہے۔ترقی پسند شاعری میں احمد ندیم قاسمی کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند شاعری میں ندیم نے دشمن کا تصور شعوری سطح پر پیدا کیا اور ندرت کی شمشیر جگر دار کو حصول مقصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ندیم کی شاعری کا یہ پہلو انھیں دوسرے ترقی پسند شعرا سے ممیّز و ممتاز کرتا ہے'' (۱۴)۔

عارف عبدالمتین کے ہاں زندگی کے خارجی پہلوؤں کو موضوع اور تخاطب کا انداز نمایاں ہے۔انھوں نے شاعری کے ذریعے احتجاج کرنے کی روایت ڈالی اور مزدور و محنت کش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔اس دور میں پابند نظم کی اصناف میں مسدس، مخمس اور مربع کی ہیئت کو زیادہ استعمال کیا گیا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں جدید نظم میں ایک اور روایت نے جنم لیا۔نظم نگار شعرا نے قافیہ اور ردیف سے آزادی حاصل کرنے کی روش اختیار کر لی اور آزاد شاعری کا

آغاز کر دیا۔یہ نظم دو دھاروں میں منقسم نظر آتی ہے۔ایک دھارا آزاد نظم کا تھا جس کے ارتقا میں تصدق حسین خالد، عطااللہ سجاد، میرا جی، ن۔م۔راشد، مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، ظہور نظر، فیض احمد فیض، ضیا جالندھری، مختار صدیقی، اختر الایمان جیسے شعرا شامل تھے۔اُردو نظم کا دوسرا دھارا پابند نظم کا ہے جس کو دوام بخشنے میں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، خلیل الرحمان اعظمی، مخدوم محی الدین، شور علیگ، مصطفیٰ زیدی، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، جعفر طاہر، اختر انصاری اور دیگر شعرا شامل ہیں۔آزاد اور پابند نظم کے دھارے رفتہ رفتہ آپس میں مل گئے اور اس طرح آزاد نظم کو فروغ ملنے لگا۔ڈاکٹر حنیف کیفی ''اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم'' میں ن۔م۔راشد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''آزاد نظم کو راشد کے ہاتھوں جو مقبولیت نصیب ہوئی یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اردو میں اس کے بانی مبانی تصور کیے جانے لگے۔یہی نہیں بلکہ اتنی تیز رفتاری کے ساتھ آزاد نظم کا نام راشدؔ کے ساتھ وابستہ ہوگیا کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں کا تصور ناممکن ہوگیا'' (۱۵)

ن۔م۔راشد کی ایک معرا نظم ''میں اسے واقف الفت نہ کروں'' کا نمونہ ملاحظہ کریں:

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اس کو شناسائے محبت نہ کروں

روح کو اس کی اسیر غم الفت نہ کروں
اس کو رسوا نہ کروں، وقف مصیبت نہ کروں
سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی

(ن۔م۔راشد)

ن۔م۔راشد کے علاوہ تصدق حسین خالد، الطاف گوہر، اختر ہوشیار پوری اور حسیب الرحمٰن نے قیام پاکستان کے بعد نظم نگاری کو جاری رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد منیر نیازی اور ساقی فاروقی نے آزاد نظم نگاری کی۔ جدید اُردو نظم کے حوالے سے بات کریں تو مجید امجد کا نام بھی کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے موضوعات اور ہیئتوں کو ہم آہنگ رکھا ہوا ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں سماجی حالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے مضمون کو زیادہ اہمیّت دی اور نظم کی مروجہ ہیئتوں کو اپنے اسلوب کی منفرد رعنائی سے ایک نیا آہنگ دیا۔ انھوں نے پابند اور آزاد نظم کو باہم مضبوط کرنے کی سعی کی۔ پہلے وہ نظم معرا اور آزاد نظم کو شجر ممنوعہ سمجھتے تھے مگر قیام پاکستان کے بعد وہ آزاد نظم کہنے لگے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''مجید امجد، نے آزادی کے بعد آزاد نظم پر پوری توجہ دی اور اسے نہ صرف خوش اسلوبی سے استعمال کیا بلکہ اعتبارِ فن بھی پیدا کیا۔ تاہم انھوں نے شعری ضروریات کے لیے قافیہ کے خوش آہنگ اور نظر نواز استعمال سے گریز نہیں کیا اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ مجید امجد نے آزاد نظم میں راشد اور میرا جی کے اسلوب کو قبول کرنے کے

بجائے اپنا اسلوب الگ تراشا اور اس پر اپنی ٹکسال کی مہر ثبت کی''(۱۶)۔

مجید امجد کی ایک آزاد نظم دیکھیے:

زندگی اے زندگی
خرقہ پوش و پابہ گِل
میں کھڑا ہوں تیرے در پہ زندگی
ملتجی و مضمحل
خرقہ پوش و پابہ گِل
اے جہان خاروخس کی روشنی
زندگی اے زندگی

(مجید امجد)

اُردو نظم گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد مختلف شعرا سے تخلیق ہوتی رہی اور اس میں بہت سی فنی اور فکری تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں۔ اُردو نظم نے موضوعات اور ہیئتی اعتبار سے عہد بہ عہد ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اُردو نظم نے مختلف تحریکوں کے اثرات قبول کیے لیکن جدیدیت کی تحریک نے اُردو کی صنفِ نظم کو نئے نئے موضوعات اور نئی ہیئتوں سے روشناس کرایا۔ اُردو نظم نے غزل کو پسپا کرنے کے لیے نئے زاویے اختیار کیے مگر غزل کی مقبولیت کسی طور بھی کم نہ ہوئی۔ اُردو نظم کا جو سفر پابند نظم سے شروع ہوا تھا نظم معرا اور آزاد نظم سے ہوتا ہوا نثری نظم تک آن پہنچا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اسلامی ادب کی تحریک بھی ابھر کر سامنے آئی اس تحریک کے زیر اثر جو شاعری تخلیق ہوئی اس میں فنی لوازمات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ ادب صرف

اصلاح معاشرہ کے لیے تھا لیکن اس سے اُردو نظم کافی متاثر ہوئی۔ تحریک ادب اسلامی نے اقبالؔ کے رنگ میں شاعری کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے شعرا کے کلام میں اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ماہر القادری اور نعیم صدیقی تحریک ادب اسلامی کے اہم شاعر شمار ہوتے ہیں۔ ان دونوں شعرا کے کلام میں خطیبانہ انداز پایا جاتا ہے۔ تحریک ادب اسلامی کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''تحریکِ ادب اسلامی میں خطابت کا پُر زور اور گھمبیر لہجہ نمایاں ہے۔ اس تحریک نے تغیان و تحرک پیدا کرنے کے لیے رجز خوانی کا انداز اختیار کیا اور اقبال کے الفاظ، اصوات اور اسالیب کی جامد تقلید کی تاہم وہ تحرک اور جوش جو اقبال کی شاعری کے داخل میں موجزن ہے اس تحریک کے شعرا میں پیدا نہ ہو سکا'' (۱۷)۔

عصر حاضر کے اہم جدید نظم نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، عزیز حامد مدنی، وزیر آغا، منیر نیازی، امجد اسلام امجد، خورشید رضوی، احمد فراز، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، شہزاد احمد، ادا جعفری، انیس ناگی، تبسم کاشمیری، انور مسعود، جیلانی کامران، محسن نقوی، افتخار عارف، جمیل ملک، شبنم شکیل، سرمد صہبائی، سعد اللہ شاہ، فرحت عباس شاہ، شہزاد نیئر، سرور ارمان، فیصل عجمی، سہیل احمد، رئیس فروغ، رؤف میر، اقبال کوثر، سلیم کوثر، قمر جمیل، سارہ شگفتہ، زہرہ نگار، پروین فنا سید، شائستہ حبیب، محمد اظہار الحق، نسرین انجم بھٹی، سجاد مرزا، ناہید قاسمی، علی محمد فرشی، منصورہ احمد، شاہین مفتی، مصطفیٰ زیدی، جواز جعفری، عباس اطہر، ثروت حسین، افضال احمد، مبارک احمد اہم شاعر ہیں۔

جدید اُردو نظم کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی اُردو نظم کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی اس صدی میں کئی تحریکیں اور رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اُردو نظم کو مقبول صنفِ سخن بنانے میں بیسویں صدی کے شعرا کا حصّہ قابلِ ستائش ہے۔ اُردو نظم کی روایت کے تجزیے کے بعد اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ اُردو نظم نے سیاسی، سماجی وثقافتی تبدیلیوں کو قبول کیا ہے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اس کے رجحانات و رویے بھی بدل گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اُردو ادب میں نظم نے خوب ترقی کی۔ اس روایت کو اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے نظم نگاروں نے کافی گہرا کیا ہے۔ ان نظم گو شعرا میں عباس تابش کا شمار بھی ہوتا ہے۔

(ب)

عباس تابش کی اُردو نظم کا فکری وفنی (موضوعاتی واسلوبیاتی) جائزہ

اُردو ادب کی یہ روایت رہی ہے کہ مختلف شعرا نے ایک سے زائد اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاعر جس نے صرف ایک ہی صنف میں مقبولیت حاصل کی ہو اُس کے ساتھ یہ مسئلہ رہا ہے کہ اُس کی دیگر اصناف کو نظر انداز کر کے اُس کا مقام ومرتبہ صرف اسی ایک صنف میں متعین کیا جاتا ہے جس میں وہ مقبول ٹھہرا ہو۔ ناقدین شعروادب اُس شاعر کی دیگر اصناف کو اُس کی شاعری کا کمزور اور غیر معیاری حصّہ سمجھ کر اہمیّت نہیں دیتے۔ عباس تابش عہدِ حاضر کے ایک بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ وہ بنیادی طور پر تو غزل کے شاعر ہیں مگر انھوں نے اپنے ابتدائی شعری مجموعوں (تمہید، آسمان) میں نظمیں بھی شامل کی ہیں۔ اُن کی نظمیں اُن کی غزلوں کی طرح قبولیتِ عام تو حاصل نہ کر سکیں لیکن فنی و فکری حوالے سے اہمیّت کی حامل ہیں۔ عباس تابش کی نظمیں اس لیے نظر انداز کر دی گئی ہیں کہ یہ کم تعداد میں ہیں اور اُردو ادب میں اُن کی شناخت بطور غزل گو ہے۔

اُردو نظم کے فنی وفکری جائزے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غزل کی طرح نظم بھی اپنے عہد کے سیاسی، سماجی وثقافتی پہلوؤں کی عکاسی وترجمانی کرتی ہے۔ مغرب کے زیر اثر تخلیق ہونے والی شاعری نے اُردو نظم کے کینوس کو پھیلا دیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں عباس تابش کی نظم نگاری کا فنی وفکری دونوں لحاظ سے جائزہ لیا گیا ہے۔ فن اور فکر کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی سمجھا جا سکتا ہے، اس لیے اُن کی

نظموں کا موضوعاتی واسلوبیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔

عباس تابش کے پہلے دو شعری مجموعوں (تمہید، آسمان) میں کل ۲۵ نظمیں ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم کی ہیئت کو اختیار کیا ہے، اُن کی تمام نظمیں آزاد ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ عباس تابش کی نظم کا سفر روایت سے جڑا ہوا ہے۔ اُن کی نظموں میں داخلیت اور خارجیت دونوں طرح کے عناصر پائے جاتے ہیں کیوں کہ انسان کے خارجی حالات اُس کے داخلی زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس لیے عباس تابش کی نظموں میں داخلیت کے پہلو خارجیت کی نسبت زیادہ نمایاں ہیں۔ عباس تابش نے صرف ایک ہی ہیئت میں نظم نگاری کرتے ہوئے صرف آزاد نظم کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اُن کی نظموں کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف موضوعات سامنے آتے ہیں۔

عباس تابش کی نظمیں فنی حوالے سے مکمل ہیں اور ان میں تخلیقی بلندیوں، ذاتی و داخلی واردات اور تجربات کا رنگ و آہنگ پایا جاتا ہے۔ عباس تابش کے فکری کینوس پر زندگی اور اس کے متعلّق دیگر عناصر کی نشان دہی ملتی ہے۔ اُن کی نظموں میں جذبات، آرزو اور نارسائی کے پہلو موجود ہیں۔ اُن کی نظموں میں انسان کے جذباتی رشتوں اور ان سے محبت کے رنگ نمایاں ملتے ہیں۔ عباس تابش نے منفرد انداز میں نظم نگاری کی ہے۔

عباس تابش ۸۰ء کی دہائی کے ایک اہم شاعر ہیں، اُن کی نظموں میں لا حاصلی، بے ساختگی اور انسان کے وجودی معاملات کے حوالے سے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ اُن کی نظمیں اُن کے عہد کی عکاس ہیں اور ان میں ایک خاص قسم کی شاعری مخفی ہے۔ عباس تابش کی نظموں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے واضح نشان ملتے ہیں۔ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے جو ہر چیز پر دسترس رکھتا ہے۔ دنیا کی ہر شے اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ عباس تابش ایک مذہبی انسان ہیں وہ اپنے خدا کی عظمت و بزرگی بیان

کرتے ہیں۔ان کے پہلے شعری مجموعے ''تمہید'' کی ایک حمد یہ نظم ملاحظہ کیجیے:

نہ صدا کا سمت کشاہوں میں
نہ ورق پہ میرا وجود ہے
مرے حرف میں وہ چمک نہیں جو ترے خیال کی چھب میں ہے
مرا انگ کیا مرا ڈھنگ کیا
سرِ خامہ روح کا دود ہے
یہی میرا رازِ شہود ہے
میں شکست خوردہ خیال ہوں مجھے آیتوں کی کمک ملے
مجھے آگہی کی چمک ملے
مجھے درسِ عبرت شوق دے

(حمد یہ،تمہید)

عباس تابش کے اولین شعری مجموعے ''تمہید'' میں شامل یہ حمد یہ نظم بہت ہی خوبصورت انداز میں کہی گئی ہے، یہ ایک آزاد نظم ہے اس میں شاعر اپنے رب کی بارگاہ میں دعائیہ کلمات بھی ادا کرتا ہے اور اُس کی عظمت و برتری بھی تسلیم کرتا ہے۔شاعر اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے جھکا ہوا نظر آتا ہے اور اپنے خالقِ حقیقی سے ڈرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب میری کوئی بساط نہیں کہ تیری عطا کے بغیر میں کوئی لفظ لکھ سکوں ، اے میرے رب تو خالق و مالک ، میں ناچیز ہوں ، میرے پاس ایسے الفاظ نہیں جو تیری توصیف بیان کر سکیں۔میرے الفاظ کا رنگ و آہنگ اور میرا اندازِ سخن کچھ بھی نہیں ۔تو کائنات کو ایک اشارے میں تباہ و برباد کر سکتا ہے، تیرے ہی قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔اس نظم میں عباس تابش نے انسان کی تخلیق کا مقصد بتایا ہے کہ ہمیں اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔انسان کو اللہ

سے ڈرتے رہنا چاہیے اگر اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے تو وہ قہار و جبار بھی ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کو ہر وقت دھیان میں رکھنا چاہیے۔عباس تابش ایک مذہبی آدمی ہیں ، وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے ہیں اور اُس کے بھیجے ہوئے انبیا کرام پر کامل یقین رکھتے ہیں۔

عباس تابش کی شاعری میں رومانیت کا عنصر پایا جاتا ، انھوں نے اپنی اردو نظموں میں محبت اور زندگی کے اداس اور پُرمسرت لمحات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔عباس تابش نے جذبات و احساسات کو نظم کا جامہ پہنا دیا ہے، انھوں نے شاعری میں ملمع کاری ہی نہیں کی بلکہ رومانیت کا احساس اجاگر کیا ہے۔زندگی اور محبت ایک ہی راستے کے مسافر ہیں جو کسی منزل کی جانب رواں نظر آتے ہیں۔عباس تابش نے محبت کے ان راستوں پر سفر کیا ہے اور اس سفر کی تلخیوں کو اپنی شاعری میں بیان کر دیا ہے۔

عباس تابش خواب دیکھتے ہیں اور درختوں و پرندوں کے جھنڈ سے پیار کرتے ہیں۔درخت اُن کی شاعری کا استعارہ خاص ہیں اس لیے وہ پرندوں اور درختوں کو اپنا ہمزاد کہتے ہیں۔غزلوں کی طرح اُن کی نظموں میں درختوں اور پرندوں کا ذکر ہے۔اُن کی نظموں میں ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' ، ''پرندوں اور درختوں کا ہمزاد'' ، ''برگد سے دشمنی کا موسم'' ، ''شجر سے اُتری ہوئی ایک نظم'' شامل ہیں۔عباس تابش کے پہلے شعری مجموعے ''تمہید'' کی ایک نظم ''باغِ جناع''،جس میں انھوں نے خواب دیکھے ہیں، اس نظم میں انھوں نے کمالِ فنی مہارت سے اپنے جذبات و احساسات کو مصرعوں میں سمویا ہے:

کہیں پیڑوں کے جھنڈ ہیں
کہیں پیڑوں کے جھنڈ، جھنڈ میں جھیلوں کی چشمکیں
کہیں چشمِ گلاب خیمہ نکہت فشار ہے
کہیں شاخوں پہ جھولتے ہوئے پھولوں کی تازگی

کسی ہیجان کی طرح مرے سینے پہ بار ہے
ابھی تک انتظار ہے
ابھی تک انتظار ہے
کسی روشن خیال کا، کسی خندہ جمال کا
ابھی تک انتظار ہے

(تمہید)

اس نظم میں عباس تابش نے باغ جناع کا ذکر کیا ہے اس میں درختوں کے جھنڈ ہیں اور ان جھنڈوں میں جھیلوں کی چشمکیں ہیں جو شاعر کو بے حد پسند ہیں۔ عباس تابش نے اس نظم میں فطرت کے مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ قدرتی حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، اس لیے ''باغ جناع'' کے عنوان سے یہ نظم تخلیق کی ہے۔ عباس تابش روایت سے جڑے ہوئے شاعر ہیں اس لیے انھوں نے اپنے ماضی اور اسلاف کے کارناموں کو یاد رکھا ہے۔ اس نظم پر خالد احمد تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے تو پھر جان لیں کہ عباس تابش نے تمہید میں کوئی سوال نہیں اُٹھایا ہے البتہ اس نے کچھ خواب ضرور دیکھے ہیں اور وہ خواب ''باغِ جناع'' میں تجسیم پا گئے ہیں''(۱۸)۔

عباس تابش نے ''تمہید'' میں احمد ندیم قاسمی کے لیے ایک نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے احمد ندیم قاسمی سے زبردست عقیدت و احترام کا اظہار کیا ہے اور ان کو شاعری کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ عباس تابش نے احمد ندیم قاسمی کے لیے دعا کی ہے کی اللہ

پاک شاعری کے اس بادشاہ کو سلامت رکھنا۔ وہ انھیں پیر و مرشد مانتے ہیں۔ اسی لیے عباس تابش نے ایم اے اردو میں ''احمد ندیم قاسمی کی شاعری'' پر مقالہ لکھا۔ اس نظم میں تابش کہتے ہیں کہ اے میرے بادشاہ میرے منھ میں دانہ حرف دے اور اپنی جھٹال دے تا کہ میں بھی تیرے جیسا ہو جاؤں۔ عباس تابش کی یہ بات ہے کہ وہ اپنے سینئرز کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

مرے بادشہ تری خیر ہو
تری شہ نشیں کے جوار میں
مرے دست و لب پہ دعائیں ہیں
تجھے رب حسن حیات دے
ترے حرف تیری مثال ہیں
مرے بادشہ تری خیر ہو!
مرے منہ میں دانہ حرف دے
کہ درِ سخن پہ فقیر کی کوئی پیش چلتی نہیں ابھی
گل دادخواہ کے عہد میں مرے چاک لب ہیں سلے ہوئے
کوئی پھول بھی مرے آئینے میں کھلا نہیں
کوئی مجھ کو مجھ سا ملا نہیں
میں چراغ خفتہ کہ رات میں ترے خوان حرف تک آ گیا
مجھے اپنے منہ کی جھٹال دے
کہیں آشیانہ ذات سے مری طفلگی نہ پھسل پڑے

(تمہید)

عباس تابش نے اپنے پہلے شعری مجموعے ''تمہید'' میں ایسی تمہید باندھی ہے کہ اپنے اساتذہ و سینئرز سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُنھوں نے تمہید کو خالد احمد اور احمد ندیم قاسمی کے نام منسوب کیا ہے۔ اس مجموعے میں احمد ندیم قاسمی کے علاوہ انھوں نے خالد احمد کے لیے بھی ایک نظم لکھی ہے۔ اُن کی ایک نظم ''خالد احمد کے لیے'' ملاحظہ کیجیے:

ہتھیلیوں پہ چراغ لے کر
دراز پلکوں کے سائے سائے
یہ کون شہرِ ہنر میں اُترا
یہ کس نے بابِ سخن پہ تشبیب کا نوشہ سجا دیا ہے
کہ میری یرقان دیدہ آنکھوں میں روشنی اتر رہی ہے
میں اس کو دیکھوں

(تمہید)

عباس تابش، احمد ندیم قاسمی کی طرح خالد احمد کو بھی مرشد تسلیم کرتے ہیں اور ان کی عقیدت میں نظم لکھی ہے اس لیے اُنھوں نے خالد احمد سے اپنی وابستگی کا اظہار کر دیا ہے۔ خالد احمد نے عباس تابش کی بہت رہنمائی کی ہے، اس سلسلے میں عباس تابش ''دنیائے ادب'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''جب میں لاہور آیا تو کسی گروپ میں شمولیت اختیار نہیں کی، البتہ میرا زیادہ تر اٹھنا بیٹھنا خالد احمد کے ساتھ رہا۔ خالد احمد لاہور میں اب ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے طرزِ احساس کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اب بھی جو جدید حسیت ہے اس میں روز بروز

ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے خالد احمد کی گفتگو میری سمت نمائی کرتی ہے، لہٰذا مجھ پر زیادہ اثرات خالد احمد کے ہیں''(۱۹)۔

عباس تابش محبت سے محبت کرنے والے شاعر ہیں، اُن کی نظموں میں محبت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ محبت حقیقی ہو یا مجازی محبت ایک دائمی جذبہ ہے۔ یہ ایک کیفیت و احساسات کا نام ہے جو دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ عباس تابش بھی کسی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی محبُوب ہے جس کے لیے وہ پریشان دکھائی دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی طبیعت سے اداسی نہیں جاتی۔ ان کی نظم ''اسے میں نے نہیں دیکھا'' ملاحظہ کیجیے:

وہ کیسی ہے
اسے میں نے نہیں دیکھا
سنا ہے وہ زمیں زادی
دھنک سے اپنے خوابوں کے اُفق گلرنگ رکھتی ہے
مرے خاشاک سے آگے کسی منظر میں رہتی ہے
ہوا کے گھر میں رہتی ہے
وہ کس سورج کا حصّہ ہے
وہ کس تارے کی مٹی ہے
اسے میں نے نہیں دیکھا

(تمہید)

اس نظم میں عباس تابش اپنے محبُوب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ میں جس سے

محبت کرتا ہوں اُسے میں نے دیکھا نہیں ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا محبُوب تو سورج، چاند، تاروں جیسا ہے۔ میرا محبُوب تو ایک خوشبو کی طرح ہے جو میرے سینے کو معطر کر جاتی ہے۔ میں صرف اس کی مہک محسوس کر سکتا ہوں اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔ میرے دن اور رات اسی کے خیالوں میں گزرتے ہیں۔ جانے وہ کس رنگ کے کپڑے پہنتی ہے کس سوچ میں ڈوبی رہتی ہے۔ وہ ایک آواز کی مانند ہے اور آواز کو کس نے پکڑا ہے اور وہ میرا جسم ہے لیکن میرے پاس نہیں ہے۔ ''ادھوری نظم'' کے عنوان سے لکھی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

اندھیری شام کے ساتھی
ادھوری نظم سے زور آزمائیں
برسرِ کاغذ بچھڑنے کو
مگر میں اک ادھوری نظم کے ہیجان میں کھویا
تمھیں آواز دیتا ہوں
کہ تنہا آدمی تخلیق سے عاری ہوا کرتا ہے
جانِ من!
سنو...... میرے قریب آؤ
کہ مجھ کو آج کی رات اک ادھوری نظم پوری کر کے سونا ہے

(تمہید)

اس نظم میں عباس تابش نے اپنی تنہائی اور ادھورے پن کا ذکر نہایت خوبصورت پیرائے میں کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ اے محبُوب میں تیرے بغیر ایک ادھورا شخص ہوں مجھ کو تخلیق کرتے ہوئے تیری ضرورت پڑتی ہے کیوں کہ تنہا آدمی تخلیق سے عاری ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبُوب میرے قریب آؤ اور میری تنہائی اور ادھورا پن ختم کر

دو کیوں کہ میں نے ایک نظم ادھوری چھوڑ رکھی ہے اسے مکمل کرنا ہے اور اس لیے مجھے تمہاری محبت کی ضرورت ہے اس ادھورے پن کو مکمل کرنے کے بارے میں وصی شاہ کا ایک شعر مجھے یاد آ رہا ہے:

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

ہر عاشق کو اپنے محبُوب کے وصال کی خواہش ہوتی ہے وہ اسے ملنے کے لیے دن رات تڑپتا ہے کہ کہیں سے اسے اس کا محبُوب ملنے کو آ جائے مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔ عباس تابش کو بھی اپنے محبُوب کے وصال کا ایک اندیشہ سار ہتا ہے کہ شاید اُس کا محبُوب کبھی مہربان ہو کر اس سے ملنے کو چلا آئے، اس لیے وہ ''اندیشۂ وصال کی ایک نظم'' لکھتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

شفق کے پھول تھالی میں سجائے سانولی آئی
چراغوں نے لویں کھینچیں دریچوں میں نمی آئی
میں سمجھا اُس سے ملنے کی گھڑی آئی
یہ منظر منجمد ہو کر سفر آغاز کرتا ہے
لہو کی برق رفتاری طنابیں کھینچ لیتی ہے
یہ کیسی شام شہزادی
شفق کے پھول تھالی میں سجائے زینۂ شب سے اتر آئی
میں سمجھا اس سے ملنے کی گھڑی آئی

(تمہید)

عباس تابش نے اپنی نظموں میں داخلی احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

انھوں نے اپنے محبُوب کی تعریف بھی کی ہے، اُنھوں نے اس نظم میں ایک لڑکی کا ذکر کیا ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں دیکھتی ہے اور ان میں اپنا مقدر تلاش کرتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ اس کے ہاتھ برے ہیں اس لیے وہ بدقسمت ٹھہری ہے۔ وہ پورے جسم سے کٹ کر فقط اپنے ہاتھوں میں زندہ ہے نظم ''وہ ہنستی ہے تو اس کے ہاتھ روتے ہیں'' کے مصرعے ملاحظہ کیجیے:

کسی کے بعد
اپنے ہاتھوں کی بدصورتی میں کھوگئی ہے وہ
مجھے کہتی ہے ''تابش! تم نے دیکھا میرے ہاتھوں کو
برے ہیں ناں؟
اگر یہ خوبصورت تھے تو ان میں کوئی بوسہ کیوں نہیں ٹھہرا''
عجب لڑکی ہے
پورے جسم سے کٹ کر فقط ہاتھوں میں زندہ ہے

(آسمان)

عباس تابش روایت سے جڑے ہوئے جدید لہجے کے شاعر ہیں وہ اپنے ماضی کے دنوں کو اکثر یاد کرتے ہیں۔ ان کی ''تیئسویں سالگرہ پر ایک نظم'' ملاحظہ کیجیے:

موم بتی بجھی
تو شہ قند میں ایک میٹھی چھری چال چلنے لگی
شام ڈھلنے لگی
میرے چوگرد پھیلے ہوئے سرمئی سحر میں
ننھے ہاتھوں سے جھڑتی ہوئی تالیاں دیکھ کر
میرے پچھلے برس کی ہوا چل پڑی

(تمہید)

عباس تابش کی شاعری میں میؔر، غالبؔ، یگانؔہ، فیضؔ، ندیؔم، خالد احمد اور مرتضیٰ برلاس جیسے بڑے شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے شاعری میں خوب ریاضت کی ہے اور اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے وہ انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ بقول عباس تابش:

> ''دو سال تک محض اساتذہ کا مطالعہ اور شاعری کی ریاضت کرتا رہا اسی دوران خالد احمد نے میری رہنمائی کی''(۲۰)۔

اس وجہ سے عباس تابش کی غزلوں اور نظموں میں اساتذہ کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے فیض احمد فیض کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور اسے ادب کے لیے بڑا نقصان قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ فیضؔ جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ابھی اُس کی ضرورت تھی، وہ کہتے ہیں کہ برا ہو موت کا جس نے میرے فریادرس کی جان لے لی۔ عباس تابش نے فیضؔ کے انتقال پر لکھی ایک نظم ''ابھی اُس کی ضرورت تھی'' ملاحظہ کیجیے:

صفِ ماتم بچھی ہے
سخن کا آخری در بند ہونے کی خبر نے
کھڑکیوں کے پار بیٹھے غمگساروں کو
یہ کیسی چپ لگا دی ہے
یہ کس کی ناگہانی موت پر سرگوشیوں کی آگ روشن ہے

(تمہید)

عباس تابش کہتے ہیں کہ سب سے پرخلوص رشتہ ماں کا ہے۔ ماں کی محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی محبت نہیں ہے۔ ماں بچے کے لیے ساری رات جاگ کر گزار دیتی ہے۔ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ عباس تابش کو بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی ماں سے بے حد محبت ہے۔ وہ غزل اور نظم میں اپنی ماں کو بہت یاد کرتے ہیں۔ عباس تابش کی درج ذیل نظم ''واپسی'' ملاحظہ کیجیے:

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے

کہ جب سرسوں کی گندل تھا بدن میرا

ہوا مجھ کو کھلاتی تھی

مجھے چرخے کی گھوکر ہی سے گہری نیند آتی تھی

دہن میں شیرِ مادر کی مہک کے آخری دن تھے

جوانی جھلملاتی تھی

مری آنکھیں، مرے ہاتھوں، میرے پیروں میں بوسے تھے

مری ماں مسکراتی تھی

(آسمان)

عباس تابش کہتے ہیں کہ ایک بات مجھے واپس لے جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے بچپن کے دنوں کی یاد تازہ کی ہے وہ اپنے ماضی میں جاتے ہیں، عباس تابش جدید لہجے کے رومانوی شاعر ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے بچپن کے زمانے کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ نوجوان تھا اور اس نے خود کو سرسوں کی گندل سے تشبیہ دی ہے۔ عباس تابش کی ایک اور نظم ''کھوئی ہوئی نظم کی یاد میں'' ملاحظہ کیجیے:

کبھی بچپن میں

بھیگی ریت سے میں نے

بنایا تھا گھروندا اور پہلی نظم لکھی تھی

سنانا چاہتا تھا میں تمھیں شاید......

مگر شاید......

یہ بچپن کتنے برسوں بعد آیا ہے

اگر بارش بھی آجائے

میں بھیگی ریت پر ایک نظم لکھوں

جو کہ تم ہو

اور میں بھی ہوں

(آسمان)

عباس تابش کی یہ خصوصیّت ہے کہ اُن کے ہاں ماضی، بچپن، اساتذہ، دوست احباب اور جی سی کالج جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ عباس تابش ایک دن پاک ٹی ہاؤس لاہور میں بیٹھے تھے کہ اُنھیں اپنے ایک دوست شاعر قمر بشیر کی حادثاتی موت کی خبر ملی۔ عباس تابش کو اُس کا انتظار تھا اور اس کے انتظار کی بے یقینی سے یہ نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں مکالمے کا انداز ملتا ہے۔ اُس وقت اُن کے دوست عدنان بیگ بھی ان کے ساتھ موجود تھے نظم ''قمر بشیر کا نوحہ'' ملاحظہ کیجیے:

زندگی میں بھی وہ موت کی طرح بے باک تھا

جب مری بات اچھی نہ لگتی اسے

مجھ سے کہتا ''مرے سامنے جھوٹ بولو نہیں''

یار عدنان! وہ کس طرح مر گیا

حادثے کی خبر اہلِ کنعان ہی لے کے آئے نہ ہوں
کس طرح مان لوں

(آسمان)

عباس تابش کی نظم نگاری کا تجزیہ کریں تو یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات میں نظمیں لکھی ہیں اور ہر موضوع کو کمال فنی مہارت سے بیان کیا ہے۔ عباس تابش کی غزلوں کی طرح اُن کی نظمیں بھی ایک خاص رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں آبشار کی مانند ہیں جو لہروں کی صورت بہتی اور گنگناتی جا رہی ہیں۔ عباس تابش کی نظموں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اُن کی نظموں میں اُن کے دکھوں کی ہلکی سی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اُن کی نظموں میں دکھ بولتے نظر آتے ہیں عباس تابش کی غزلوں کی طرح ان کی نظمیں بھی محبتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ وہ نظموں میں اپنے قلبی جذبات و احساسات نہایت خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔

عباس تابش نے آزاد نظم کے ایک ایک مصرعے میں دلی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں اثر پذیری کا پہلو نمایاں ہے۔ عباس تابش کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات میرے سامنے کھلتی ہے کہ وہ غزل کی طرح نظم کہنے کا ہنر و رموز بخوبی جانتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں وہ تمام تر فنی و فکری خوبیاں موجود ہیں جو اُن کے ہم عصر شعرا میں پائی جاتی ہیں۔

(ج) معاصر اُردو نظم میں عباس تابشؔ کا مقام و مرتبہ

اُردو شاعری میں مقام و مرتبہ کی بات کریں تو فیض احمد فیضؔ ایسے شاعر ہیں جنھوں نے محض ۸۰ غزلیں کہہ کر خود کو ایک اہم غزل گو شاعر منوایا ہے۔ اس لیے کسی صنفِ سخن میں کم یا زیادہ طبع آزمائی کے لحاظ سے کسی شاعر کا مقام و مرتبہ متعین کرنا مناسب نہیں۔ کم گوئی سے بھی مقام و مرتبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ معیار ایک الگ چیز ہے اور غزلوں اور نظموں کی تعداد ایک الگ پہلو ہے۔ عباس تابش کی غزل گوئی کے حوالے سے بات کریں تو یہ معاصر اردو غزل کی نمائندہ غزل ہے اور اگر اُن کی نظم نگاری کا تجزیہ کریں تو یہ بھی معاصر اُردو نظم میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ تابشؔ نے (تمہید، آسمان) میں محض ۲۵ نظمیں تخلیق کر کے خود کو ایک نظم نگار شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

عباس تابش نے جدید اُردو نظم کے تمام تر رجحانات و میلانات کو سامنے رکھ کر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ عہدِ حاضر میں تخلیق ہونے والی نظم اُن کے دھیان میں رہتی ہے۔ اس لیے اُنھوں نے آزاد نظم کا تمام تر معیار برقرار رکھا ہے۔ عباس تابش کی نظمیہ شاعری بھی اُن کی غزل کی طرح معاصرین میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اُنھوں نے نظمیں کم کہی ہیں لیکن معیاری شاعری تخلیق کی ہے۔

معاصر اُردو نظم کی بات کریں تو پروین شاکر نے آزاد نظم کی ہیئت کو خوب استعمال کیا ہے ان کی نظمیں بڑی عمدہ ہیں۔ اسی طرح عباس تابش نے بھی آزاد نظم کی ہیئت کو چنا

ہے اور اس میں نظمیں لکھی ہیں۔ پروین شاکر کی ایک نظم ''ساتھ'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

کتنی دیر تک

املتاس کے پیڑ کے نیچے

بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں

کچھ یاد نہیں

بس اتنا اندازہ ہے

چاند ہماری پشت سے ہو کر

آنکھوں تک پہنچا تھا

(پروین شاکر)

پروین شاکر اُردو ادب کی ایک ممتاز شاعرہ تھیں اُن کو غزل و نظم دونوں پر کمال دسترس حاصل تھی۔ اُنھوں نے آزاد نظم کی ہیئت میں اچھی نظمیں کہی ہیں اُن کا مقبول عام شعری مجموعہ ''خوشبو'' غزلوں اور نظموں کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اس نظم ''ساتھ'' میں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے گزارے ہوئے لمحات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ املتاس کے پیڑ کے نیچے چاندنی رات کے پرسکون و پرنور لمحات میں ہم گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ چاند ہماری پشت سے سفر کرتا ہوا ہمارے سامنے آ جایا کرتا تھا۔ اس نظم میں پروین شاکر نے اپنے ماضی کے دنوں کا ذکر کیا ہے۔ عباس تابش کی نظم نگاری معاصر شعرا میں منفرد ہے اُن کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

کیا تجھے یاد ہے

تو نے مجھ سے کہا تھا

محبت فقط لفظ ہے اس کے معنی نہیں

کیا تجھے یاد ہے

میں کہ تیرے لیے کچھ نہ تھا

(محبت فقط لفظ ہے، آسمان)

عباس تابش نے اس نظم میں ماضی کے لمحات کی یاد کو تازہ کیا ہے۔ وہ اپنے محبُوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی بات یاد ہے کہ تم نے مجھے کہا تھا کہ محبت کے کوئی معنی نہیں ہیں اور محبت صرف ایک لفظ ہے۔ میں تیرے لیے کچھ نہ تھا لیکن میں تمہارے ساتھ دن گزارتا رہا اور تمہارے خواب سنتا رہا۔ اب بھی تیری کوکھ اور آنکھ خالی ہے، محبت کا مطلب بیٹا تھا جو تجھے نہ مل سکا۔ عباس تابش کی نظمیں اتنی حیثیت رکھتی ہیں کہ انھیں معاصر نظم میں اہمیّت دی جاسکتی ہے۔ محسن نقوی بھی عباس تابش کے ہم عصر تھے، انھوں نے غزل و نظم دونوں میں مقبولیت حاصل کی اور ایک اچھے شاعر ثابت ہوئے۔ محسن نقوی کی ایک نظم ''آج بھی شام اداس رہی'' کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

آج بھی تپتی دھوپ کا صحرا

تیرے نرم لبوں کی شبنم

سائے سے محروم رہا

آج بھی پتھر ہجر کا

صدیوں سے بے خواب رتوں کی

آنکھوں کا مقسوم رہا......

موت کی یہ گم صم تنہائی

آج بھی میرے پاس رہی

آج بھی شام اداس رہی

(محسن نقوی)

محسن نقوی کی اس نظم میں اداسی وتنہائی کا ذکر ملتا ہے اور وہ روز کسی کے انتظار میں رہتے ہیں لیکن ہر گزشتہ دن کی طرح اُن کی شام اداس ہی رہتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں منتظر ہی رہا لیکن مجھ سے آج بھی ملنے کوئی نہیں آیا۔ میری امید ٹوٹ گئی ہے اور آج بھی دھوپ کا صحرا سائے سے محروم رہا۔ اسی طرح عباس تابش نے بھی نظم نگاری کی ہے اور معاصرین میں ایک الگ مقام بنایا ہے۔ اُن کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

اداسی تیرا دل ہوتی
تو پھر میں اس میں گھر کرتا
کوئی دن یوں بسر کرتا
اداسی تیرے لب ہوتی
تو بڑھ کر چوم لیتا میں
ان کو اپنی تلخی کی خبر کرتا
کوئی دن یوں بسر کرتا

(اداسی کی بے معنویت پر ایک نظم، آسمان)

عباس تابش بڑے اداس لہجے کے شاعر ہیں، وہ بیٹھے ہوں تو اداسی آس پاس پھیل جاتی ہے اور اگر وہ سخن کریں تو اداسی ملکی سرحدوں سے باہر تک جاتی ہے۔ نہ جانے انھیں کیا غم ملا ہے کہ وہ اداسی کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔ اس نظم میں اُنھوں نے اپنی تنہائی کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ یہ تنہائی کا عالم اور میری اداسی کاش ختم ہو جائے۔ وہ اپنے محبُوب سے کہتے ہیں کہ اے میرے محبُوب اگر یہ میری اداسی تیرا دل ہوتی تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں ایک گھر بنا کر قیام پذیر ہو جاتا اور اپنی زندگی کے روز وشب آسانی

کے ساتھ گزار لیتا۔ اور اگر یہ اداسی تمہارے ہونٹ ہوتی تو میں تمہارے ہونٹ چوم کر تمہیں تلخیِ حیات کی خبر کرتا اور اس طرح کوئی دن بسر کرتا۔ اس نظم میں عباس تابش نے قافیہ استعمال کر کے صوتیاتی آہنگ پیدا کر دیا ہے۔ جس سے نظم میں حسن وغنائیت پیدا ہو گئی ہے۔ معاصر اُردو نظم میں عباس تابش کی نظموں کا جائزہ لیں تو تابش ایک اچھے شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم ''پتھر'' ملاحظہ کیجیے:

ریت سے بت نہ بنا، اے میرے اچھے فنکار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لا دوں
میں ترے سامنے انبار لگا دوں لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا......
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے......
ایک انصاف کا پتھر بھی ہوتا ہے مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے

(احمد ندیم قاسمی)

اس نظم میں احمد ندیم قاسمی نے معاشرتی رویوں اور انسان کی بے حسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دور میں دل، ہاتھ اور زبان سب پتھر کے ہو گئے ہیں یہ دنیا مادہ پرست اور بے دل ہو گئی ہے۔ اس لیے اس کے سب معیار پتھر کے ہیں۔ مجید امجد، احمد ندیم قاسمی اور ظفر اقبال، عباس تابش کے پیش رو ثابت ہوئے عباس تابش نے اسی لیے احمد ندیم قاسمی کے لیے ایک نظم لکھی ہے جس میں انھوں نے ندیمؔ سے اپنی جھٹال دینے کا ذکر کیا ہے تاکہ وہ بھی ندیمؔ کی طرح ہو جائیں۔ اُنھوں نے ایک نظم خالد احمد کے لیے بھی لکھی ہے۔

جس میں انھوں نے خالد احمد کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

عباس تابش چوں کہ روایت سے جڑے ہوئے جدید دور کے شاعر ہیں، اس لیے اُنھوں نے اساتذہ اور سینئرز کا مطالعہ اور شاعری کی خوب ریاضت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عباس تابش کا شمار صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جیسا آئیڈیل ہوگا ویسا ہی تخلیق کار بنے گا۔ عباس تابش کی نظموں میں رومانوی پہلو بھی پائے جاتے ہیں۔ اُن کی ایک نظم ''کھوئی ہوئی نظم کی یاد میں'' ملاحظہ کیجیے:

کبھی بچپن میں
بھیگی ریت سے میں نے
بنایا تھا گھروندا اور پہلی نظم لکھی تھی
سنانا چاہتا تھا میں تمھیں شاید......
مگر شاید......
اب آئے ہو
کہ جب وہ نظم اور شاعر......
جہاں بھی ہوں
کسی کو مل نہیں سکتے
گزرتا وقت، پانی اور نظمیں ایک ہی منزل کو
جاتے ہیں

(کھوئی ہوئی نظم کی یاد میں، آسمان)

عباس تابش نے اس نظم میں زمانۂ ماضی کی بات دہرائی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں بہت دیر تک بھیگی ریت پر گھروندے بنایا کرتا تھا اور تم بھی میرے ساتھ ہوتے تھے اور میں

نے اس وقت بھیگی ریت پر پہلی نظم لکھی تھی مگر اب کہ وہ بچپن ہے نہ وہ بھیگی ریت اور نہ تم ہو۔ اب میں ہوں، میری تنہائی ہے اور اداسی ہے، کوئی نظم نہیں ہو رہی کیوں کہ پانی اور نظم ایک ہی دھارے میں بہتے ہیں۔ تم آؤ تو کوئی نظم لکھ دوں۔ عباس تابش کی نظمیں روایت سے جڑی ہوئی جدید لہجے کی حامل ہیں۔ اُنھوں نے معاصرین میں اہم مقام بنایا ہے۔ عباس تابش محبت اور شاعری میں روایت پسند ہیں مگر وہ روایت میں جدت پیدا کرنے کے خواہاں ہیں۔ وہ محبت سے محبت کرتے ہیں مگر کی ہوئی محبت کے قائل نہیں ہیں۔ ''آسمان'' کے دیباچے میں عباس تابش رقمطراز ہیں:

> ''میرے نزدیک شاعری خودرو پودا نہیں ہے۔ کیا تم نے کوئی ایسا پودا دیکھا ہے جو قدآور ہو اور کوئی قابلِ ذکر پھل بھی دیتا ہو۔ پھل دار درخت زیادہ تر پیوند کے محتاج ہوتے ہیں پھلوں کی مٹھاس میں اضافے کے لیے پیوند کاری کی جاتی ہے میں شاعری میں اسی کا قائل ہوں۔ جب میں پیوند لگا رہا تھا لوگوں نے مجھ پر روایتی ہونے کا الزام لگایا لیکن جب پھل آنے لگا تو وہی لوگ اپنی رائے بدلتے ہوئے نظر آئے''(۲۱)۔

اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ عباس تابش معاصرین میں اہم مقام رکھتے ہیں کیوں کہ وہ روایت پر نظر رکھتے ہوئے اور عہدِ حاضر میں رہتے ہوئے شاعری کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں معاصرین میں منفرد مقام حاصل ہے۔ عباس تابش کے معاصر اُردو نظم گو شعرا میں احمد فراز، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، محسن نقوی، افتخار عارف، فیصل عجمی، شہزاد نیئر،

سرور ارمان، فرحت عباس شاہ، سعد اللہ شاہ اور حسن عباسی زیادہ اہم ہیں۔ امجد اسلام امجد کی نظم ''ایک لڑکی'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالج کی سیڑھیوں سے
سہیلیوں کو لیے اُترتی
تو ایسے لگتا کہ جیسے دل میں اُتر رہی ہو
کچھ اس تیقن سے بات کرتی
کہ جیسے دنیا اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے

(امجد اسلام امجد)

امجد اسلام امجد اُردو نظم کے ایک بڑے شاعر ہیں، ان کی شاعری میں رومانوی انداز پایا جاتا ہے۔ وہ قدرتی حسن و جمال کو بھی عورت کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ اس نظم میں اُنھوں نے ایک لڑکی اور کالج کے زمانے کی خوبصورت پیرائے میں تصویر کشی کی ہے۔ اس لیے وہ ماضی کی باتوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔ اس نظم کو پڑھ کر قاری کو بھی اپنا زمانہ طالب علمی یاد آنے لگتا ہے۔ عباس تابش کی نظموں میں معاصرین سے انفرادیت پائی جاتی ہے ایک نظم ''واپسی'' ملاحظہ کیجیے:

یہ بارہ سال پہلے کی کہانی ہے
میں ہاتھوں سے گرا حرفِ دعا بن کر
مگر بوسوں بھری شفقت تسلی ڈھونڈ لاتی تھی
یہ بارہ روز پہلے کی کہانی ہے

مجھے گاڑی نے اسٹیشن پہ لا پھینکا تھا
تو میرا شہر ہی گم تھا
مری پہچان ہی گم تھی

(واپسی، آسمان)

عباس تابش کی نظموں کی انفرادیت یہ ہے کہ ان میں کسی نہ کسی طرح سے ماضی کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اس نظم میں میلسی سے لاہور آنے کا حال بیان کرتے ہیں۔ عباس تابش نے بہت سفر کیا ہے اس لیے اُن کی شاعری میں بے گھری و نقل مکانی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ معاصر اردو نظم میں عباس تابش کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لیے احمد فراز کی ایک نظم ''واپسی'' ملاحظہ کیجیے:

اُس نے کہا
سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبُوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ

(احمد فراز)

اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبُوب تم جاؤ اور تمہارا دل جو چاہے کرو مگر جب زمانے کی بے مروتی سے بیزار ہو جاؤ تب لوٹ آنا میرا در تمہارے لیے ہر وقت کھلا ہے۔ عباس تابش کی نظم نگاری اور ہنر آفرینی کے حوالے سے خالد احمد، تمہید کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

''تمہید، غزل پرستوں کے لیے ایک تازہ تر برگ سبز کا درجہ رکھتا ہے تو نظم پرستوں کے لیے مستقبل کی دھند کے پیچھے ایک جھلمل شہر کے بس چکنے کی نوید ہے۔ تمہید کے پہلے مطالعے نے مجھے ایک آوارہ بادل کے سنہری کناروں کی یاد دلائی۔ اس آوارہ بادل کے پیچھے روشن سورج کی نورانی تپش کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جو ایک بار پلٹ کر یہ دیکھنا پسند کر سکیں گے کہ جب وہ ۲۵ برس کے تھے تو ان کے دامن میں کیا تھا'' (۲۲)۔

ایک نظم ''اس کے لیے پہلی نظم'' ملاحظہ کیجیے:

وہ اک نازک سی مورت

لاڈلی سی، لااُبالی سی

بہت سادہ مگر دلکش، بناوٹ اوڑھ کر اک غیر ارادی

بھولپن سے بند کلیوں کی طرح جب مسکراتی ہے

تو پت جھڑ میں بہاروں کا زمانہ لوٹ آتا ہے

(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

اس نظم میں شاعر نے اپنے قلبی جذبات و احساسات کو بیان کیا ہے۔ وہ ایک نازک سی مورت کے لیے نظم لکھتے ہیں، شاعر اس نظم میں اپنے محبُوب کا سراپا بیان کرتا ہے،

اسلم انصاری کی یہ نظم ''محبت کے دنوں کی یاد میں ایک نظم'' ملاحظہ کیجیے:

بہت مدت ہوئی

جب میری آنکھیں خواب بنتی تھیں

وہ اک ہجراں زدہ عہدِ بہاراں تھا

مجھے پھولوں بھری راہیں بلاتی تھیں

مگر میں اک نوکِ خار کی گہری چبھن کو

حاصلِ ہستی سمجھتا تھا

(اسلم انصاری)

اسلم انصاری اس نظم میں گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں اپنی محبت کو یاد کرتے ہیں۔ وہ اس نظم میں اپنے محبُوب کی سنگدلی اور بے مروتی کا ذکر کرتے ہیں۔ عبیداللہ علیم کی ایک نظم ''چاند چہرہ ستارہ آنکھیں ملاحظہ کیجیے:

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

یہ میرا چہرہ، یہ میری آنکھیں

بجھے ہوئے سے چراغ جیسے

جو پھر سے جلنے کے منتظر ہوں

وہ چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

وہ مہرباں سایہ دار زلفیں

جنہوں نے پیماں کیے تھے مجھ سے

(عبیداللہ علیم)

عباس تابش کی ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

وہ کیسی ہے

اسے میں نے نہیں دیکھا

سنا ہے وہ زمیں زادی

دھنک سے اپنے خوابوں کے اُفق گلرنگ رکھتی ہے
مرے خاشاک سے آگے کسی منظر میں رہتی ہے
ہوا کے گھر میں رہتی ہے

(اسے میں نے نہیں دیکھا، تمہید)

اس نظم میں عباس تابش کہتے ہیں کہ ایک لڑکی ایسی بھی ہے جسے میں نے دیکھا نہیں ہے۔ وہ کیسی ہے، کس رنگ کے کپڑے پہنتی ہے مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے۔ نہ اُس نے مجھے دیکھا ہے اور نہ ہی میں نے اُس کو دیکھا ہے۔ وہ میرا جسم ہو کر بھی مجھ سے دور ہے۔ عباس تابش کے معاصر اردو نظم کے شعرا میں خالد شریف ایک اہم شاعر ہیں، وہ غزل و نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ خالد شریف کی ایک نظم ''کزن'' ملاحظہ کیجیے:

آج احساس ہوا ہے مجھ کو
تم نے سر پاؤں پر رکھ کے میرے
بھیک مانگی تھی رفاقت کی
میں نے کچھ بننے کی دھن میں اس وقت
تم کو ترٹپایا تھا، ٹھکرایا تھا

(خالد شریف)

ہمارے معاشرے میں کزن میرج عام ہے، اس نظم میں خالد شریف نے اپنی ایک کزن کو رفیقِ حیات بنانے سے انکار کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ روش عام ہے کہ ہم لوگ کچھ بننے کی دھن میں اکثر اپنوں کو بھول جاتے ہیں۔ شہزاد نیئرؔ کی نظم ''سیاچن'' ملاحظہ کیجیے:

جہاں میں ہوں

وہاں پر ذی نفس کوئی نہیں رہتا
سوائے کاروانِ سخت جاں کے رہ نوردوں کے
جو اپنی سرزمیں دشمن کے قدموں سے بچانے کو
ان اونچے کوہساروں
برف زاروں پہ اتر آیا
جہاں میں ہوں
وہاں پر برف اندر برف اُگتی ہے

(شہزاد نیئرؔ)

شہزاد نیئرؔ نے اپنی اس نظم میں سیاچن کے مقام کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ شہزاد نیئرؔ چوں کہ فوج میں میجر ہیں اس لیے انھیں ملک کے ہر علاقے میں جانا پڑتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے سیاچن کے موسم اور اس کی دفاعی حالات کا ذکر کیا ہے۔ شہزاد نیئرؔ نے ''سیاچن'' لکھ کر جذبہ حب الوطنی سے سرشار کر دیا ہے۔ عباس تابش کا معاصرین میں اہم مقام ہے، ان کے بارے میں شہزاد نیئرؔ جیسے اچھے نظم گو شاعر کہتے ہیں:

> ''عباس تابش عہدِ رواں کے ان شعرا میں شامل ہیں جو وسیع حلقۂ قارئین رکھتے ہیں جن کا کلام دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے وہ قاری اور کتاب کا رشتہ بھی بحال کر رہے ہیں اور ادب کی وسعت کا سبب بھی بن رہے ہیں ...... عباس تابش نے خود کو اقلیمِ سخن میں اس طرح منوایا ہے کہ اب انہیں عہدِ رواں کے اہم شاعر کے طور پر نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ بقول سید ضمیر جعفری، وہ قد آور شعرا
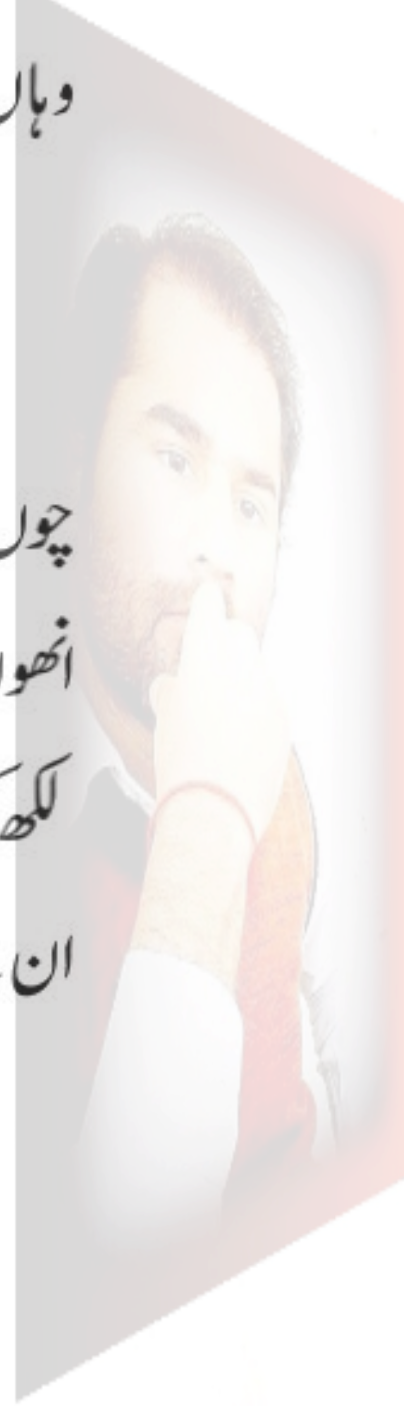
کے اس گروہ میں شامل ہیں جن کی انگلی پکڑ کر ایک عہد کا
ادب آگے حرکت کرتا ہے''(۲۳)۔

عباس تابش کا اُردو نظم میں مقام و مرتبہ ان کے معاصرین کی نظموں کے تقابلی جائزے سے لگایا جا سکتا ہے۔سرور ارمان کی ایک نظم ''مزدور'' ملاحظہ کیجیے:

دن نکلتا ہے تو لوگ نکل پڑتے ہیں
اک نئے کام کی امید میں چل پڑتے ہیں
ایک مخصوص سڑک پر سبھی ہوتے ہیں بہم
یہ وہ مزدوروں کی دنیا ہے جہاں ہر کوئی
اپنی حاجات و مسائل کا نمائندہ ہے
شہر جس محنتِ افراد سے تابندہ ہے
اپنے خستہ در و دیوار سے شرمندہ ہے
جب بھی آتا ہے کوئی ان کی طرف تو یہ سبھی
اس کے گرد اپنا ہنر بیچنے آ جاتے ہیں
بات طے جس کی ہو وہ کام پہ لگ جاتا ہے
ایسے کم بخت جنھیں کام نہیں مل پاتا
روٹیاں باندھے میلے سے رومالوں میں
اپنی آنکھوں میں لیے تیرتے ان گنت سوال
گھر کی اطراف پلٹتے ہوئے بوجھل بوجھل
اپنے حالات پہ کڑھتے ہوئے یہ سوچتے ہیں
کون لکھتا ہے مقدر میں غموں کے پہاڑ

کون یہ زخم جبینوں پہ سجا دیتا ہے
کون سرمایہ پرستی کو ہوا دیتا ہے

(سرور ارمان)

سرور ارمان نے اس نظم میں محنت کش اور مزدور طبقے کی نمائندگی کی ہے اور ایک مزدور کے شب و روز کا نقشہ نہایت خوبصورتی سے کھینچا ہے۔سرور ارمان معاصر شعرا میں ترقی پسند رجحانات کی وجہ سے اہم ہیں۔انھوں نے معاشرتی رویوں کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔اس طرح عباس تابش کی نظموں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی یہ رجحانات پائے گئے ہیں۔سعد اللہ شاہ، بھی عباس تابش کے اہم معاصرین میں شمار ہوتے ہیں،اُن کی ایک نظم ''طاقت'' ملاحظہ کیجیے:

خدا کی دسترس میں ہے
کہ سونا خاک کر دے
اور پھر خاک کو سونا بنا ڈالے
بھڑکتی آگ کو گلزار کر دے
پھر ایسے ہی مہکتے باغ کو پل میں جلا ڈالے

(سعد اللہ شاہ)

اس نظم میں خدا کی قدرت کا واضح نشان ملتا ہے،خدا ہر شے کا خالق و مالک ہے اور ہر شے پر قدرت و طاقت رکھتا ہے۔حسن عباسی کی نظم ''ماں'' کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

دہشت گردی سے دنیا کو خطرہ ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ علم نہیں

وہ تو اپنے گھر کے بارے جانتی ہے
وہ تو اتنا جانتی ہے
مینہ برسا تو
کمرے کی بوسیدہ چھت گر جائے گی

(حسن عباسی)

اس نظم میں شاعر نے ملک کے حالات کی ترجمانی کی ہے اور ماں کی محبت بیان کی ہے کہ روپیہ سستا ہو، ڈالر مہنگا ہو، اس سے کوئی غرض نہیں میری ماں کو، وہ تو صرف کپڑے سلائی کرنا، کپڑے دھونا، برتن صاف کرنا، اور جھاڑو دینا جانتی ہے۔ اس کو معاشرے کے حالات کی کوئی پروانہیں ہے۔ حسن عباسی عہدِ حاضر کے اہم شاعر ہیں۔ وہ بھی تابش کی شاعری کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۸۰ کی دہائی کے بعد جو شاعر ادبی منظر نامے پر اُبھر کر سامنے آئے اُن میں سب سے منفرد اور نمایاں نام عباس تابش کا ہے ان تمام شعرا کے کلام کی بنیادی خوبی تو یہی تھی کہ انھوں نے جدت کا اثر قبول کیا تھا۔ عباس تابش ان میں سے غالباً واحد شاعر ہیں جنھوں نے جدت کے ساتھ ساتھ روایت کا نہ صرف بھر پور مطالعہ کیا بلکہ اُس کو مکمل طور پر جذب کیا......وہ پرانے سے پرانے مضمون کو اپنی منفرد سوچ اور خیال سے اتنا نیا کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کا ہو جاتا ہے۔ میں عباس تابش کی شاعری کا ذاتی طور پر مداح ہوں''(۲۴)۔

عباس تابش کی نظم کا معاصر اُردو نظم میں مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے ظفر اقبال لکھتے ہیں:

> ''عباس تابش، کی فنی پختہ کاری سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اُس پر بڑھاپا پہلے آیا ہے اور جوانی، بلکہ لڑکپن بعد میں۔ بے عیب مصرع ہر کوئی نہیں بنا سکتا ......نئے ادبی معاشرے کی توقعات کچھ بھی ہوں۔ عباس تابش انہیں ہر وقت اور ہر طرح سے پورا کرنے کی ہر ممکن صلاحیت سے لبالب بھرا ہوا ہے''(۲۵)۔

عباس تابش کی کچھ نظموں کے نمونے اور ان کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے چند معاصر شعرا کی نظموں کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ معاصر شعرا کی نظموں اور عباس تابش کی نظموں کے تقابلی جائزے کے بعد یہ بات سامنے آئی ہے کہ عباس تابش کی آزاد نظم کسی ہم عصر شاعر سے کم معیار کی نہیں ہے۔ اُن کی نظمیں اس قدر معیاری ہیں کہ انھیں معاصرین نے بھی دل کھول کر قبول کیا ہے اور عباس تابش کی شاعری کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔ عباس تابش کی نظم نگاری اُن کی غزل کی طرح تو مقبولیت حاصل نہ کر سکی لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ان کی نظموں میں کمال کی ہنر آفرینی ملتی ہے۔ اس حوالے سے خورشید بیگ میلسوی کہتے ہیں:

> ''اگر ہم عصر تخلیق کاروں سے تخلیق ہونے والے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو عباس تابش اپنے اندازِ نگارش میں اُن کے حسیاتی شعور سے آگہی کے ساتھ ساتھ اپنے

مخصوص طرز ادا کو قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں
اُن کی فکری کارگاہ فنی ستونوں پر قائم ہے‘‘ (۲۶)۔

عباس تابش اُردو نظم میں لگا تار تو طبع آزمائی نہ کر سکے، اُن کے بعد میں آنے والے شعری مجموعوں (مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، پروں میں شام ڈھلتی ہے، رقصِ درویش) میں کوئی نظم بھی شامل نہ ہے۔ اُن کی طبیعت غزل کے لیے موزوں ہے اور شاید انھیں نظم کہنا اپنے مزاج سے زبردستی کے مترادف لگتا ہے۔ عباس تابش نے محض ۲۵ نظمیں لکھی ہیں، اس قلیل تعداد میں نظمیں کہہ کر انھوں نے خود کو ایک نظم گو شاعر کے طور پر بھی منوایا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی، عباس تابش کی شاعری کے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’ عباس تابش کی تمہید سے آسمان تک کے شعری سفر میں زمین اور آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے میں کافی محنت کی ہے اور اپنے ہم عمر شعرا میں ایک الگ اور منفرد مقام بنایا ہے۔ یہ بات میں نے محض روایتی پیرائے میں نہیں کی بلکہ آسمان میں شامل نظمیں اور غزلیں اس کی گواہی دیتی ہیں‘‘ (۲۷)۔

گزشتہ چند دہائیوں سے جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے اس میں عباس تابش کا نام اہم ہے۔ اُن کی نظمیں اس معیار کی ہیں کہ انھیں جدید اُردو نظم میں اہم سمجھا جائے، اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

’’عباس تابش کے ہاں انفرادیت اور تازہ کاری جگہ جگہ

موجود ہے۔ چنانچہ ان کا کلام گہرے تاثر کا حامل ہے اور
گزشتہ چند دہائیوں سے جو شاعری تخلیق ہو رہی ہے اس
میں عباس تابش کا مقام بہت بلند ہے‘‘ (۲۸)۔

عباس تابش منفرد لہجے کے خوبصورت شاعر ہیں انھیں نوجوان نسل اور سینئرز میں یکساں مقبولیت حاصل ہے۔ وہ دونوں حلقوں میں اپنا مقام و مرتبہ بنا چکے ہیں۔ ان کا اپنا اسلوب ہے، اُن کی شاعری ہر خاص و عام کے لیے ہے۔ عباس تابش کی نظموں کا مرکزی نقطہ محبت ہے، اسی محبت وعقیدت کی وجہ سے اُنھوں نے مختلف شخصیات کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔ ساری کائنات محبت کے مدار پر ہی ٹھہری ہوئی ہے۔ عباس تابش ایک پختہ کار اور چونکانے والے شاعر ہیں۔ اُن کی نظموں کے مطالعے اور تجزیے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے عہد کے بیشتر شعرا سے بہتر ہیں۔ عباس تابش اپنے خیال کی جزیات کو سطر در سطر آشکار کرتے ہیں اور نظم کے آخری مصرعے میں پوری بات کہہ دیتے ہیں۔

عباس تابش نے اس تکنیک کے تحت نظم نگاری کی ہے کہ خود کو نظم گو شعرا کی فہرست میں شامل کروالیا ہے۔ انھوں نے آزاد نظم کی سیدھی سادی سطروں میں بڑی بڑی گہری باتیں کی ہیں۔ ان باتوں کو عباس تابش کی ذہنی سطح پر ہی آ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ عباس تابش چوں کہ شروع میں مجید امجد سے متاثر ہوئے تھے اس لیے وہ ابتدائی دور میں نظم نگاری کی طرف راغب ہو گئے جو بعد میں اُنھوں نے ترک کر دی۔ یہ اُن کے مجید امجد کے اثرات قبول کرنے کی حد تھی۔ عباس تابش ایسا تخلیقی شاعر ہے جس نے تخلیقی عمل میں فنِ شاعری کے تمام عناصر کو چن چن کر اپنی سوچ اور خیال میں بھر لیا ہے۔ اُنھوں نے موضوعات میں تجربے کیے ہیں اور ایک جگہ قیام نہیں کیا۔

عباس تابش بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور اُردو شاعری میں غزل کی وجہ ہی

سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظم کے شاعر بھی ہیں۔ اُنھوں نے دونوں اصناف کے ساتھ یکساں انصاف کیا ہے اور دونوں اصناف میں کمال فنی مہارت دکھائی ہے۔ عباس تابش کو زبان و بیان پر اس قدر دسترس حاصل ہے کہ اُنھوں نے غزل کے روایتی مزاج کے باوجود بھی قابل توجہ نظمیں لکھ کر ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ عباس تابش کی آزاد نظموں میں تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

حواشی

(۱) رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ادب، (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد، پورب اکادمی، طبع اول ۲۰۱۰ء، ص ۱۷

(۲) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء، ص ۳۵۰

(۳) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۵، ۳۱۶

(۴) ابو اللیث صدیقی، تجربے اور روایت، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۹ء، ص ۱۱۸

(۵) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۳

(۶) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص ۳۹۷

(۷) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص ۴۲۸

(۸) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۰

(۹) انور سدید، ڈاکٹر، جدید نظم کے ارباب اربعہ، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱

(۱۰) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص ۵۶۷

(۱۱) حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ص ۵۰۵

(۱۲) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص ۵۱۳

(۱۳) حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو نظم معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۵۳۵

(۱۴) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص ۵۱۸

(۱۵) حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص۴۵۴

(۱۶) انور سدید، ڈاکٹر، جدید نظم کے ارباب اربعہ، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص۴۱

(۱۷) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۵ء، ص۶۰۶

(۱۸) خالد احمد، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء، ص۱۶

(۱۹) عباس تابش، انٹرویو، ماہنامہ، دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۴۱

(۲۰) عباس تابش، انٹرویو، ماہنامہ، دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۴۷

(۲۱) عباس تابش، دیباچہ، آسمان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت سوم ۱۹۹۹ء، ص۱۴

(۲۲) خالد احمد، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعتِ دوم ۱۹۹۹ء، ص۱۳

(۲۳) شہزاد نیئر، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۹۶

(۲۴) حسن عباسی، انٹرویو، راقم، لاہور، ۱۵ مارچ ۲۰۱۴ء (دیکھیے ضمیمہ ب، ص۳۶۲، ۳۶۳)

(۲۵) ظفر اقبال، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۵۹

(۲۶) خورشید بیگ، میلسوی، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۷۱

(۲۷) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء ص۸۷

(۲۸) خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆☆☆☆☆

باب چہارم

عباس تابشؔ کا شعری مقام ومرتبہ

باب چہارم

عباس تابشؔ کا شعری مقام و مرتبہ

مری طرح سے اُجڑ کے بسائیں شہرِ سخن
جو نقل کرنی ہے میری تو ہو بہو کی جائے

کسی شاعر، ادیب یا فنکار کی فنی و فکری صلاحیتوں و خوبیوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا، ناقدین کے لیے آسان کام نہیں ہے۔ کیوں کہ تنقید کا غیر جانبدار ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تنقید کار کے تخلیق کار سے ذاتی مراسم بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے کئی بشری تقاضے آڑے آ جاتے ہیں مگر ایک اچھے نقاد کا یہ وصفِ خاص ہے کہ وہ ہر لحاظ سے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ تنقید و تحقیق کے دوران ایک نقاد کو کئی مسائل و مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اپنے منصب و فرائض میں کوتاہی ہرگز نہیں برتتا، اسی لیے اُردو تحقیق و تنقید کا دامن بہت وسیع و عریض ہے۔ زیرِ نظر مقالہ ''عباس تابشؔ بطور شاعر ـــــ ایک تحقیقی مطالعہ'' میں ہر لحاظ سے ایک غیر جانب دار تنقید کا رویہ اختیار کر کے عباس تابش کا دورِ حاضر کی شاعری بالخصوص سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کی شاعری کے تناظر میں اُن کا شعری مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

عباس تابش کے پانچوں شعری مجموعوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اُن کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اُن کی شاعری کا مکمل جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ

عباس تابش اکیسویں صدی کی اُردو غزل کے اب تک کے بڑے شاعر ہیں۔ اُن کا کلام اُن کے معاصرین سے معیاری طرز کا ہے۔ اُن کی غزلوں میں شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کا تنوع ملتا ہے۔ غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک کے تمام مضامین و مسائل اُن کی شاعری کا حصّہ بنے ہوئے ہیں۔ عباس تابش کی شاعری روایت و جدّت کا بہترین امتزاج ہے۔ اُن کے کلام میں ہنر آفرینی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ ایک سچّے اور کھرے تخلیق کار ہیں۔ اُنھوں نے اب تک ایک مثالی شاعری تخلیق کی ہے۔

گزشتہ چار دہائیوں کے شعر و ادب پر طائرانہ نظر ڈالیں تو عباس تابش ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاں اظہار و بیان کے نت نئے انداز موجود ہیں۔ وہ صدیوں زندہ رہنے والے شاعر ہیں۔ مستقبل کی اُردو غزل اُن کی انگلی پکڑ کر چلے گی، مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔ اُن کے فکر و فن اور اسلوب سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس بارے میں حسن عباسی کہتے ہیں:

> ''عباس تابش کی غزل کی دھوم برصغیر پاک و ہند میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہے۔ اُن کی شاعری میں مکالماتی انداز بہت خوبصورت ہے۔ اُن کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ یاد رہتے ہیں۔ وہ پرانے سے پرانے مضمون کو اپنی منفرد سوچ اور خیال سے اتنا نیا کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کا ہو جاتا ہے۔ میں عباس تابش کی شاعری کا ذاتی طور پر مداح ہوں۔ مستقبل اُن کے لیے بہت تابناک ہے کیوں کہ اس وقت اُن کا شمار جدید غزل کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے''(۱)۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد سامنے آنے والے نئی نسل کے شعرا میں عباس تابش ایک نمایاں نام ہے۔ اُنھوں نے اپنے کلام کی وجہ سے بھارت سمیت پوری دنیا میں یکساں مقبولیت حاصل کی ہے۔ وہ مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں، اکثر مشاعرہ لوٹ لیتے ہیں۔ اُن کو معاصر شعرا کی نسبت مشاعروں میں زیادہ مدعو کیا جاتا ہے۔ عباس تابش اکثر ملک سے باہر جاتے ہیں اور مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ اپنی بہترین شاعری کی وجہ سے معاصر شاعری کے کامیاب شاعر ہیں۔ اُن کا یہ شعر ادبی منظر نامے میں اپنی اہمیّت منوا چکا ہے اور قارئین میں کافی پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ اس شعر میں اُنھوں نے ماں کی اپنی اولاد سے والہانہ محبت کا ذکر کیا ہے، شعر ملاحظہ کیجیے:

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

(آسمان)

عباس تابش اب نئی نسل کے شعرا کے لیے ایک راستے اور پل کا کام کر رہے ہیں۔ جس پر سے گزر کر آنے والے شہرِ سخن میں داخل ہو رہے ہیں۔ ظفر اقبال کے بعد غزل نقطۂ انجماد پر ٹھہر گئی تھی، عباس تابش کے جدید لہجے نے اس جمود کو تحریک دی۔ اس حوالے سے طارق کریم کھوکھر رقمطراز ہیں:

''ظفر اقبال کے بعد اردو غزل نقطۂ انجماد پر ٹھہر گئی تھی۔ عباس تابش کی تخلیقی حدت نے اسے ایک دفعہ پھر نئے راستوں پر رواں کر دیا ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عباس تابش ۸۰ء کی دہائی کے سب سے بڑے غزل گو ہیں'' (۲)۔

عباس تابش اُردو غزل کے ایک معتبر شاعر ہیں، احمد فراز کے بعد زیادہ مقبول ہونے والے شاعر ہیں۔ اُن کا شعری مقام و مرتبہ اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ پچھلی چار دہائیوں سے غزل پر قبضہ جمائے ہوئے نظر آتے ہیں، انھوں نے سینئرز کے لیے بھی شعر کہنا مشکل کر دیا ہے۔ عباس تابش اپنے فن اور اسلوب کے حوالے سے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ انھوں نے شاعری میں لہجہ، اندازِ تکلم، رنگِ سخن، محاورات، تشبیہات و استعارات، تراکیب و تلمیحات کا منفرد استعمال کیا ہے جو اُن کے شعری قد میں اضافہ کرتا ہے۔ عباس تابش کا کلام اُن کے معاصرین سے قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے خود کو ایک صاحبِ اسلوب شاعر منوانے کے لیے علم بیان کی کئی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے تشبیہ، استعارہ، تکرار لفظی، صنعت تضاد، تجربات، سہل ممتنع، تراکیب، مفرس شاعری، چھوٹی بڑی بحور، موسیقیت، طویل ردیف اور استفہامیہ لہجہ کا استعمال کیا ہے۔

عباس تابش نے موضوعاتی حوالے سے حمد و نعت، عشق و محبت (ہجر و وصال، سوز و گداز)، تنہائی و نارسائی، نقل مکانی اور بے گھری، فطرت نگاری، حقیقت نگاری، حب الوطنی، انانیت، موت و حیات کا فلسفہ، منظر نگاری و تصویر کشی، اخلاقی اقدار، تقدیر پرستی، پند و نصائح اور سیاسی و سماجی پہلوؤں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کیا ہے۔ عباس تابش اسلوبیاتی و موضوعاتی حوالے سے کتنے بڑے شاعر ہیں، اس بارے میں شہزاد نیئر ''بیاض'' میں لکھتے ہیں:

''اکیسویں صدی میں غزل کی عظمت کے نقیبوں میں ایک نمایاں نام عباس تابش کا ہے۔ انھوں نے روایت کا سرمایہ آنکھ میں رکھ کر جدید عہد کی نمائندہ غزلیں تخلیق کی ہیں۔ ان کا لہجہ غزل کا لہجہ ہے، ان کا اسلوب غزل کا

اسلوب ہے عباس تابش کے ہاں موضوعاتی تنوع اور خیال کی رنگارنگی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لیکن ان کا ایک خاص فن ایک ہی خیال کو دو مختلف پہلوؤں یا انداز سے شعر میں سمونا بھی ہے.....عباس تابش نے خود کو اقلیمِ سخن میں اس طور منوایا ہے کہ اب انہیں عہدِ رواں کے اہم شاعر کے طور پر نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا''(۳)۔

عباس تابش کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ امیجری اور سمعی و بصری تصاویر کلاسیکیت سے لیتے ہیں اور اپنی بات کو فطرتی مناظر کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ وہ پرندں اور درختوں میں اپنا اور زندگی کا عکس دیکھتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

شاید کسی بلا کا تھا سایہ درخت پر
چڑیوں نے رات شور مچایا درخت پر

سب چھوڑے جا رہے تھے سفر کی نشانیاں
میں نے بھی ایک نقش بنایا درخت پر
(آسمان)

شاعر پر معاشرے کے اثرات گہرے مرتب ہوتے ہیں، وہ اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ عباس تابش نے معاشرے کی بے راہ روی، ملکی عدم استحکام اور دہشت گردی کا ذکر کیا ہے۔ شاعری اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ایک خوبصورت تحفہ ہے، یہ تحفہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اس کے ذریعے ہم معاشرتی و سیاسی ناہمواریوں اور بے ضابطگیوں کو ٹھیک کر سکتے ہیں، شاعری کے ذریعے معاشرے میں جنم لینے والی برائیوں کے

خلاف آواز اٹھائی جا سکتی ہے اور قوم کی زندگی میں ایک تبدیلی برپا کر سکتے ہیں۔ شاعری میں شاعر صرف اپنے جذبات و احساسات اور تجربات کو ہی ذریعہ اظہار نہیں بناتا بلکہ وہ اپنے ماحول اور سماج کے دیگر پہلوؤں کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ شاعری نثر کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

عباس تابش کی شاعری اُن کے قلبی واردات و معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ ایک فطری و جینوئن شاعر ہیں۔ وہ وقتی تعریف و توصیف کے دھارے میں نہیں بہتے کیوں کہ وقتی تعریفوں سے کچھ دیر بعد شاعر کا فن دفن ہو جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں شعرا کو اپنے فن کی ترویج و ترسیل کے مواقع میسر ہوتے ہیں جب کہ مضافات سے تعلّق رکھنے والے شعرا کے ہاں ایسے مواقع کم ہوتے ہیں۔ عباس تابش بھی مضافات کے شاعر ہیں، انھوں نے لاہور آ کر کسی تعلّق کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے عمدہ کلام کی بدولت مقبولیت حاصل کی ہے۔ اب اُن کا شمار لاہور کے اچھے شعرا میں ہوتا ہے۔ عباس تابش کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جو محض توصیفی مضامین اور تعلقات کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے فکر و فن کی عظمت کے ذریعے مقبول و معتبر ٹھہرے ہیں۔ اُن کے گرد تعریف و توصیف کا کوئی حصار نظر نہیں آتا۔ وہ صرف شعر کی عظمت کے قائل ہیں۔

عباس تابش کو خبر ہے کہ ہیرا ہیرا ہی ہوتا ہے اُسے کسی جوہری سے سند حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، پتھر اور ہیرے میں فرق خود بخود ہو جاتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی ہنر آفرینی کی وجہ سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ عباس تابش کو اپنا فکر و فن بہت عزیز ہے وہ ایک خوددار اور انا پرست شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں معاشرے کا درد پایا جاتا ہے۔ وہ فن کے حوالے سے اس قدر فکر مند ہیں کہ ہر وقت انھیں غزل کی فکر رہتی ہے۔ اس حوالے سے محمد یونس بٹ ''تمہید'' کے دیباچے میں رقمطراز ہیں:

''عباس تابش کوغزل لکھنے کی اتنی ہی فکر ہوتی ہے جتنی
غریب والدین کواپنی خوبصورت بیٹی کی شادی کی''(۴)

عباس تابش کی فیض احمد فیض کی وفات پر لکھی گئی ایک خوبصورت نظم ملاحظہ کیجیے:

صفِ ماتم بچھی ہے
سخن کا آخری در بند ہونے کی خبر نے
کھڑکیوں کے پار بیٹھے غمگساروں کو
یہ کیسی چپ لگا دی ہے
یہ کس کی ناگہانی موت پر سرگوشیوں کی آگ روشن ہے
کسی کے کنجِ لب سے کوئی تارا میرے دل پر آن پڑتا ہے
برا ہو موت کا جس نے مرے فریادرس کی جان لے لی ہے
ابھی اُس کی ضرورت تھی
کسی نے نکہتِ زلفِ پریشاں کا نہیں پوچھا
کسی نے دکھ کے اندر روشنی کی چھب نہیں دیکھی
مکاں سے پھوٹنے والی روش پر
ایک بچہ رو رہا ہے
آج اس کے آنسوؤں کو کون پونچھے گا
کہ اس کے ساتھ جو شطرنج کی بازی لگاتا تھا
وہ اب زیرِ زمیں اک چادرِ سادہ کی خوشبو ہے

(ابھی اُس کی ضرورت تھی، تمہید)

یہ بات سچ ہے کہ کتاب کی طرح اچھا شعر بھی سفر کرتا ہے اور اپنے خالق سے

بہت آگے نکل جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے شعرا کے فکر و فلسفے کی بات کریں تو عباس تابش اُن سے دو قدم آگے نکل گئے ہیں۔ یہ اُن کے معیارِ غزل کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ عباس تابش بڑے خوش نصیب واقع ہوئے ہیں کہ ظفر اقبال جیسے بڑے شاعر، اُن کی شاعری کے معترف ہیں۔ اس سلسلے میں ظفر اقبال لکھتے ہیں:

''عباس تابش کی حیثیت ایک ایسی درس گاہ کی ہے جہاں اصیل شاعری کا فن مکمل طور پر سیکھا جا سکتا ہے اس لیے آپ کو سبق لینے کی ضرورت نہیں، بس ایک دفعہ اس کی شاعری کے چمن زار سے گزر جائیے یہ ہنر آپ پر خود ہی وا ہوتا چلا جائے گا۔ اپنے تازہ کار ہمعصروں کو متاثر کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جس میں اسے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ میں اس کی شاعری کا شروع ہی سے قائل ہوں''(۵)۔

ظفر اقبال کے اس بیان سے عباس تابش کے شعری مقام و مرتبے کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے قد آور شاعر ہیں۔ اُنھوں نے یہ مقام اپنی ہنر آفرینی کی بنا پر حاصل کیا ہے۔ اُنھوں نے روایت اور جدّت کے جو انوکھے تجربے کیے ہیں، اس وجہ سے وہ ایک صاحبِ اسلوب شاعر بن گئے ہیں۔ اُن سے پہلے کچھ شاعر روایتی انداز میں سخن بکھیرتے تھے اور کچھ محض جدیدیت کا راگ الاپتے رہے، جب کہ عباس تابش نے اُردو شاعری میں ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔ اُن کے ہاں روایت جدیدیت کے حجاب میں چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے غزل کو نئے خطوط پر استوار کر دیا ہے۔ جہاں سے آگے کے راستے

صاف دکھائی دینے لگے ہیں اور مستقبل میں آنے والے تخلیق کار اُن سے رہنمائی حاصل کر سکیں گے۔ اُنھوں نے غزل کے مزاج کو بدل دیا ہے، اس لیے وہ معاصرین سے آگے ہیں۔ اس بات کو محمد یونس بٹ یوں کہتے ہیں:

''عباس تابش اپنی نسل کے شاعروں میں سب سے آگے ہے مگر وہ وقت دور نہیں جب اس کا پیٹ اس سے بھی آگے نکل جائے گا''(۶)۔

یہ بات محمد یونس بٹ نے عباس تابش کی شاعری کے ابتدائی دور میں کہی تھی، اب اُن کی شاعری کا پیٹ واقعی ہی بہت آگے نکل چکا ہے۔ میں نے ان کے شعری مجموعے ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' اور ''رقصِ درویش'' کی غزلوں میں اس بات کو مکمل محسوس کیا ہے۔ اُن کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

حیرت ہے کہ دیتی ہیں مجھے طعنۂ وحشت
ترتیب سے رکھی ہوئی اشیا مرے آگے
(رقصِ درویش)

اپنا خیال آتا ہے اپنی مثال سے
خود کو میں دیکھتا ہوں کھنڈر دیکھنے کے بعد

نکلا تھا میرے ساتھ بڑی دھوم دھام سے
لیکن پلٹ گیا وہ سفر دیکھنے کے بعد
(رقصِ درویش)

عباس تابش ایسے تخلیق کاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کوئی بات نئے طریقے سے کہنے کا فن آتا ہے۔ اُن کی غزلیں اُن کے شعری وجود کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کا تمام تر شعری سفر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ ایک باکمال شاعر ہیں۔ عباس تابش نے یہ مقام اپنے شعر کی طاقت سے حاصل کیا ہے۔ ایک عرصہ اُن کی شخصیت متنازع رہی ہے مگر اس کے باوجود اُن کا شعری مقام ومرتبہ بلند ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد شعروسخن کی بات کریں تو عباس تابش ایک معتبر اور مستند غزل گو شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ مقام ومرتبہ اپنے تعلقات استعمال کر کے حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے فن وفکر کی عظمت کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ عباس تابش کی شاعری کی یہ خوبی ہے کہ اس کے اشعار زندہ و پائندہ رہنے والے ہیں۔ ان میں ایسی ندرت خیالی اور جدت پائی جاتی ہے جو انھیں ایک عہد ساز شاعر کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ عہدِ حاضر میں عباس تابش کی آواز ایک واضح پہچان رکھتی ہے۔ افتخار عارف، عباس تابش کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پروین شاکر، ثروت حسین، جمال احسانی اور اظہار الحق کے بعد عباس تابش اردو غزل کی روایت کو ثروت مند بنانے والی نسل کے میرے نزدیک سب سے نمایاں شاعر ہیں۔ ایک مکمل شاعر جو غزل کی کلاسیک روایت کے دائروں میں رہتے ہوئے مضمونِ تازہ کی نئی راہیں نکالتا ہے اور غزل بہ غزل اور کتاب بہ کتاب بلندیوں کی طرف گامزن ہے عباس تابش اپنی نسل کے مقبول ترین شاعروں میں ہیں''(۷)۔

عباس تابش ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو غزل کو متعدد موضوعات، رجحانات ومیلانات عطا کیے ہیں۔ جن کی بدولت اُردو غزل میں نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ عباس تابش کی نظموں کا فکری وفنی کینوس بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے زندگی اور کائنات کے متعلّق مسائل کی ترجمانی کی ہے۔ عباس تابش کی شاعری کے چمن زار میں داخل ہو جایئے تو وہاں خوبیوں اور خاصیتوں کے پھول کھلے ہوئے ملتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور ریاضت طویل ہے۔ اس لیے اُن کی شاعری میں اساتذہ اور روایت کا ذکر ملتا ہے۔ اس بات کو خود عباس تابش نے ''دنیائے ادب'' میں تسلیم کیا ہے بقول عباس تابش:

> ''دو سال تک محض اساتذہ کا مطالعہ اور شاعری کی ریاضت کرتا رہا۔ اسی دوران خالد احمد نے میری رہنمائی کی۔ ۱۹۸۳ء میں میری تین غزلیں فنون میں شائع ہوئیں اور یوں میرے شعری سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا'' (۸)۔

عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

شاخ پر پھول ، فلک پر کوئی تارا بھی نہیں
میں بھی تنہا ہوں بہت کوئی تمہارا بھی نہیں

عمرِ مابعد اگر تیرے علاوہ کچھ ہے
پھر تو میں اب بھی نہیں اور دوبارا بھی نہیں

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش نے اشعار میں اپنے خیالات وافکار کو سادگی اور ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اُن کا کلام قارئین کے دلوں میں اُتر جاتا ہے۔ اُن کے کلام میں محض غمِ جاناں کی غم نگاری نہیں بلکہ معاملات زندگی کے مسائل کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اُن کا کلام بامقصد ہے۔ اس سے اہلِ دل اور اہلِ دنیا اپنا اپنا کام چلا سکتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ایک منفرد رنگینی اور دلکشی ہے جو انھیں معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ اُن کا ایک ایک شعر کئی کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی شاعری ہر طبقہ کی بلا تفریق نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے شاعری میں کچھ باتوں کے لیے رمز و ایمائیت کا سہارہ لیا ہے۔ عطاالحق قاسمی، عباس تابش کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' عباس تابش کی غزل کی تروتازگی اور انوکھا پن اس کے قاری کو بہت سے مقامات پر مبہوت کر دیتا ہے۔ تابش کی داخلیت اور خارجیت بھی کسی دوراہے پر کھڑی نظر نہیں آتی بلکہ اُن کی صورت ہم سفری کی ہے اس خوبصورت شاعر کی غزل میں موجود یہ سب خصوصیات قاری کے ذہن پہ صرف ایک تاثر چھوڑتی ہیں اور یہ تاثر بے پناہ تاثیر کا ہے...... مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک دن اردو ادب کا قاری اس پُراثر طرزِ فغاں کے قابل نوجوان شاعر کا نام بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ان شعرا کے ساتھ لے گا جنھیں ایک عرصے سے مسلمہ طور پر اردو غزل کی آبرو سمجھا جاتا ہے'' (۹)۔

عباس تابش ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی موضوعات کو اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ اس میں نئے اور منفرد تجربات کیے ہیں، اُن کا کلام لطیف خیال لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی تلخیوں اور محرومیوں کو اس طرح اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے کہ یہ ساری محرومیاں اور تلخیاں اجتماعی نوعیت اختیار کر گئی ہیں۔ اُنھوں نے اولاد کی نعمت سے محرومی سمیت دیگر تلخیوں اور کرب کو شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ عباس تابش کے یہ اشعار دیکھیے ان میں بچوں کا ذکر ملتا ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

ایک بے کار تمنا کو لگا کر دل پر
ہم نے ٹوٹے ہوئے حجرے کی مرمت کی ہے

عہدِ فرصت تھا ہمیں موت کے وقفے کی طرح
ہم نے اس میں بھی محبت ہی محبت کی ہے
(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش، حسن وعشق کی شاعری بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے عورت کی محبت کے علاوہ درختوں، پرندوں سمیت کائنات سے محبت کی ہے۔ وہ ساری دنیا کے مظلوم لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے محبت کے روایتی اور مستعمل خیالات ومضامین کو نئے انداز میں برتا ہے۔ یہ اُن کی فنی دسترس کا کمال ہے۔ انھوں نے روایت کا دامن پکڑ کر جدید غزل کے تقاضوں کو بخوبی نبھایا ہے۔ اُن کی نظر بیک وقت اپنے ماضی، حال اور مستقبل پر رہتی ہے۔ اس لیے اُن کی شاعری خیالات کا مکرر پن نہیں ہے۔

عباس تابش معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی حمایت کرتے ہیں اور مظلوم کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے مزدور اور محنت کش طبقے کی نمائندگی بھی کی ہے۔ انھوں نے ملکی

حالات ودہشت گردی کو بھی اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ اُن کے کلام کی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ محض فرضی، خیالی، غیر فطری اور غیر مری پہلوؤں کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ حقیقت نگاری کا قائل ہے۔ عباس تابش کی شاعری کو بلند مقام ومرتبہ اس لیے ملا ہے کہ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی وعکاسی کی ہے۔ اُن کے کلام میں اخلاقی اقدار بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اُن کے کلام میں انسانی محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے اس لیے وہ ایک آفاق گیر شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو صرف رومانوی حدود وقیود میں نہیں رکھا بلکہ معاشرے اور معاشرتی مسائل پر بھی بات کی ہے۔ عباس تابش کا شعری مقام ومرتبہ متعین کرتے ہوئے اصغر ندیم سید ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اب ثروت حسین کے بعد غزل کی شمع جس شاعر کے ہاتھ میں آئی ہے اُس کا نام عباس تابش ہے جس نے اتنے بڑے اساتذہ کا بھرم رکھنا ہے۔ عباس تابش نے اردو غزل کی مشعل اولمپک تھام لی ہے۔ میں یہ دعویٰ ایسے نہیں کر رہا میں نے عباس تابش کا کلیات ''عشق آباد'' پڑھ لیا ہے...... عباس تابش کی غزل کو عمرانی، رومانوی، مارکسی، نفسیاتی اور مابعد الطبعیاتی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے والے پرکھ لیں۔ انہیں اپنے مطالب کی ہر بات مل جائے گی اور یہ ایک بڑے غزل گو کی محض ایک نشانی ہے''(۱۰)۔

۸۰ء کی دہائی میں کئی اور شاعر بھی ابھر کر سامنے آئے لیکن عباس تابش اپنی

معیاری شاعری کی وجہ سے سب سے نمایاں مقام و مرتبہ حاصل کر گئے ہیں۔اس دہائی کے تمام شعرا نے جدت کا اثر قبول کیا۔انھوں نے نئے نئے مضامین، تشبیہات، استعارات اور تراکیب استعمال کی تھیں۔اُن شعرا نے مصرعوں کی بندش و بنت کمال ہنر مندی سے کی تھی مگر ان میں سے اکثر شعرا جدت کے دائرہ میں ہی محیط ہو کر رہ گئے کیوں کہ اُن کا روایت سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔اسی لیے اُن سب شعرا کے کلام میں یکسانیت نظر آتی تھی۔

عباس تابش کو منفرد مقام و مرتبہ اس لیے ملا ہے کہ انھوں نے جدید لہجے کے ساتھ ساتھ روایت کا دامن بھی تھام رکھا ہے۔ اس لیے اُن کی غزل کی دھوم اُن کے معاصرین کی نسبت زیادہ پھیل چکی ہے۔عباس تابش کی شاعری میں ایک خاص وصف اُن کا مکالماتی انداز بھی ہے۔اُن کے اشعار نئے انداز میں تخلیق ہوئے ہیں۔اس وجہ سے اُن کا شمار اُردو غزل کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔

عباس تابش کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ رمز و ایمائیت کے باوجود بھی اس میں بھر پور ابلاغ پایا جاتا ہے۔اشعار میں موضوعاتی تنوع جا بجا ملتا ہے۔تابشؔ کی شاعری موسیقیت وغنائیت سے لبریز ہے۔اُن کے اشعار میں صوتیاتی آہنگ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی غزلیں آسانی کے ساتھ گنگنائی جا سکتی ہیں۔انھوں نے شعر کو گداز اور دلنشیں بنانے کے لیے سہل اور مترنم زمینوں کا انتخاب کیا ہے۔وہ زمین ایسی استعمال کرتے ہیں جو کلاسیکی اور جدید لہجے میں امتزاج پیدا کر سکے۔اُن کے قافیے اور لمبی ردیفیں شاعری کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔عباس تابش کا شعری مقام و مرتبہ اس لیے بلند ہے کہ اُنھوں نے عہدِ حاضر کی تمام باریکیوں اور پہلوؤں پر نظر رکھی ہوتی ہے۔وہ معاشرے کے اجتماعی مسائل اور مخصوص فکری جہات کا مکمل شعور رکھتے ہیں، وہ شاعری میں اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔اس لیے وہ دیگر شعرا سے ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔عباس تابش کے لہجے کی گھلاوٹ، گھمبیرتا

اور سنجیدگی قابلِ دید ہے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

غلط کہا کہ دہن کا رفو ضروری ہے
یہ میکدہ ہے یہاں ہاؤ ہو ضروری ہے
(رقصِ درویش)

اس جہاں میں عجب نہیں کچھ بھی
پہلے کیا کچھ تھا اب نہیں کچھ بھی

مختصر یہ کہ اچھے لگتے ہو
چاہنے کا سبب نہیں کچھ بھی
(آسمان)

مضمون آفرینی اور لہجے کی سادگی تابشؔ کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اُن کے کلام میں موضوعاتی تنوع بار بار اور جگہ جگہ ملتا ہے۔ڈاکٹر طاہر تونسوی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''عباس تابش کے تخلیقی اظہار کا ایک وصفِ خاص ترکیب سازی ہے۔غالب اور اقبال ترکیب ساز شاعر ہیں فیض نے بھی ان دونوں کی روایت کو گہرا کیا ہے۔ نوجوان شعرا کے ہاں اس خوبی کا کمال بڑے فنکارانہ انداز میں موجود ہے اور اسی میں عباس تابش نے بھی کام دکھایا ہے۔عباس تابش کی غزل جوابِ غزل سے نہ نکلنے کے باوجود افلاک غزل سے نکلنے والا وہ سورج ہے جو اپنی

ضیا پاشیوں سے اس کے ہمعصروں کو خیرہ کر رہا
ہے''(۱۱)۔

عباس تابش عہدِ حاضر کے ایک ایسے باکمال شاعر ہیں جن سے عصری ادب رہنمائی لے کر راہِ سخن پر روانہ ہوتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے منفرد اسلوب اور ندرت خیالی سے اپنے شعری سفر کا شاندار آغاز کیا ہے۔ عباس تابش اپنے اندازِ سخن اور حیاتی شعور کے ساتھ ساتھ مخصوص لہجے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاں وہ ندرت کمال اور اندازِ بیان ہے، جس کی وجہ سے عظمت کے دروازے اُن پر کھلے ہیں۔ عباس تابش عہدِ حاضر میں اُردو شاعری کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔ اُن کے بغیر جدید اُردو غزل شاید آج اس مقام پر نہ ہوتی۔ اس حوالے سے خورشید بیگ میلسوی لکھتے ہیں:

''اس عہدِ ادب میں عباس تابش کی غزل سرمایہ ہے جو
ادب کی شان کو بڑھانے کا باعث ہے۔ اس کے شعروں
کی تابانی نے اسے تابش کہلوایا ہے''(۱۲)۔

عباس تابش داخلی کیفیات کے شاعر ہیں، اُن کی شاعری میں داخلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس میں محبت اور ہجر و وصال کے موسم بھی ہیں اور انسان کی حیاتی زندگی کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ اسی لیے اس کی شاعری میں فلسفہ ہے اُنھوں نے غزل کو مسند وقار پر بٹھا دیا ہے۔ خورشید بیگ میلسوی، عباس تابش کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''عباس تابش کے ہاں عصری اشارے بھی موجود ہیں یہ
نہ صرف ادبی حوالے سے ہے عصر گزشتہ اور عصر موجود
کے اظہار سے پیوست ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ بڑا

شاعر زبان و مکان کی قید سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا
......عباس تابش کی شاعری اپنے عصر کی نمائندہ ترین
شاعری نظر آتی ہے کیوں کہ عباس تابش کی محبت کی طرح
اُن کی شاعری کی کشش اور سحر کاری غمِ روزگار جیسی ٹھوس
حقیقت کو بھی مسخر کرتی ہوئی نظر آتی ہے''(۱۳)۔

عباس تابش کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے؛

چاند بھی سرخ ہے آنکھوں کی طرح
یہ کسی ظلم پہ رویا ہو گا
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

چاند کے ساتھ بہت دور نکل آیا تھا
اب کھڑا سوچتا ہوں میں نے کدھر جانا ہے
(پروں میں شام ڈھلتی ہے)

عباس تابش کا وارداتِ قلبی اور محبت کی ستم آفرینی کو حوالۂ قرطاس کرنے کا اپنا انداز ہے۔ اُنھوں نے کلام میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی کارستانیاں پیش کی ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو اپنے منفرد اسلوب اور شاعری کی ریاضت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر احساسات کے شاعر ہیں۔ وہ محض فلسفے کی بات نہیں کرتے بلکہ روزمرہ زندگی کے احساسات کو پیش کرتے ہیں۔ عباس تابش نے موزوں الفاظ کو اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے اور اپنے تیشے سے اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ انھوں نے شعر کو ذاتی کیفیات سے باہر نکال کر اجتماعی کیفیات سے روشناس کروا دیا ہے۔ اس لیے عباس تابش کے ہاں رومانوی طرز کا احساس بھی پایا جاتا ہے مگر یہ رومانویت جدید انداز کی ہے۔ یہ سب انھوں
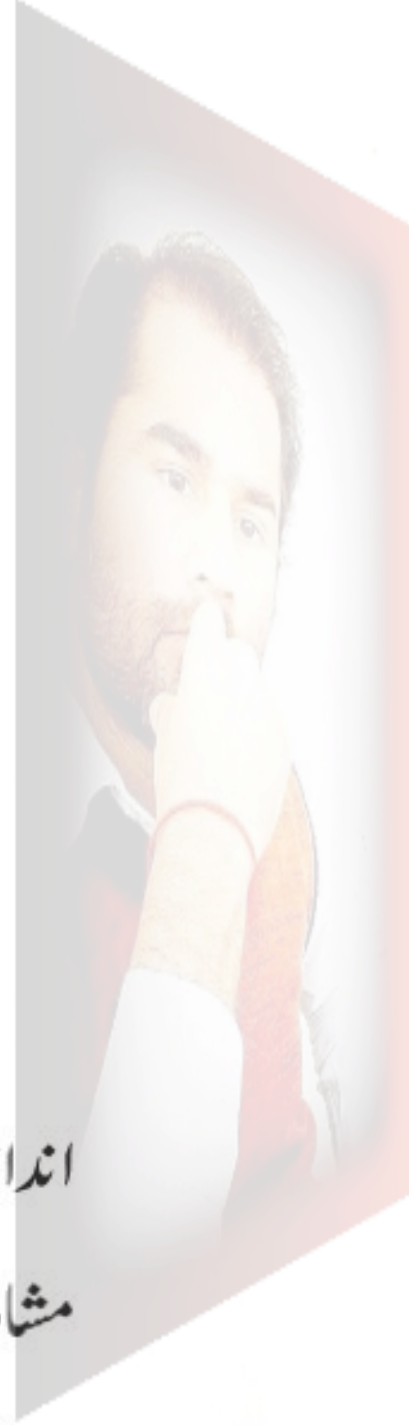
نے فنی ریاضت کے باعث کیا ہے۔عابد حسین عابد، عباس تابش کے چوتھے شعری مجموعے ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' کی اشاعت پر رقمطراز ہیں:

> ''ہم نے عباس تابش کے تازہ مجموعۂ کلام ''پروں میں شام ڈھلتی ہے'' کا مطالعہ کیا ہے۔اس سے قبل ان کے تین شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں ان کے نام بالترتیب تمہید، آسمان اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا ہیں، حقیقت یہ ہے کہ تابش کو اب دوسروں کی دعاؤں کی ضرورت نہیں رہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے خدا کے برگزیدہ شاعر اپنے مریدوں کے حق میں دعائیں کیا کرتے ہیں۔ہم جیسے عقیدت مند تو کلمہ خیر ہی ادا کر سکتے ہیں کہ وہ جدید لب ولہجے کے ایک اہم غزل گو ہیں، انھوں نے جدید غزل کا 'فارمولا' پالیا ہے''(۱۴)۔

عباس تابش کی شاعری میں خیال کے متنوع پہلو روشن ہوتے ہیں اُن کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

صبح دم میں کھولتا ہوں رسی اپنے پاؤں کی
دن ڈھلے خود کو کہیں سے ہانک کر لاتا ہوں میں

میرے ہاتھ آتے ہیں تابشؔ دوسرے موسم کے پھول
ایک موسم میں تو ٹہنی تک پہنچ پاتا ہوں میں

عباس تابش خوبصورت لہجے کے شاعر ہیں، اُن کی شاعری ذوق وشوق سے پڑھی جانے والی شاعری ہے۔وہ اپنی ذات کے چھوٹے سے دائرے سے نکل کر زندگی کے دوسرے دائروں میں داخل ہو چکے ہیں۔وہ محض انفرادی جذبوں کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ اجتماعی رویوں کے شاعر بھی ہیں۔عباس تابش اپنے اچھوتے پن کی وجہ سے بلندیوں کی طرف گامزن ہیں اور دیگر معاصر شعرا سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔اس حوالے سے جاوید اختر پاشا لکھتے ہیں:

> ''میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کی عباس تابش کے کلام پر کوئی رائے زنی کر سکوں لیکن ان کی جرأت قوت متخیلہ' سوچ کا انداز، زبان، بیان، کیفیت اظہار، چبھن، دھوپ، چھاؤں، گرم، سرد، مٹھاس، ترشی تلخی، اعتماد، ذوق، پسند، استعارے، مثالیں، بندشیں، مضامین، تجربات، روایات، تمازت، موضوعات، نظریات، وضاحت، بلاغت اور بہت کچھ ایسا ہے جس سے متاثر ہو کر کلام کو اعلیٰ مقام عطا کرتا ہے''(۱۵)۔

عباس تابش کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

قدم میں گھر سے نکالوں تو گھر بھی جاتا ہے
کبھی کبھی مرا جانا ٹھہر بھی جاتا ہے

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

تیرا سورج کے قبیلے سے تعلّق تو نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا سبھی کا ہونا

(مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا)

عباس تابش کی شاعری کے حوالے سے رضاالحق صدیقی کہتے ہیں:

''تابش کے کلام میں ایک خاص غنا کا عنصر ہے اس کے اشعار پڑھنے سے ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ایک وجد کا عالم طاری ہونے لگتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اچھوتی بات کہہ دی گئی ہے۔اس کے کلام کی زیب وزینت میں تغزل کا بڑا حصّہ ہے اور اس تغزل نے اس کی غزل کو مقبول رنگ عطا کیا ہے''(۱۶)۔

دیگر اہم ادیبوں اور ناقدین کی آرا

عباس تابش کا شعری مقام ومرتبہ چند اہم ادیبوں اور ناقدین کی آرا کی روشنی میں کچھ یوں ہے۔رحمٰن فارس،عباس تابش کا شعری مقام ومرتبے کا تعیّن کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عین اُس لمحے جب ہم بے صبروں کو گمان گزرنے لگتا ہے کہ شاید اب محبت کے حوالے سے کوئی نئی بات نہیں کی جا سکتی عباس تابش کا کوئی نیا نکور شعر بڑے بڑوں کو حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔عباس تابش دیارِ عشق کی خاک کو آبِ گریہ میں ہولے ہولے گوندھتا ہے پھر

خدوخال یار سے کشید کی گئی ملاحت اور ہجر ووصال کی شیریں تلخی اس کے اجزا بنتے ہیں،رائیگانی کی ہلکی آنچ پر یہ پکوان تیار ہوتا ہے جو اسے ایک بار چکھ لے اسی کا ہو جاتا ہے''(۱۷)۔

احمد عطار اللہ ، عباس تابش کے پانچویں اور ایوارڈیافتہ شعری مجموعے ''رقص درویش'' کے فلیپ پر عباس تابش کا شعری مقام ومرتبہ متعین کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''سب کو غزل پر فخر ہے لیکن غزل کو جن شعرا پر فخر رہے گا اُن میں عباس تابش کا نام بھی شامل ہے۔فراز کے بعد صرف عباس تابش ہی کو قبولِ خاص و عام کی سند نصیب ہوئی ہے''(۱۸)۔

حسنین سحر،عباس تابش کے شعری مقام ومرتبے کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''میرے خیال میں دورِ حاضر اور مستقبل کے اساتذہ غزل کا یہ دور عباس تابش کے نام کرنے میں فخر محسوس کریں گے''(۱۹)۔

اجمل نیازی،عباس تابش کو اہم شاعر کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لفظ و خیال کی حکمرانی اور ہجر ووصال کی درویشی کے

امتزاج سے شاعری کا جو مزاج بنا ہے اسے عباس تابش نے ایک ان دیکھی معراج پر پہنچا دیا ہے۔ شاعری معلوم سے نا معلوم تک کا ایک سفر ہے اسے نا معلوم سے معلوم کی مسافت کا لطف عباس تابش نے دیا ہے‘‘ (۲۰)۔

شکیل جاذب، عباس تابش کی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’عباس تابش نے جب غزل کی وادی پر خار میں قدم رکھا تو اُسے اندازہ تھا کہ اس دشت کی بے کناری رہروانِ شوق کی ہڈیوں سے عبارت ہے۔ اور اس تک پہنچنے کا رستہ شہرِ تہمت کی کوئے ملامت سے گزرتا ہے۔ عباس تابش نے بغیر کسی منافقانہ تنقید و توصیف کے اپنے آپ کو ہر دوست و دشمن سے منوایا ہے‘‘ (۲۱)۔

تابش کے شعری مقام و مرتبے کو متعین کرنے کے لیے نامور شعرا، ادبا اور نقادوں کی آرا سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ ظفر اقبال سے لے کر شاہد ذکی تک کی غزل پر طائرانہ نظر ڈالیں تو عباس تابش جدید اُردو غزل کے نمایاں شاعر نظر آتے ہیں۔ اُن کے فکر و فن کے اچھوتے پن کی بدولت انھیں عہدِ حاضر میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

حواشی

(۱) حسن عباسی، انٹرویو، راقم، لاہور، ۱۵ مارچ ۲۰۱۴ء (ملاحظہ کیجیے ضمیمہ ب، ص ۳۶۳)

(۲) طارق کریم کھوکھر، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۳) شہزاد نیرّ، میجر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۹۳، ۹۶

(۴) محمد یونس بٹ، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت دوم ۱۹۹۹ء، ص ۱۹

(۵) ظفر اقبال، فلیپ، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۶) محمد یونس بٹ، دیباچہ، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، اشاعت دوم ۱۹۹۹ء، ص ۱۹

(۷) افتخار عارف، فلیپ، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

(۸) عباس تابش، انٹرویو، ماہنامہ، دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۴۷

(۹) عطاالحق قاسمی، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۶۷

(۱۰) اصغر ندیم سید، دیباچہ، سلسلہ دلداری کا (عباس تابش)، انتخاب، شکیل جاذب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۱۲

(۱۱) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۰

(۱۲) خورشید بیگ، میلسوی، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۱، ۷۲

(۱۳) خورشید بیگ، میلسوی، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۷۶

(۱۴)عابد حسین عابد، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۷۸

(۱۵)جاوید اختر پاشا، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۹۷

(۱۶)رضا الحق صدیقی، ماہنامہ، بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء، ص۱۰۰

(۱۷)رحمٰن فارس،فلیپ ،رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۱۸)احمد عطاراللہ،فلیپ ،رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۱۹)حسنین سحر،فلیپ ،رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۲۰)اجمل نیازی،فلیپ ،رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

(۲۱)شکیل جاذب،فلیپ ،رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۸ء

☆☆☆☆☆

باب پنجم

محاکمہ

باب پنجم

محاکمہ

اُردو شاعری کا جائزہ لیں تو اس کا سفر تقریباً چھ صدیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر عہد میں شاعری کے رجحانات ومیلانات میں اُس وقت کے شعرا نے مقدور بھر تبدیلی کی۔ اُردو ادب بڑا خوش نصیب واقع ہوا ہے کہ اس کو ہر عہد، ہر صدی میں کوئی نہ کوئی بڑا شاعر ضرور ملا ہے، جس سے اُس عہد کو منسوب کر دیا گیا ہے۔ کبھی ولی کا عہد رہا تو کبھی میر وسودا کا دور آیا، کبھی غالب ومومن کا زمانہ رہا تو کبھی آزاد و حالی نے شاعری پر قبضہ جمایا، کبھی داغ وحسرت کے سخن کا چرچا عام ہوا تو کبھی اقبال وفیض نے شاعری کی روایت کو گہرا کیا۔ علاوہ ازیں بھی ہر عہد کے شعرا نے اُردو شعر وادب کی روایت کو توانا رکھنے کی بھر پور کوشش کی۔ اس طرح اُردو غزل ونظم مختلف ادوار سے ہوتی ہوئی عباس تابش تک آ پہنچی ہے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں نئی نسل کے کئی شعرا ابھر کر سامنے آئے۔ بیسویں صدی اُردو ادب کے فروغ کا زمانہ تھا، ۸۰ء کی دہائی میں شعرا کی جو کھیپ تیار ہوئی وہ بڑی زرخیز کھیپ تھی۔ اس صدی کی آخری تین دہائیوں میں جو شعرا شعری اُفق پر نمودار ہوئے اُن میں عباس تابش کافی نمایاں شاعر ہیں۔

عباس تابش نے اُس وقت شاعری کے چمن زار میں قدم رکھا جب ہر طرف جدیدیت کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ بھی اس روایت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ

سکے اور مجید امجد کا اثر قبول کر لیا۔ شاعری میں جدیدت کی اس لہر نے شعرا کو اس قدر اپنی لپیٹ میں لیا کہ معاصر شعرا کی آوازیں کچھ دیر بعد یکسانیت کا شکار ہو گئیں۔ ایسے حالات میں تابش واحد شاعر تھے جنھوں نے کلاسیکی روایت کا دامن تھام کر جدید آہنگ اپنایا۔ اس طرح وہ یکساں نوعیت کے موضوعات کی جگالی کرنے سے بچ گئے اور خود کو منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر کے طور پر منوایا۔ اُنھوں نے شاعری میں جدید طرزِ احساس کی تشکیل وترویج میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اُن کا لہجہ جدید رنگ وآہنگ لیے ہوئے ہے مگر انھوں نے کلاسیکی روایت سے اکتساب کیا ہے۔ اُن کے شعری اسلوب میں اجتہادی خصوصیات پائی جاتی ہیں کیوں کہ ظفر اقبال کے بعد اُردو غزل جمود کا شکار ہو گئی تھی، عباس تابش کے فنِ سخن نے اس جمود کو توڑ کر اردو غزل کو حرکت وتحریک دے کر نئے راستوں پر گامزن کر دیا۔

عباس تاش کی شاعری روایت وجدت میں ڈوبے ہوئے تخلیقی مزاج کا اچھوتا نمونہ ہے۔ اُنھوں نے غزل گوئی میں نئے مزاج اور نئے انداز کو اپنایا ہے۔ اس لیے بعد میں آنے والے شعرا ان سے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ عباس تابش کی شاعری کی گونج بیسویں صدی سے سفر کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں داخل ہو گئی ہے۔ اُن کی جدید نظمیہ شاعری نے اُردو ادب کو چند اہم نظمیں بھی دی ہیں۔ عباس تابش روایت وجدّت کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں اس لیے معاصرین میں ایک عرصہ متنازع شخصیت بنے رہے۔ اُن پر کئی ایک اعتراضات بھی اُٹھائے گئے۔ کسی نے ان پر روایت پرست ہونے کا الزام لگایا تو کسی نے پیوند کاری کا الزام دھر دیا لیکن جب روایت وجدت کی اس پیوند کاری سے نئے نئے پھل پھول آنے لگے تو وہی لوگ بدل گئے اور عباس تابش کے معترف ہو گئے۔ یہ بات عباس تابش کے منفرد اسلوب اور اعلیٰ شعری مقام کی واضح دلیل ہے کہ اُن کے معاصر شعرا اور ناقدین نے اُن کی توصیف میں دل کھول کر مضامین لکھے۔

عباس تابش نے جدید اُردو غزل کے تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اسے مطلوبہ معیار کے مطابق تخلیق کیا ہے۔انھوں نے غزل میں رنگ برنگ مضامین بھر دیے ہیں۔اُن کی شاعری کے گلستان کی سیر کریں تو ہر طرف تازہ شگوفے اور پھول کھلے ہوئے ملتے ہیں، جس کی مہک نے سارے ادبی منظر نامے کو معطر کر دیا ہے۔عباس تابش کے پانچ شعری مجموعے تمہید، آسمان، مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، پروں میں شام ڈھلتی ہے اور رقصِ درویش شائع ہو چکے ہیں۔ان پانچوں شعری مجموعوں پر مشتمل ایک کلیات بھی 'عشق آباد' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔رقصِ درویش، تہذیب فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہے۔

عباس تابش کی شاعری ایک خوش ذائقہ پھل کی طرح ہے جو اسے ایک بار چکھ لے وہ بارِ دگر اس کا مطالبہ کرتا ہے۔وہ اپنے منفرد انداز میں شعر تخلیق کرتے ہیں اور ہمہ وقت شعر میں محو رہتے ہیں۔وہ اپنے الفاظ کے ذریعے شعر میں اس قدر مصوری کرتے ہیں کہ شعر میں منظر نگاری اور تصویر کشی پیدا کر دیتے ہیں۔عباس تابش پرانے سے پرانے مضامین اس انداز سے باندھتے ہیں کہ وہ بالکل نئے ہو کر اُن کے ہی لگنے لگتے ہیں۔وہ نئے مضامین نکالنے میں اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ ان پر اپنے جداگانہ اسلوب کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔وہ اساتذہ کے وسیع مطالعے اور شاعری میں گہری ریاضت کی وجہ سے اس مقام پر پہنچے ہیں۔

صاحبِ اسلوب ہو کر مقبول ہونا بڑی خوش نصیبی ہے اس میں عباس تابش بڑے کامیاب ٹھہرے ہیں۔ وہ اُردو غزل کے ایک قد آور شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔اُنھوں نے روایت کا پہلو بھی ہاتھ میں رکھا ہے اور جدید غزل کے تقاضوں کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔ اُن کی شاعری قدامت اور جدّت کی ایک اچھوتی مثال ہے۔اُنھوں نے

روایت اور جدّت کا ایک ایسا محلول تیار کیا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ روایتی غزل میں ہی اُنھوں نے ایک نئی روایت کو جنم دیا ہے۔عباس تابش کی غزلیں عصری پہلوؤں کی عکاس ہیں۔ عباس تابش بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ابھر کر سامنے آئے، اُس وقت کئی شعرا غزل کہہ رہے تھے لیکن اُن کی آواز زیادہ دور تک سنائی نہ دیتی تھی۔ایسے میں عباس تابش نے اپنے انفرادی لب و لہجے سے غزل کو نئے سرے سے تشکیل دیا تو اُن کی آواز نہ صرف برصغیر پاک و ہند تک پہنچی بلکہ پوری دنیا میں سنی جا رہی ہے۔ابتدا میں عباس تابش نے بھی وہی اندازِ سخن اختیار کیا جس پر اُس وقت کے مقبول شعرا کی چھاپ تھی مگر جلد ہی اُنھوں نے اس راستے کو ترک کر کے اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کر لیا۔جو بعد میں اُن کی الگ پہچان بنانے کا باعث بنا۔یہ راستہ اُنھوں نے کلاسیکیت اور جدیدیت کے حسین امتزاج سے تشکیل دیا۔

عباس تابش نے فارسی تراکیب اور اندازِ بیان کی ندرت سے ایک الگ راستہ نکالا جس پر سفر کر کے وہ جدید اردو غزل کے اہم شاعر ثابت ہوئے ہیں۔انھوں نے یہ مقام بغیر کسی تعریف و توصیف کے اپنی فنی دسترس کی بنا پر حاصل کیا ہے۔انھوں نے شاعری میں اعلیٰ فکر و فن کی پاسداری کی ہے۔عباس تابش کی شاعری کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ بات کھل کر واضح ہوئی ہے کہ انھوں نے موضوعات بکثرت استعمال کیے ہیں۔انھوں نے تمام موضوعات کو اپنے اچھوتے لہجے سے اس طرح نیا کر دیا ہے کہ انھی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

عباس تابش احساسات و جذبات کے شاعر ہیں۔انھوں نے محبت و نفرت، دوستی و عداوت، خوشی و غم سمیت کئی جذباتی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔شاعری میں موضوعات جس قدر اعلیٰ ہوں اسی قدر شعر بڑا ہوتا ہے۔عباس تابش کی شاعری میں تمام فکری و فنی محاسن پائے جاتے ہیں۔اُن کا لہجہ، اُن کا اندازِ تکلم، اُن کا رنگِ سخن، اُن کے محاورات، اُن کی

تراکیب اور اُن کی تشبیہات و تلمیحات منفرد ہیں۔عباس تابش نے علم بیان کی کئی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔انھوں نے تشبیہ، استعارہ، صنائع بدائع، تکرار لفظی، صنعتِ تضاد، تجربات، تلمیح، سہلِ ممتنع، تخلص، فارسی تراکیب، مفرس شاعری، چھوٹی بڑی بحور، ضرب المثل اور استفہامیہ لہجے کا استعمال کیا ہے۔موضوعاتی حوالے سے عباس تابش نے محبت، حسن وعشق، تنہائی و نارسائی، حقیقت نگاری، خواب وتخیل۔فلسفۂ موت وحیات، تقدیر پرستی، پندونصائح، سیاسی وسماجی پہلوؤں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

عباس تابش نے تشبیہات کا بڑا عمدہ استعمال کیا ہے، اس سے اُن کی شاعری میں لطافت اور حسن وتازگی پیدا ہوگئی ہے۔اُنھوں نے اپنے اشعار میں کئی خوب صورت الفاظ بطور استعارہ استعمال کیے ہیں۔پرندوں، درختوں، چاند، دشت، ہجرت، ہنس اور آسمان کو عباس تابش کی شعری فضا میں ایک خاص استعاراتی حیثیت حاصل ہے اُن کے کلام میں جابجا خوبصورت تشبیہات و استعارات ملتے ہیں۔اس سے اُن کے کلام میں جامعیت اور اختصار پیدا ہوگیا ہے۔وہ اپنے انھی فنی محاسن کی وجہ ہی سے کامیاب شاعر ہیں۔عباس تابش نے شعوری و غیر شعوری طور پر مختلف صنعتوں کو استعمال کر کے اپنے کلام میں فصاحت و بلاغت پیدا کر دی ہے۔عباس تابش نے اسلامی و تاریخی واقعات کو اجاگر کرنے کے لیے خوبصورت تلمیحات کا استعمال بھی کیا ہے۔ان تلمیحات کی وجہ سے اُن کی شاعری آفاقی اور بامقصد ہوگئی ہے۔

عباس تابش کی شاعری کا ایک خاص وصف موسیقیت وغنائیت ہے۔اُن کی غزلوں میں موسیقی بدرجہ اتم رچی بسی ہوئی ہے۔اس لیے اُن کی غزلیں با آسانی گنگنائی جا سکتی ہیں۔اُنھوں نے کئی جگہوں پر تکرار لفظی سے اشعار کے مصرعوں میں صوتیاتی آہنگ

پیدا کر دیا ہے۔عباس تابش نے مختلف تجربات کر کے شاعری میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا ہے۔اُنھوں نے ان اشعار میں یہ تکرار لفظی اور غنائیت کمال فنی مہارت کے ساتھ پیش کی ہے۔عباس تابش نے تکرارِ لفظی کی طرح صنعتِ تضاد کا استعمال بھی جا بجا کیا ہے۔دیگر شعرا میں اس صنعت کا استعمال کم نظر آتا ہے۔

عباس تابش نے اپنی شاعری کو سادہ اور عام فہم بنانے کے لیے سہلِ ممتنع کا استعمال کیا ہے۔اُن کا کلام پڑھ کر قاری کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔اُنھوں نے اشعار بے ساختہ اور سیدھے سادے انداز میں کہے ہیں۔عباس تابش کی شاعری کی مقبولیت کی ایک وجہ اُن کی منفرد ترکیب سازی بھی ہے۔اُنھوں نے اپنے اشعار میں بکثرت عربی و فارسی کی خوبصورت تراکیب کا استعمال کیا ہے۔اُن کی تراکیب سازی سے زبان و بیان کی خوبصورتی بڑھ گئی ہے۔

عباس تابش کی مقبولیت کا سبب اُن کا استفہامیہ لہجہ بھی ہے۔اُنھوں نے اپنے کلام میں بکثرت کلماتِ استفہام کی چاشنی دی ہے۔انھوں نے صنعتِ ترصیع کا بھی خوبصورت استعمال کیا ہے۔یہ اُن کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں عام ہے۔عباس تابش نے بکثرت چھوٹی اور درمیانی بحریں استعمال کی ہیں۔اُن کی چھوٹی بحر کی غزلیں موسیقیت سے لبریز ہیں۔اُنھوں نے چھوٹی بحر استعمال کر کے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور ناصر کاظمی کی روایت کو گہرا کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے چھوٹی بحر میں اچھی غزلیں تخلیق کی ہیں جو اُن کے مشاہدات و تجربات کی عکاسی کرتی ہیں۔اُنھوں نے چھوٹی بحر میں غزلیں کہہ کر کمال فنی مہارت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے مصرعوں کے چند لفظوں میں مکمل مضمون باندھ کر زبان و بیان پر دسترس دکھائی ہے۔

عباس تابش نے جہاں چھوٹی بحر کے شعروں میں رنگ برنگ مضامین بھرے

ہیں وہاں اُنھوں نے طویل بحر کا استعمال بھی خوب کیا ہے۔ بڑی بحر میں بھی الفاظ کا چناؤ آسان کام نہیں ہے۔ عباس تابش نے اس میں بھی ہنر آفرینی دکھائی ہے اور فنی حوالے سے مکمل طور پر پورا اترتے ہیں۔ عباس تابش روایتی شعرا کی طرح غزل کے مقطعے میں اپنا تخلص بڑے خوبصورت اور معنی خیز انداز میں برتتے ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے بڑے یادگار شعر چھوڑے ہیں جو ادبی منظر نامے پر ایک مہر کی طرح ثبت ہو گئے ہیں۔ عباس تابش نے غزل کے مقطعے میں اپنا تخلص استعمال کر کے خود کلامی اور مکالماتی انداز کا احساس دلایا ہے۔

عباس تابش کی شاعری میں محبت، حسن و عشق کے عناصر ملتے ہیں، اُن کی شاعری میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں طرح کے پہلو موجود ہیں۔ اُنھوں نے عشقِ مجازی کی کیفیات اور احساسات کو بہت لطیف خیال اور نزاکت کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر کسی کو دلکش اور دلفریب لگتا ہے۔ ہر کوئی اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔ عباس تابش کی غزلوں میں عشق و محبت کے مضامین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کی شاعری میں محبت، ہجر و وصال، تنہائی، نارسائی، سوز و گداز، رسوائی اور بے وفائی کے موضوعات شامل ہیں۔

محبت میں ہجر و وصال، خوشی غمی، دکھ درد اور سوز و گداز کا بڑا عمل دخل ہے۔ محبت میں عاشق کے دل پر کئی کیفیات گزرتی ہیں۔ عباس تابش نے انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کے منفرد اسلوب کی پہچان و وصف خاص اُن کے اشعار میں نقل مکانی اور بے گھری کا بکثرت ذکر ہے۔ اُن کو زندگی میں کئی مقامات پر ہجرت کرنا پڑی، اس لیے اُن کی شاعری میں نقل مکانی اور ہجر و ہجرت کا تلخ تجربہ موجود ہے۔ انھوں نے جابجا بے بسی اور بے گھری کا ذکر کیا ہے۔

فطرت خدا کی عین قدرت کا نام ہے، فطرت ہر کسی کو خوبصورت لگتی ہے۔ عباس تابش کی شاعری فطرت کی عکاس ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری میں کائنات کے حسین مناظر کی ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ اُنھوں نے ''باغِ جناع'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جو قدرتی مناظر کی عکاس ہے۔ اُن کی شاعری میں کائنات کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں درخت، جھیل، تالاب، سمندر، دریا، صحرا، دشت، باغات، پرندے، پھول، چاند، تارے، اور آسمان سمیت قدرت کے کئی حسین مناظر کا ذکر ملتا ہے۔ عباس تابش کائنات کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں اُن کی شاعری میں کائنات کے حسن کا گہرا مشاہدہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کونجیں نکلی ہیں پہاڑوں کے سفر پر لیکن
رُت بدلنے پہ بھی بدلا نہ ٹھکانہ دل کا
(رقصِ درویش)

اگر چہ عباس تابش کی شاعری کا بیشتر حصّہ عشقِ مجازی پر مشتمل ہے لیکن عشقِ مجازی کے علاوہ اُن کے ہاں سیاسی و سماجی نظریات و خیالات بھی بھر پور ملتے ہیں۔ اُن کی غزلیں مکمل طور پر ملکی حالات و سیاسی منظر نامے کی عکاس ہیں۔ انھوں نے ظلم و انصاف کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، ملک میں دہشت گردی عام ہے۔ جرائم، لاقانونیت اور انسانوں کی مادہ پرستی پر بھی مکمل نظر رکھی ہوئی ہے۔ عباس تابش ایک انسان دوست شاعر ہیں وہ اپنے ملک و قوم سے دلی محبت کرتے ہیں اور انھیں ہر وقت ملک و قوم کا درد اور فکر لاحق رہتی ہے۔ وہ لوگوں میں محبتیں بانٹنے اور نفرتیں ختم کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ آج کے اس دور میں لوگوں کو اپنے فائدے کی فکر لگی ہوئی ہے جب کہ عباس تابش لوگوں اور دوستوں کے لیے فکر مند ہیں عباس تابش کی شاعری میں معاشرتی ناہمواریوں، معاشرتی

بے راہروی، سیاسی حالات اور معاشی تنگدستی کی عکاسی و ترجمانی کی گئی ہے۔

دہشت گردی نے ملک وقوم کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ روز درجنوں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں، اس صورت حال کو دیکھ کر تابش نے اشعار کہے ہیں۔ عباس تابش کی یہ خوبی ہے کہ اُن کی شاعری میں موضوعات کا تسلسل ہے اُن کے موضوعات ایک دوسرے سے (کڑی سے کڑی ملا کر) جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانوی، ترقی پسند، سیاسی وسماجی، مزاحمتی اور انقلابی موضوعات بکثرت ملتے ہیں۔ وہ کثیر الجہات موضوعات کے شاعر ہیں اس لیے اُن کی شاعری کئی طرح کے فکری وفنی محاسن رکھتی ہے۔ اُن کی شاعری تخیل، تمثیل کاری، پیکر تراشی، تشبیہ واستعارہ، صنائع بدائع، ہیئت اور اسلوب تمام لحاظ سے خوبصورت اور قابل ستائش ہے۔

عباس تابش صرف شاعر ہی نہیں ایک مصور بھی ہیں اُنھوں نے اشعار نہیں کہے بلکہ تصویریں بنائی ہیں۔ وہ ایک پیکر تراش شاعر ہیں، انھوں نے رنگ برنگ پیکر تیار کر کے اپنی شاعری میں سمو ڈالے ہیں۔ اُن کے کلام میں انھی پیکروں سے ایک خاص قسم کی رنگارنگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُن کے کلام کا بغور جائزہ لیں تو جہاں تراکیب کی کثرت نظر آتی ہے وہاں انھوں نے رمزوایمائیت اور اشاروں کنایوں میں باتیں بھی کی ہیں لیکن ان میں فصاحت و بلاغت کا خیال رکھا ہے۔ عباس تابش پرندوں، درختوں اور خوابوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں انا پرستی اور خود پسندی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، کہیں وہ کھل کر انانیت کا اظہار کرتے ہیں اور کہیں وہ چھپے ہوئے انداز میں خود پسند لگتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوددار ہوتا ہے جب کوئی انسان بلندیوں کو چھو لے تو اس میں خود اعتمادی، انانیت یا نرگسیت آ ہی جاتی ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں موت وحیات کا فلسفہ بھی ملتا ہے۔ موت کے بغیر زندگی اور زندگی کے بغیر موت کوئی معنی و اہمیّت نہیں رکھتی اس لیے اکثر

ادیبوں اور شعرا نے موت وحیات کا فلسفہ اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ بقول عباس تابش:

میں کیسے اپنے توازن کو برقرار رکھوں
قدم جماؤں تو سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں
(تمہید)

عباس تابش نے اپنی شاعری میں پند و نصائح اور اخلاقی قدروں پر بہت زور دیا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں اخلاقی قدریں خاص اہمیّت رکھتی ہیں۔ ان کے بغیر مثالی معاشرے کا قیام ممکن نہیں ہے خدا نے انسان کو اشرف المخلوق بنا کر بھیجا ہے۔ معاشرے میں منافقت، جھوٹ، لوٹ مار اور قتل گری عام ہے اس لیے قوم کی اخلاق سازی کرنے کی ضرورت ہے۔ عباس تابش نے شاعری میں اخلاقی مضامین بھی پیش کیے ہیں۔

عباس تابش اپنا منفرد لہجہ اور اپنا اسلوب رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے شاعری میں ہنر آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ہنر آفرینی اُن کے تخلیقی مزاج میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اُن کے اشعار بڑے بڑوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ عباس تابش نے محض ۲۵ سال کی عمر میں اردو ادب کو ''تمہید'' جیسا شعری مجموعہ دے کر کمال فنی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔ عباس تابش بہت خوش قسمت شاعر ہیں انھیں اپنی زندگی میں ہی مقبولیت اور عزت مل گئی ہے۔ وہ اُردو ادب کے قارئین کے محبُوب شاعر بن گئے ہیں۔ انھوں نے رومانوی، ترقی پسندی، سیاسی و مزاحمتی شاعری میں یکساں مقبولیت حاصل کی ہے۔

عباس تابش نے غزل کے علاوہ چند اہم نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی اصل پہچان ان کی غزلیں ہیں۔ اُنھوں نے غزل گوئی میں خوب محنت اور ریاضت سے کام لیا ہے۔ اسی لیے وہ ایک کامیاب شاعر ثابت ہوئے ہیں۔ المختصر عباس تابش عہدِ حاضر کے ایک منفرد، صاحبِ اسلوب اور بڑے شاعر ہیں۔ اُنھوں نے

اپنی ذات میں چھپے ہوئے دکھ، درد اور تلخیوں سے لے کر کائنات اور دنیا کے تمام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ اُن کی شاعری میں فردِ واحد کا کرب بھی ہے اور اجتماعی سطح کے مصائب و آلائم بھی ہیں۔ عباس تابش کی غزلوں میں نفسیاتی و روحانی ، رومانوی، مارکسی اور عمرانی پہلو اور رجحانات ملتے ہیں۔ اُنھوں نے ملکی حالات و واقعات، معاشرتی احوال، مسائل و مشکلات، بے روزگاری، ظالم و مظلوم، معاشی تنگدستی سمیت کئی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصّہ بنایا ہے۔ ان تمام موضوعات کا انھوں نے گہرا مشاہدہ کیا ہے یہ متنوع شعری تجربے ان کی شاعری کے موضوعات کی وسعت و آفاقیت کا واضح اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہے۔

کسی بھی تخلیق کار کے مجموعی مقام و مرتبے کا اندازہ لگانا کارِ آسان نہیں ہوتا پھر بھی زیرِ نظر مقالے میں عباس تابش کے شعری اسلوب و مقام کا اندازہ لگا کر اُن کا شعر و ادب میں مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حتی الامکان تنقید و تحقیق کے لوازمات بروئے کار لا کر بڑی عرق ریزی کے ساتھ اُن کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ عباس تابش کی شاعری میں وہ تمام فنی و فکری خصوصیات موجود ہیں جس کی وجہ سے اب اُن کی حیثیت ایک درس گاہ کی ہے جہاں فنِ شاعری مکمل طور پر سیکھا جا سکتا ہے، مجھے امید ہے کہ اگلی نسلیں اُن سے رہنمائی حاصل کر سکیں گی۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ عباس تابش کا شعری مقام و مرتبہ منفرد نوعیت کا ہے۔ اُنھیں اکیسویں صدی کے ادبی منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ وہ ایک عہد ساز شاعر ہیں۔ وہ اپنے عہد کا ایک درخشاں ستارہ، زندہ جاوید اور توانا لہجہ ہیں۔ جب تک اُردو شعر و ادب دنیا میں رائج رہے گا عباس تابش کی شاعری اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

ضمائم

(الف) راقم کا عباس تابش سے انٹرویو، بمقام، لاہور، ۶ جولائی ۲۰۱۳ء

(ب) راقم کا حسن عباسی سے انٹرویو، بمقام، لاہور، ۱۵ مارچ، ۲۰۱۴ء

ضمائم

(الف) راقم کا عباس تابش سے انٹرویو، لاہور، ۶ جولائی ۲۰۱۳ء

راقم: آپ کا پورا نام کیا ہے؟

عباس تابش: میرا اصل نام غلام عباس ہے، عباس تابش میرا قلمی نام ہے

راقم: آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

عباس تابش: میری تاریخ پیدائش ۱۵/جون ۱۹۶۱ء ہے اور میں میلسی میں پیدا ہوا۔

راقم: آپ کے والد کا کیا نام ہے اور آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

عباس تابش: میرے والد کا نام فیض بخش تھا، ہم دو بھائی اور دو ہی بہنیں ہیں۔ میرے بڑے بھائی کا نام مشتاق احمد ہے اور وہ میلسی کے ہائی سکول میں ٹیچر ہیں۔ ہم راجپوت بھٹی ہیں، میرے والد عمارتیں بنانے کا کام کیا کرتے تھے اور وہ ۱۹۷۷ء میں انتقال کر گئے۔

راقم: اپنے بچپن اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے کچھ بتائیں؟

عباس تابش: میرا سارا بچپن میلسی کے گلی کوچوں میں گزرا۔ میٹرک تک کی تعلیم میلسی

سے حاصل کی، میں نے ۱۹۷۷ء میں میٹرک میلسی ہائی سکول سے کیا۔ ۱۹۸۱ء میں ایف اے گورنمنٹ ڈگری کالج ساہیوال سے کیا اور پھر لاہور آ گیا "جنگ" میں ملازمت حاصل کی اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کا امتحان ۱۹۸۵ء میں پاس کیا۔ اسی کالج سے ۱۹۸۷ء میں ایم اے اُردو کا امتحان درجہ اوّل میں پاس کیا اور "احمد ندیم قاسمی کی شاعری" پر مقالہ لکھا۔

راقم: اپنے بچپن کا کوئی خاص واقعہ سنائیں؟

عباس تابش: جب میں نے پانچویں جماعت کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو گھر آ کر سب سے پہلے اپنے والد کو یہ خبر سنائی اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ میرا فلاں دوست جو اچھے نمبروں کا دعویٰ کرتا تھا صرف پاس ہوا۔ تو میرے والد نے اس بات کا برا محسوس کیا اور مجھے سمجھایا کہ آئندہ کسی کے بارے میں ایسی بات کبھی نہ کرنا ہو سکتا ہے وہ دل ہی دل میں تیری بات کا برا منائے۔

راقم: آپ نے شاعری کا آغاز کب کیا؟

عباس تابش: میں نے شاعری کا آغاز ۱۹۷۵ء میں کیا، میں اُس وقت ہائی سکول میلسی کا طالب علم تھا۔ ابتدا میں میلسی کے ایک شاعر نذیر ازفر کو غزلیں دکھاتا تھا۔ اُس زمانے میں میلسی شہر میں ۸۰ شاعر تھے۔ جب میں نے پہلی بار اپنی غزل کو اخبار میں دیکھا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی اسی خوشی سے مجھے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔ پھر میں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی۔

راقم: آپ کی غزل سب سے پہلے کس اخبار نے شائع کی؟

عباس تابش: کیف انصاری نے اپنے اخبار روز نامہ ''آفتاب'' میں پہلی بار میری غزل شائع کی، مصرع تھا

''شب کی دیوار گرے صبح کا منظر جاگے''

راقم: آپ کے اب تک کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

عباس تابش: میرے پانچ شعری مجموعے اور ایک کلیات شائع ہو چکا ہے۔ تمہید، آسمان، مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، پروں میں شام ڈھلتی ہے، رقصِ درویش، عشق آباد (کلیات)

راقم: اپنی عملی زندگی اور ملازمت کے بارے میں بتائیں؟

عباس تابش: میں نے ۱۹۸۱ء میں میلسی کے ایک گاؤں ''شاہ پور ثانی'' میں بطور پی ٹی سی مدرس ملازمت کا آغاز کیا لیکن چند ماہ ملازمت کرنے کے بعد مجھے اس میں اپنا کوئی خاص مستقبل نظر نہیں آیا اور ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ روز نامہ ''جنگ'' میں ملازمت کی اور اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ ۱۹۸۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کی سند حاصل کی، ۱۹۸۹ء میں بطور لیکچرار تقرر ہوا اور لالہ موسیٰ تعیناتی عمل میں آئی۔ ۱۹۹۳ء میں لاہور ٹرانسفر ہو گیا اور ہنوز گورنمنٹ بوائز کالج گلبرگ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں۔

راقم: آپ نے شادی کب اور کس عمر میں کی؟

عباس تابش: میں نے شہر سلطان کی ایک قریشی فیملی میں ۱۲ فروری ۱۹۹۳ء کو شادی کر لی، میری بیوی گلبرگ کالج میں اسلامیات کی پروفیسر ہے۔

راقم: کیا آپ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں؟

عباس تابش: شادی کے پندرہ برس گزر جانے کے باوجود ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی لیکن ہمارے آپس میں تعلقات انتہائی خوشگوار رہے۔ اب میری ۴ سال کی ایک بیٹی ہے اور اس کا نام ہادیہ تابش ہے۔

راقم: آپ کو اپنے کس شعری مجموعے پر ایوارڈ ملا؟

عباس تابش: تہذیب فاؤنڈیشن کراچی کی جانب سے ۲۰۰۸ء میں ''رقص درویش'' پر ایوارڈ ملا۔

راقم: بیرون ملک مشاعروں میں پہلی بار کب شرکت کی؟

عباس تابش: ۱۹۹۶ء میں پہلی بار دبئی کے عالمی مشاعرے میں شرکت کی اس کے بعد ۱۹۹۷ء اور ۱۹۹۸ء میں امریکہ، انگلینڈ، اسٹریلیا، ناروے، ابوظبہی، بحرین گیا اور بھارت تو کئی بار جا چکا ہوں

راقم: تابش صاحب! شکریہ

☆☆☆☆☆

(ب) راقم کا حسن عباسی سے انٹرویو، لاہور، ۱۵ مارچ ۲۰۱۴ء

راقم: حسن عباسی، آپ عباس تابش کے ادارے ''الرزاق پبلی کیشنز'' کے ساتھ وابستہ رہے، اُن کے ہمعصر بھی ہیں، آپ عباس تابش کی شخصیت کے بارے میں کیا جانتے ہیں، مفصّل بتائیں؟

حسن عباسی: عباس تابش کے ساتھ دوستی اور رشتہ بیس برس پر محیط ہے۔ کئی برس تک اُن کے ادارے ''الرزاق پبلی کیشنز'' کے ساتھ وابستہ رہنے کی وجہ سے میں اُنھیں بہت قریب سے جانتا ہوں وہ ایک ملنسار، خوش اخلاق اور محبت کرنے والے دوست ہیں۔ عاجزی اور انکساری اُن کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ میں نے کبھی اُن کو اپنی ذات کے حوالے سے یا شاعری کے حوالے سے بڑا بول کہتے نہیں سنا جو تعلّق بن جائے اُس کو اپنی طرف سے تا دیر نبھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

ہر انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس حوالے سے تابش سے بھی مختلف دوستوں کو گلے شکوے پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن میں نے یہ دیکھا ہے کہ وہ حتی الامکان اُن شکوؤں کو دور کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ کئی مواقع پر انھوں نے خود سے کم عمر دوستوں سے معذرت کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔ وہ بھیڑ سے گھبراتے ہیں، ہجوم میں اُن کا دم گھٹتا ہے البتہ دوستوں کی محفل اُنھیں بہت عزیز ہے اور وہ تمام تر مصروفیت کے باوجود اُس کے لیے وقت نکالتے ہیں اُن کا شعر ہے:

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ صحبتِ یاراں
میں جانتا ہوں کہ فرصت سے میں نہیں آیا

عباس تابش ایک صوفی منش اور درویش شخص کا نام ہے تصوف سے اُن کو گہرا شغف ہے اور یہ اُن کی شخصیت اور مزاج کے عین مطابق ہے میں نے اُن کو ہمیشہ اپنے دوستوں اور حلقے کے لوگوں کے لیے فکرمند اور پریشان دیکھا ہے بحیثیت بھائی، شوہر اور بیٹے کے بھی اُنھوں نے ہمیشہ اپنا کردار بااحسن نبھایا ہے بلکہ اکثر مواقع پر انھیں ان رشتوں کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرنا پڑا۔ اگرچہ ادبی دنیا میں اُن کی شخصیت کافی متنازع رہی اور انہیں بہت مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا تو میری اس میں رائے یہ ہے کہ دوستوں کی شکایات ہوسکتا ہے اُن سے متعلّق کسی حد تک درست ہوں مگر مخالفین صرف اُن کو اچھے شاعر ہونے کی سزا دیتے رہے ہیں کیوں کہ عباس تابش کی موجودگی میں اُن کی دال نہیں گلتی۔ مشاعرہ ہمیشہ عباس تابش نے لوٹا ہے۔

راقم: عباس تابش کے شعری فکر و فن کے حوالے سے آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

حسن عباسی: ۸۰ء کی دہائی کے بعد جو شاعر ادبی منظر نامے پر اُبھر کر سامنے آئے اُن میں سب سے منفرد اور نمایاں نام عباس تابش کا ہے ان تمام شعرا کے کلام کی بنیادی خوبی تو یہی تھی کہ اُنھوں نے جدّت کا اثر قبول کیا تھا اور ان کی غزل میں نئے مضامین، تشبیہات، تراکیب اور استعارے شامل تھے مصرعوں کی بندش نہایت چست امیجری انتہائی باکمال اور مضامین چونکانے والے تھے۔ ان میں سے بیشتر شعرا نے اپنی غزل کو جدّت کے دائرہ کار تک محدود رکھا کیوں کہ اُن کی شاعری کی جڑیں روایت سے پوری طرح جڑی ہوئی نہیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت جلد یکسانیت کا شکار ہو گئے اور مضامین کی جگالی کرنے لگے۔

عباس تابش اُن میں سے غالباً واحد شاعر ہیں جنھوں نے جدّت کے ساتھ ساتھ روایت کا نہ صرف بھر پور مطالعہ کیا بلکہ اُس کو مکمل طو پر اپنے اندر جذب کیا۔ شعر کہنے کا کمال تو انہیں قدرت نے بخوبی عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ اُنھوں نے مطالعے اور ریاضت سے چار چاند لگا دیے یہی وجہ ہے کہ آج اُن کی غزل کی دھوم برصغیر پاک و ہند میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہے۔ اُن کی شاعری میں مکالماتی انداز بہت خوبصورت ہے۔ اُن کے اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ یاد رہتے ہیں۔ وہ پرانے سے پرانے مضمون کو اپنی منفرد سوچ اور خیال سے اتنا نیا کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کا ہو جاتا ہے۔ میں عباس تابش کی شاعری کا ذاتی طور پر مداح ہوں۔ مستقبل اُن کے لیے بہت تابناک ہے کیوں کہ اس وقت اُن کا شمار جدید غزل کے صفِ اوّل کے شعرا میں ہوتا ہے۔

راقم: حسن عباسی صاحب، بہت شکریہ

☆☆☆☆☆

منابع

(الف) تحقیقی وتنقیدی کتب

(ب) شعری مجموعے / کلیات

(ج) رسائل و جرائد

(د) قلمی آثار
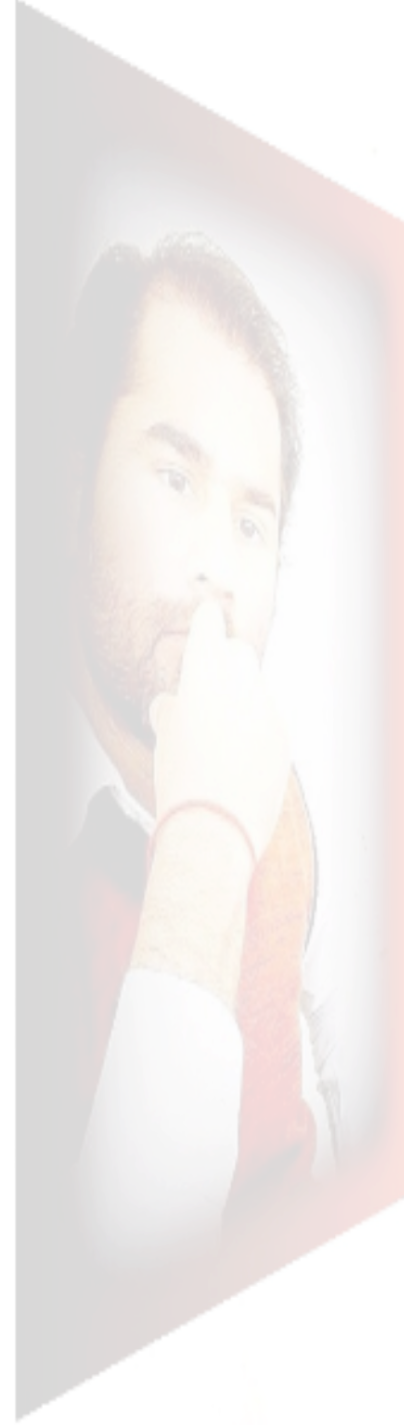
منابع

(الف) تحقیقی وتنقیدی کتب

☆ آل احمد سرور، ادب اور نظریہ، لکھنؤ، ادارہ فروغ اُردو، ۱۹۵۴ء

☆ ابواللیث صدیقی، تجربے اور روایت، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۹ء

☆ ابواللیث صدیقی، غزل اور متغزلین، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۸ء

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اُردو ادب، کراچی، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۷۰ء

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنؤ کا دبستان شاعری، کراچی، اُردو اکادمی سندھ، ۱۹۶۷ء

☆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، نظیر اکبرآبادی اور اس کا عہد، کراچی اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء

☆ احسن فاروقی، ڈاکٹر، اُردو میں تنقید، کراچی، مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۶ء

☆ اظہر الدین مدنی، اردو غزل ولی تک، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء

☆ اعجاز حسین، ڈاکٹر، اُردو ادب آزادی کے بعد، الہ آباد، کارواں پبلشرز، ۱۹۶۰ء

☆ افتخار جالب (مرتب)، نئی شاعری (ایک تنقیدی مطالعہ)، لاہور، نئی مطبوعات، ۱۹۶۶ء

☆ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر وشاعری، جدید بک ڈپو، لاہور، باراول ۱۹۷۶ء

☆ انیس ناگی، ڈاکٹر، میراجی بھٹکا ہوا شاعر، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء

☆ انیس ناگی، ڈاکٹر، نیا شعری افق، لاہور، جمالیات، ۱۹۸۸ء

☆ انیس ناگی، ڈاکٹر، تنقید شعر، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۴ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۵ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، جدید نظم کے ارباب اربعہ، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۶ء

☆ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، عزیز بک ڈپو، ۱۹۸۸ء

☆ انور صابر، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء

☆ بدر منیر الدین، بیسویں صدی کا شعری ادب، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

☆ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، نئے شعری تجزیے، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

☆ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، جدید اُردو شاعری میں علامت نگاری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء

☆ توقیر احمد خان، ڈاکٹر، اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی، نئی دہلی، ناشر مصنف خود، ۱۹۸۹ء

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادبی تحقیق، لاہور، مجلس ترقی ادب، باراول ۱۹۹۴ء

☆ جیلانی کامران، ڈاکٹر، نئی نظم کے تقاضے، لاہور، کتابیات، ۱۹۶۷ء

☆ جیلانی کامران، ہمارا ادبی اور فکری سفر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۷ء

☆ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ادب، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۶ء

☆ حسن اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اور تحقیقی جائزے، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء

☆ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، تفہیم وتحسین شعر، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۶ء

☆ حکمت ادیب (مرتب)، مجید امجد ایک مطالعہ، جھنگ، جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۹۴ء

☆ حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

☆ خاطر غزنوی، جدید اُردو ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

☆ خلیل الرحمٰن اعظمی، نئی نظم کا سفر، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۲ء

☆ خلیل الرحمٰن اعظمی، اُردو میں ترقی پسند ادب، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۶ء

☆ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، نئے پرانے خیالات، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

☆ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی اردو ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء

☆ رشید امجد، ڈاکٹر، مزاحمتی ادب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء

☆ سجاد ظہیر، روشنائی، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۷۶ء

☆ سردار جعفری، ترقی پسند ادب، علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۱۹۵۷ء

☆ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصول تحقیق، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۹ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، دبستان، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب سال بہ سال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

☆ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، مقالات حلقہ ارباب ذوق، لاہور، پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

☆ سید سجاد (مرتب)، نئی نظمیں، لاہور، نئی مطبوعات، ۱۹۶۷ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، بحث و نظر، لاہور، مکتبۂ اُردو، ۱۹۵۲ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، مباحث، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سخنور (نئے پرانے) حصّہ اول، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول نومبر ۱۹۸۶ء

☆ ظہیر احمد صدیقی، تنقید و تحقیق ادبیات، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، لاہور، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۳ء

☆ عابد علی عابد، سید، انتقاد ادبیات (مقالات عابد)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

☆ عابد علی عابد، سید، البیان، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۹ء

☆ عابد علی عابد، سید، اسلوب، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم جون ۱۹۹۶ء

☆ عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

☆ عبدالقادر سروری، جدید اردو شاعری، لاہور، شیخ غلام علی سنز پبلشرز، ۱۹۶۷ء

☆ عبدالشکور، اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ، لاہور، مکتبہ فانوس، بار اول ۱۹۸۵ء

☆ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، کراچی، اُردو دنیا، ۱۹۶۱ء

☆ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، تنقیدی زاویے، لاہور، مکتبۂ اُردو، ۱۹۵۱ء

☆ عقیل احمد صدیقی، جدید اُردو شاعری......نظریہ و عمل، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء

☆ علی محمد، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

☆ عنوان چشتی، ڈاکٹر، اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، دلی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۷۵ء

☆ عنوان چشتی، ڈاکٹر، اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، لاہور، تخلیق مرکز، س ن

☆ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقا، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

☆فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

☆فیض احمد فیض، میزان، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۹ء

☆کنول کرشن بالی، آزاد نظم اُردو شاعری میں، لکھنؤ، کتاب پبلشرز، س ن

☆گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، تحقیقی زاویے، اسلام آباد، مجلس فروغ تحقیق، بار اول ۱۹۹۱ء

☆محمد حسن، ڈاکٹر، معاصر ادب کے پیش رو، کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

☆محمد یٰسین، ڈاکٹر، انگریزی ادب کی مختصر تاریخ، لاہور، بک چینل، ۱۹۹۲ء

☆نوازش علی، ڈاکٹر، فراق گورکھپوری (شخصیت اور فن)، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۳ء

☆نوازش علی، ڈاکٹر، پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال، راولپنڈی، گندھارا، ۲۰۰۲ء

☆نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، کراچی، اُردو اکادمی سندھ، ۱۹۶۶ء

☆وحید قریشی، ڈاکٹر، مقدمہ شعر و شاعری کا تنقیدی جائزہ، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

☆وحید قریشی، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۷ء

☆وحید قریشی، ڈاکٹر، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۵ء

☆وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء

☆وزیر آغا، ڈاکٹر، نظم جدید کی کروٹیں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۸ء

☆وقار عظیم، سید، فن اور فنکار، لاہور، اُردو مرکز، ۱۹۶۶ء

☆وقار عظیم، سید، اقبال معاصرین کی نظر میں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

☆یونس جاوید، حلقہ ارباب ذوق، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۴ء

(ب) شعری مجموعے / کلیات

☆ ابن انشا، چاند نگر، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

☆ احسان دانش، نوائے کارگر، لاہور، مکتبہ دانش، ۱۹۶۲ء

☆ احمد فراز، جاناں جاناں، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، س ن

☆ احمد فراز، نابینا شہر میں آئینہ، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆ احمد ندیم قاسمی، دشت وفا، لاہور، کتاب نما، ۱۹۶۰ء

☆ اختر الایمان، آب جو، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۵۹ء

☆ اختر حسین جعفری، آئینہ خانہ، لاہور، التحریر، ۱۹۸۱ء

☆ ادا جعفری، میں ساز ڈھونڈتی رہی، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۴۷ء

☆ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۰ء

☆ اظہار شاہین، حسابِ جاں، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء

☆ اظہار شاہین، ہوا کے پر، لاہور، عمیر پبلشرز، ۱۹۹۴ء

☆ امجد اسلام امجد، ہم اُس کے ہیں، لاہور، جہانگیر بک ڈپو، س ن

☆ باقی احمد پوری، اب دل ہی نہیں لگتا، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۱۰ء

☆ بشیر بدر، ڈاکٹر، کوئی شام گھر بھی رہا کرو، الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆ پروین شاکر، خوشبو، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

☆ پروین شاکر، ماہِ تمام (کلیات)، اسلام آباد، مراد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

☆ تصدق حسین خالد، لامکاں تا لامکاں، کراچی، مکتبہ نصرت، ۱۹۷۶ء

☆ ثمینہ راجہ، کتابِ جاں (کلیات)، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۵ء

☆ ثناءاللہ شاہ، چاند میں بھی تنہا ہوں، لاہور، روش پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

☆ جاں نثار اختر، کلیاتِ جاں نثار اختر، لاہور، مکتبۂ عالیہ، ۲۰۰۲ء

☆ جون ایلیا، شاید، الرزاق پبلی کیشنز، باراول ۱۹۹۰ء، بار ہشتم ۱۹۹۹ء

☆ حبیب جالب، کلیاتِ حبیب جالب، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۳ء

☆ حسن عباسی، ہم نے بھی محبت کی ہے، لاہور، نستعلیق مطبوعات، باراول ۱۹۹۹ء

☆ حسن عباسی، اک شام تمہارے جیسی ہو، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۰ء

☆ حسن عباسی، ایک محبت کافی ہے، لاہور، نستعلیق مطبوعات، باراول ۲۰۰۵ء

☆ خالد احمد، مٹھی بھر ہوا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

☆ خالد احمد، ہتھیلیوں پر چراغ، لاہور، پاکستان بکس، ۱۹۹۵ء

☆ خواجہ الطاف حسین حالی، مسدس حالی، لاہور، ٹیکنیکل پبلشرز، ۱۹۹۳ء

☆ داغ دہلوی، کلامِ داغ (مرتبہ، سعد اللہ شاہ)، لاہور، خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء

☆ ساقی فاروقی، پیاس کا صحرا، راولپنڈی، کتاب نما، ۱۹۶۷ء

☆ ساحر لدھیانوی، کلیاتِ ساحر، لاہور، سجاد پبلی کیشنز، س ن

☆ ساحل سلہری، کوئی کمی سی ہے، لاہور، دعا پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

☆ سرور ارمان، وہی آبلے مرے پاؤں کے، لاہور، کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز، س ن

☆ سرور ارمان، زنجیر بولتی ہے، لاہور، کانٹی نینٹل سٹار پبلشرز، بارسوم ۲۰۱۲ء

☆ سعد اللہ شاہ، سبز رتوں کی جھلمل میں (کلیات)، لاہور، خزینہ علم و ادب، س ن

☆ سعید واثق، کہاں ہوتے ہو، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، باراول ۲۰۰۳ء

☆ سعید واثق، تمہارا عکس ہوں میں، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، باراول ۲۰۰۴ء

☆ سلیم کوثر، خالی ہاتھوں میں ارض و سما، کراچی، تہذیب پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء

☆ سیف الدین سیف، خم کاکل، لاہور، نیا ادارہ، س ن

☆ شاہد ذکی، خوابوں سے خوشبو آتی ہے، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

☆ شاہد ذکی، خوابوں سے خالی آنکھیں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

☆ شاہد ذکی، سفال میں آگ، فیصل آباد، ہم خیال پبلشرز، ۲۰۰۶

☆ شکیب جلالی، روشنی اے روشنی، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۴ء

☆ شکیل بدایونی، کلیات شکیل بدایونی، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆ شکیل جاذب، انتخاب، سلسلہ دلداری کا، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

☆ شہزاد احمد، بکھر جانے کی رُت، لاہور، مطبوعات، ۱۹۸۵ء

☆ شہزاد نیئر، برفاب، لاہور، سانجھ پبلی کیشنز، باراول ۲۰۰۶ء

☆ شہزاد نیئر، چاک سے اترے وجود، لاہور، جہانگیر بکس، س ن

☆ عباس تابش، تمہید، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، باراوّل ۱۹۸۶ء بار دوم ۱۹۹۹ء

☆ عباس تابش، آسمان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، باراوّل ۱۹۹۲ء

☆ عباس تابش، مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء

☆ عباس تابش، پروں میں شام ڈھلتی ہے، لاہور، اپنا ادارہ، ۲۰۰۳ء

☆ عباس تابش، رقصِ درویش، لاہور، العصر پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

☆ عباس تابش، عشق آباد (کلیات)، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

☆ عبید اللہ علیم، چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، کراچی، سیپ پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء

☆ عارف عبدالمتین، موج در موج، لاہور، جدید ناشران، ۱۹۶۱ء

☆ عدیم ہاشمی، ترکش، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء

☆ عرش صدیقی، دیدۂ یعقوب، لاہور، جدید ناشران، ۱۹۶۶ء

☆ عزیز حامد مدنی، نخل گماں، کراچی، مکتبۂ دانیال، ۱۹۸۳ء

☆ علی زیرک، سورج کے روبرو، لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۸ء

☆ فاخرہ بتول، بھلا دیا نا......؟ لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۳ء

☆ فاطمہ حسن، یاد کی بارشیں، لاہور، روش پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

☆ فہمیدہ ریاض، بدن دریدہ، کراچی، مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۴ء

☆ فیصل عجمی، سمندر، اسلام آباد، آثار اکادمی، ۲۰۰۸ء

☆ فیض احمد فیض، دستِ تہ سنگ، لاہور، مکتبۂ کارواں، س ن

☆ قتیل شفائی، گجر، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

☆ قتیل شفائی، برشگال، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

☆ قیوم نظر، پون جھکولے، لاہور، کتاب خانہ، ۱۹۷۲ء

☆ کشور ناہید، لب گویا، لاہور، مکتبۂ کارواں، ۱۹۶۸ء

☆ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد (مرتبہ، خواجہ محمد زکریا)، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۸ء

☆ محسن احسان، ناتمام، پشاور، ادارۂ علم وفن، ۱۹۸۱ء

☆ محسن نقوی، برگِ صحرا، لاہور، ماورا پبلشرز، س ن

☆ محسن نقوی، بندِ قبا، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۰۷ء

☆ محسن نقوی، رختِ شب، لاہور، ماورا پبلشرز، ۲۰۰۲ء

☆ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، لاہور، فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۸ء، ۲۰۰۵ء

☆ محمد اقبال، ضربِ کلیم، لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۰ء

☆ محمد مومن خاں مومن، دیوانِ مومن، مرتبہ، شیما مجید، لاہور، مکتبۂ عالیہ، ۲۰۰۷ء

☆ مختار صدیقی، آثار، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء

☆ مصطفیٰ زیدی، کلیاتِ مصطفیٰ زیدی، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۱ء

☆ منیر نیازی، اس بے وفا کا شہر، لاہور، ماورا، پبلشرز، ۱۹۹۳ء

☆ میراجی، کلیاتِ میراجی مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

☆ میر تقی میر، دیوانِ میر، لاہور، علم وعرفان پبلشرز، ۲۰۰۵ء

☆ میرزا اسداللہ خان غالب، دیوانِ غالب، لاہور، خزینہ علم وادب، ۲۰۰۱ء

☆ ن۔م۔راشد، کلیاتِ راشد، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء

☆ نوشی گیلانی، اُداس ہونے کے دن نہیں ہیں، لاہور، گیلانی پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

☆ وزیر آغا، چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیات)، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء

☆ وصی شاہ، مجھے صندل کر دو، لاہور، دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

(ج) رسائل وجرائد

☆ اوراق، لاہور، جدید نظم نمبر اگست، ۱۹۷۷ء

☆ بیاض، لاہور، اپریل ۲۰۰۴ء

☆ دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۲۰۰۴ء

☆ سوغات، بنگلور، جدید نظم نمبر، ۱۹۷۸ء

☆ کشت نو، زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد، گولڈن جوبلی نمبر، ۲۰۱۱ء

☆ نگار پاکستان، کراچی، جدید شاعری نمبر، ۱۹۶۵ء

(د) قلمی آثار

☆ الطاف حسین بھٹہ، عباس تابش......شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اُردو) مخزونہ، لائبریری، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ۲۰۰۴ء، کل صفحات ۱۲۱

☆☆☆☆☆